قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے
دنیا کی ہر زبان سے پیاری زبان ہے
وہ وصف کون سا ہے جو اس میں ملا نہیں
سائنس اس میں یا ادب و فلسفہ نہیں
ایسی زباں میں وجہ شرف کی یہی ہے بات
اردو کو ہر زبان سے ہے ربط و التفات

—خمسۂ کیفی، پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

اُردو دُنیا
ماہنامہ
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:04، اپریل 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات قارئین کے خطوط 5

نقد و نگاہ
علامہ اقبال کے دو ممدوح
مرزا غالب اور سوامی رام تیرتھ شمیم طارق 9
تاجور نجیب آبادی کی اقبال شناسی ابرار اجراوی 13
حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری ذکیہ رخشندہ 18

حنیف نقوی کی بعد از وفات
مطبوعہ نئی تصانیف سنجیدہ خاتون 21
اسلوب احمد انصاری بہ حیثیت
غالب اور اقبال شناس شاکر علی صدیقی 25

زبان اور زمینی صورت حال
بہت سے دلوں میں ہے اردو سیکھنے کی چاہت صالحہ صدیقی 28

تعلیم، ترسیل، تحقیق
پی جی شعبۂ اردو، ایل این ایم یو
دربھنگہ کی پیش رفت امام اعظم 31

گنج ہائے گرانمایہ
ماہر غالبیات مالک رام عطاء الرحمٰن قاسمی 35

انور عظیم اور اختر الایمان فیضان الحق 37

ہندی ادبیات
معاصر ہندی شاعری اور
نشنک کا شعری مخاطبہ مسرت 40
عصری حسیت اور ساتویں دہائی
کی اہم ہندی کہانیاں فیضان حسن ضیائی 44

نفسیات
اردو میں نفسیات کی ترویج و اشاعت میں
سید اقبال امروہوی کی خدمات غلام نبی مومن 48

خصوصی گفتگو
زاہد مختار سے انٹرویو توصیف مجید 51

نگر نگر اردو
مئو ناتھ بھنجن کا شعری منظر نامہ ذکریٰ خاتون 54

نیا آسمان نئے ستارے
اردو میں خواتین کے
اوّلین سفرنامے عدیلہ جسیم 58
دوارکا پرشاد افق لکھنوی کی شاعری آصف پرویز 62
مشاعروں کے فروغ میں
الیکٹرانک میڈیا کا کردار فرمان چودھری 64

سیاحت
بین الاقوامی سیاحت کی اہمیت
ہندوستان کے حوالے سے رفعت مشتاق 66

کمپیوٹر
ایم ایس-ایکسل میں فنکشن 68

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 70

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 78

ہماری بات

فی زمانہ جو زبانیں عالمی سطح پر مقبولیت حاصل کر رہی ہیں، ان میں ایک ’اردو‘ زبان بھی ہے۔ اس کا دائرہ دن بہ دن وسیع ہو رہا ہے اور اس کی گونج دور دراز کے ملکوں اور علاقوں میں سنی جا رہی ہے، اردو کی نئی بستیاں بھی وجود میں آ رہی ہیں اور نئے مراکز بھی قائم ہو رہے ہیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں بھی اردو تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ نہ صرف برصغیر بلکہ ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے مختلف ملکوں، صوبوں اور شہروں سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر اردو کی کتابیں بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں نظر آتی ہیں۔ اگر بات سوشل میڈیا کی کریں تو اردو یہاں بھی اپنی چمک دمک کے ساتھ نظر آتی ہے۔ سائبر کی دنیا میں تیزی کے ساتھ اردو کی بڑھتی مقبولیت نہ صرف اردو کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے بلکہ اس کے فروغ کے کئی در وا کرتی ہے۔ کیونکہ موجودہ صدی انٹرنیٹ کی صدی ہے۔ کسی بھی زبان، تحریک یا رجحان کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کے لیے موجودہ عہد میں سب سے موثر اور تیز وسیلہ انٹرنیٹ ہی ہے۔

اردو کے حوالے سے موجودہ صورت حال جہاں اردو والوں کو خوشی کا موقع فراہم کرتی ہے، وہیں ان کے اوپر کچھ ذمہ داریوں کو بھی عائد کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اب جب کہ اردو سارے عالم میں پڑھی، بولی اور لکھی جا رہی ہے تو زبان کے معیار کے تئیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر اردو والے اچھی زبان لکھیں گے، بولیں گے تو وہی زبان ہر جگہ رواج پائے گی اور اگر وہی زبان کے مقتضیات، مطالبات اور معیارات کو خاطر میں نہیں لائیں گے تو غیر اردو داں طبقات کے یہاں اردو کی کیا صورت حال یا درگت ہوگی، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے مصنّفین اور قلمکاروں کو اپنی تحریروں کے موضوعات کے دائرے کو بھی وسیع کرنا ہوگا تاکہ مختلف ملکوں کے لوگوں کی ضروریات کو اردو زبان پوری کر سکے۔ بعض موضوعات ہنوز ایسے ہیں جن پر اردو میں مضامین تو لکھے گئے ہیں مگر باضابطہ کتابوں کی کمی ہے۔ مثلاً سائنس، ٹیکنالوجی، نفسیات، اقتصادیات، معلومات عامہ وغیرہ پر اردو میں بہت کم مواد دستیاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کی پورے عالم میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ اب اگر کوئی غیر اردو داں شخص ان موضوعات پر اردو میں کتابیں پڑھنا چاہے گا، تو اس کی تشفی کیسے ہوگی۔ خود اردو والوں کو ایسے اہم موضوعات پر مواد کی تلاش و جستجو کے لیے دوسری زبانوں کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جس کے سبب ان کو کافی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس لیے اردو کے قلمکار اپنے عہد کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مضامین، مقالات اور کتابیں تصنیف کریں۔

اردو کے مصنّفین نے ادب و آرٹ سے وابستہ موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ داستانوں، ناولوں، افسانوں، انشائیوں، خاکوں، ڈراموں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اردو زبان میں دستیاب ہے۔ شعر و شاعری کے میدان میں تو اردو بہت آگے نکل چکی ہے اور بڑی عالمی زبانوں کی صف میں کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن زندگی گزارنے کے لیے صرف شعر و شاعری یا بعض نثری تخلیقی اصناف کافی نہیں ہیں، بلکہ اس مواد کی بھی ضرورت ہے جو زندگی کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ نفسیات، اقتصادیات، سماجیات اور سائنس و ٹکنالوجی کے بغیر کامیاب زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہر زندہ زبان میں ان موضوعات پر وافر مقدار میں کتابوں و تحریروں کی ضرورت ہے۔ اردو کے قلمکار آگے بڑھیں، اپنے مطالعہ میں وسعت پیدا کریں، اور عملی زندگی سے جڑے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر لکھیں تاکہ اردو زبان نہ صرف اظہار جذبات و احساسات کا ذریعہ ثابت ہو بلکہ عملی زندگی کے ہر شعبے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے۔ ماہنامہ ’اردو دنیا‘ مختلف موضوعات کو سمیٹتے ہوئے ادب، ثقافت، سیاحت، ماحولیات، سماجیات، سائنس اور ٹیکنالوجی پر بھی مضامین شائع کرتا ہے کہ اہل قلم اس طرف راغب ہوں اور اردو کو ہر میدان میں آگے بڑھائیں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

مارچ کا شمارہ اردو دنیا حاصل ہوا۔ رسالے کی ترتیب وتدوین میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ تمام مضامین مصنفین کی تحقیق، محنت ولگن کا نتیجہ ہیں۔ 'ہماری بات' میں سائنسی علوم کی اہمیت وافادیت پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا ہے اور عصر حاضر میں سائنسی مضامین کی اردو زبان میں اشاعت نہ ہونے کے اسباب بھی بتائے ہیں یہ یقیناً لمحہ فکر ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں موجود سائنس وٹیکنالوجی کے علوم اردو زبان میں منتقل کیے جائیں اور یہ کام ایک منصوبہ کے تحت ہونا چاہیے۔ جبکہ ایسا بھی نہیں ہے کہ اردو میں سائنس پر کم لکھا گیا ہے ماضی میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جب سائنس کے تمام علوم اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔

گوشۂ ذکر حنیف کیفی' میں پروفیسر کوثر مظہری نے بڑے جامع انداز میں حنیف کیفی کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے اور خصوصاً تنقید وتوجیہ' کا ذکر کیا ہے کہ کیسے اس کتاب کا ہر مضمون اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔ حنیف کیفی کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جسے اپنی ذات کا ادراک ہو اور جو اپنی قوت فکر پر پوری طرح اعتماد رکھتا ہو وہی ایسے اشعار کہہ سکتا ہے۔ وہ حنیف کیفی کو انا گزیدہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں کہ ان کے اشعار جگہ جگہ ان کی شخصیت کی غمازی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر اپنی انا کو نبھانا سبھی کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ یقیناً یہ مضمون حنیف کیفی کے فکر وفن کا احاطہ کرتا ہے۔ میں اپنی جانب سے پروفیسر کوثر مظہری کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محمد اکرام کا مضمون' حنیف کیفی کوائف وکیفیات' بھی بہت پسند آیا۔ اس مضمون میں انھوں نے صاحب تصنیف کی شخصیت، ذاتی زندگی اور تصانیف کا بھرپور انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ذاتی زندگی کے پہلوؤں کو وہی پیش کر سکتا ہے جو انھیں بہت قریب سے جانتا ہو۔ محمد اکرام صاحب خوش نصیب ہیں کہ انھیں یہ موقع ملا۔ ورنہ تخلیق کی حد تک ہی فن کار کو جانا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر اکثر ملاقات کے بعد یہ معاملہ تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ محمد اکرام نے اتنے اچھے انداز میں ایک ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی بات ختم ہی نہ کریں بس کہتے چلے جائیں اس مضمون کے لیے میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سید صفدر کا مضمون 'خضر بے منزل حسن بشیر مرحوم' پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے ایسے جیالے بھی گزرے ہیں جنھوں نے ورود جیسے چھوٹے سے مقام پر اردو ادب کی ایک ایسی شمع جلائی جس کی روشنی میں تنقید نگار سید صفدر، انشائیہ نگار محمد اسد اللہ، جدید شاعر عارج میر اور مصنف شاہد رشید جیسے اردو زبان کے خدمت گاروں کی ایک انجمن تیار ہوگئی۔ میں اپنی جانب سے سید صفدر صاحب کو اتنے اچھے مضمون کے لیے بہت مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اظہر ابرار: پلاٹ نمبر A/64، راٹھوڑ، لے آؤٹ، احت نگر، ناگپور، مہاراشٹر

مارچ کا 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ صد نوازش۔ تمام مشمولات جدید فکر و تحقیق کا استعارہ ہیں، سرورق دیدہ زیب اور دلکش اداریہ اپنی معنی آفرینی اور پر مغز دلائل کے ساتھ اذہان علم و ادب کو متاثر کر رہا ہے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج، جھارکھنڈ

مارچ کے شمارے کے اداریے میں اس بار اردو زبان و ادب کے باہمی روابط اور اس کی راہ میں پیدا کی گئی غلط فہمیوں کا دفاع کرنے کی وقتی و اہم ضرورت کی بخوبی نشان دہی کی گئی ہے۔ شمارے میں جناب امین احسن نے اپنے مضمون میں فلمی سے بھی کہیں زیادہ ادبی شاعر جناب مجروح سلطانپوری کے ابتدائی ادبی سفر کے متعدد واقعات کی معلومات افزا باتوں سے قارئین کو واقف کرایا ہے۔ قیوم بدر صاحب اور محترمہ سریتا چوہان دونوں ہی نے اپنے مقالوں میں ساحر لدھیانوی اور مجروح کی شاعری اور نغمات کا ایک معیاری تجزیہ پیش کیا ہے۔

محترمہ استوتی اگروال نے اسی شمارے میں 'عالمی انتساب' جیسے بلند پایہ جریدہ کے مدیر، ادیب و شاعر حلیم الطبع ڈاکٹر سیفی سرونجی سے ایک احسن و معلومات افزا مشافہہ (مصاحبہ) پیش کیا ہے۔ کلی طور پر اپنے معقول و مناسب جوابات و منفرد شاعری کے باعث موصوف کی جبلت و فطرت کی حد درجہ کتب دوستی، انکساری و عاجزی کو لائق صد ستائش قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے آئینے میں عرفان صدیقی کا ایک شعر سیفی سرونجی کی شخصیت پر صحیح اترتا ہے۔ 'کبھی تو کوئی پڑھے گا لکھا ہوا میرا/ کبھی تو کام یہ شوق فضول بھی دے گا۔' جنت نظیر کشمیر کی اول غزل گو شاعرہ لل دید کی سوانح عمری و شاعری کی بابت بہت کم مواد دستیاب ہے، اسی لیے محمد یاسین گنائی کے مضمون کی افادیت و اہمیت جامع و مستند مانی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر گلی نمبر 18-K، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے چار رسالے 'اردو دنیا' 'بچوں کی دنیا' 'خواتین دنیا' اور 'فکر و تحقیق' شائع ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے بلکہ ہم خود کہہ سکتے ہیں کہ تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہنامہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ ہے جس کے ہر شمارے میں پڑھنے کے لیے اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ۔

جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے اور پابندی سے یہ شمارہ اس آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ادب کا معیار بھی ہے۔ سرکاری سطح پر شائع ہونے والے رسالوں میں اس کا اپنا منفرد مقام ہے۔

زیر نظر شمارہ جلد 23 شمارہ 01 جنوری 2021 ہے۔ اداریہ میں ہماری بات کے تحت مدیر نے بڑی اچھی اور سچی باتیں کہیں جس پر تمام اردو داں طبقے کو عمل کرنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں 'اردو ہمارے ملک کی ایسی زبان ہے جس نے ہمیشہ جمہوری اقدار کا پاس و لحاظ رکھا ہے اور اپنے کردار سے جمہوریت کو تقویت بخشی ہے۔ اس زبان کے صحافیوں' ادیبوں اور شاعروں نے گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور ترجمانی کی۔''

ابتدا آپ کی بات (قارئین کے خطوط) سے ہے۔ اس میں شائع ہونے والے خطوط بھی معلومات سے پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی میں پہلی تخلیق پہلا تاثر میں بڑے ہی اچھے تاثرات پڑھنے کو ملیں گے کس طرح ایک ادیب کی پہلی تخلیق شائع ہونے سے خوشی ہوتی ہے۔

تعلیم ترسیل اور تحقیق کے تحت روبینہ کا مضمون 'جدید ٹکنالوجی اور تدریسی نظام' ہے جس میں تعلیم میں ٹکنالوجی کے فوائد، ٹکنالوجی کے ساتھ اور ٹکنالوجی کے بغیر تعلیم، اکیسویں صدی کا استاد وغیرہ عنوانات کے تحت تجزیہ کیا ہے۔ اس کے بعد شکیل کا مضمون 'موجودہ امتحانی نظام مسائل اور امکانات' اور محمد عرفان ملک کا مضمون، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں اردو تحقیق شامل ہے اس سے پنجابی یونیورسٹی میں اردو کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

نقد و نگاہ کے عنوان سے 'اردو تذکرہ نویسی اور مولوی عبدالحق کی تحقیق' پر محمد نذیر احمد کا سیر حاصل مضمون ہے۔ حسرت جے پوری کی غزل گوئی پر نذیر فتح پوری کا مضمون ہے انہوں نے پرانی فلموں کی یاد دلا دی۔ حسرت کی غزلیں پڑھ کر دل کی حسرت دوبارہ زندہ ہوگئی۔ اس کے بعد عبدالحفیظ کا مضمون دور اول کی اردو شاعری میں حب الوطنی ہے۔ سودا، درد، میر تقی میر اور حالی کے حوالے سے کافی اچھا مواد ہے رئیسہ پروین کا مضمون ن۔ م راشد اور اقبال کا بہ نظر غائر جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں: ''اقبال و راشد کا فن بتدریج ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔''

محبوب حسن کا مضمون عطیہ حسین اور زوال پذیر جاگیردارانہ نظام پر عطیہ کے انگریزی ناول کا بھی خوب جائزہ لیا۔ یہ اردو ادب میں شاندار اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

یادرفتگان کے تحت زیر لب صفیہ اختر کی ایک سرگوشی گونج اٹھی۔ دراصل یہ صفیہ اختر کے خطوط کا وہ مجموعہ ہے جسے جاں نثار اختر نے صفیہ اختر کی وفات کے بعد ترتیب دیا۔ حیدرآباد دکن میں بھی سلیمان اریب نے صفیہ اریب کو جو خط لکھے اور صفیہ نے جو خط اریب کو لکھے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ جس پر یونیورسٹی سطح پر کام ہو رہا تھا۔ مگر مکمل نہ ہو سکا۔ اریب صبا کے ایڈیٹر تھے۔ یادرفتگان میں دوسرا مضمون 'گمشدہ معصومیت کا متلاشی محمد علوی' ہے۔ مضمون نگار نے بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں عکاسی کی ہے۔ تیسرا مضمون: پیغام آفاقی کی فکشن نگاری ہے۔ خصوصی گفتگو کے تحت ساجد جلال پوری نے جناب زاہد جعفری جلال پوری سے گفتگو کی۔ عموماً یہ گفتگو آپ کی بات کے بعد شائع ہوتی تھی اس مرتبہ صفحہ 40 پر اسے دیا گیا ہے۔ عربی ادبیات کے عنوان سے تین مضامین' سعودی عرب میں ناول نگاری، ایک مختصر جائزہ' (صہیب عالم) بوکر انعام یافتہ ناول نگار عبدالوہاب عیساوی (جسیم الدین) عبدالحمید جودہ سحار عربی ناول نگار کا ایک درخشاں نام (محمد قاسم) ہے۔ تینوں مضامین عربی ادب میں ناول نگاری سے متعلق ہیں۔ اور مضمون نگاروں نے ان کا عمدہ تجزیہ کیا ہے جو اردو ادب کے لیے بیش قیمت خزانہ ہے۔

شخصیات کے تحت 'شیراز ہند کا بیباک شاعر وامق جونپوری' آفتاب عالم اعظمی کا ہے۔ وامق کی شاعری کا جائزہ لیا ہے خاص طور پر ان کی نظموں پر بحث کی ہے اس کے بعد 'مخمور سعیدی کی شعری کائنات' عرفان رشید کا مضمون ایک بھرپور خراج ہے۔

شہر ستارے بیکانیر میں غیر مسلم قلمکاروں کی اردو خدمات' شکیلہ بانو کا ہے انھوں نے وہاں کے غیر مسلم قلم کاروں کا جائزہ لیا۔

'نیا آسمان نئے ستارے' کے عنوان سے سید وجاہت مظہر کا مضمون 'خودنوشت سوانح نگاری میں ہیئتی تجربہ کاری، پیکر تراشی اور جمالیاتی اسلوب نگاری' (آشرم از شکیل الرحمن کے حوالے سے) مضمون نگار نے خودنوشت کی تحریروں میں کیا مشکلات پیش آتی ہیں اس کے حوالے کے ساتھ آشرم کا تجزیہ کیا ہے اس عنوان کے تحت 'علی جواد زیدی اور

تعمیری ادب' عبداللہ اسلم کا مضمون ہے جس میں علی جواد زیدی کی کتاب تعمیری ادب کے علاوہ ان کی شاعری کا بھی تذکرہ ہے اس کے بعد' اردو میں ادبی تاریخ نگاری ایک جائزہ' ارشاد قمر نے تمام کتابوں کے حوالوں سے خصوصاً کشف الحقائق' آب حیات، تاریخ نثر اردو' تاریخ ادب اردو کے ذریعے ادبی تاریخ نگاری کو قلم بند کیا ہے۔

صحت اور سماجیات کے عنوان سے محمد اسرار عالم کا مضمون' کورونا بحران' اور متعلقہ پسماندگی سے نمٹنے میں پیشہ ورانہ سوشل ورک کی اہمیت اور ممکن مداخلت ہے۔ جس میں انہوں نے تمام تناظر میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ کمپیوٹر کے تحت' ورک شیٹ کا سجانا' کمپیوٹر سے متعلق معلوماتی مضمون ادارہ کا ہے۔ تبصرہ و تعارف کے تحت راغ عظیم آبادی' حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل'' پر تبصرے ہیں یہ کتابیں قومی اردو کونسل سے شائع کی گئی ہیں اس کے علاوہ کتاب دنیا میں جوگندر پال دیدہ و نادید' نقوش شبلی میرے تعلق سے میں ایک مبصر' نیا حمام' سر شاخ گل' اس کے نام پر سیر حاصل تبصرے ہیں۔ اس کے بعد قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں شامل ہے۔

ڈاکٹر م.ق. سلیم: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہ فروری' اردو دنیا' کا خوبصورت شمارہ زیر نظر ہے۔ یہ شمارہ مختلف معیاری مضامین پر مبنی ہے مشہور و معروف ناقد مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کے متعلق چار مضامین شامل کیے گئے ہیں فاروقی صاحب کی وفات ماہ دسمبر 2021 کی پچیس تاریخ کو ہوئی تھی اس لیے ان کے حوالے سے مختلف رسائل و جرائد میں مضامین چھپ رہے ہیں یہ ضروری بھی ہے کہ ایسے اردو ادبا اور شعرا جنھوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے کام کیا اور وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں ان کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے شمس الرحمٰن فاروقی پر یہ چار مضامین اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں شمس الرحمٰن فاروقی کے متعلق مضامین کے علاوہ اور بھی چند تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تبصرے وغیرہ شامل کیے گئے ہیں پروفیسر احمر لاری، ظفر احمد صدیقی اور حنیف ترین پر بھی ایک ایک مضمون خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا گیا ہے' اردو دنیا' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک معیاری رسالہ ہے جو عرصہ دراز سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس کے ذریعے مختلف نوعیت کے مضامین اور تبصرے بھی ہر ماہ شائع ہوتے ہیں۔ اس رسالے میں جو تعارف و تبصرہ والا ایک کالم قائم کیا گیا ہے وہ بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جس کے ذریعے قاری اپنے تاثرات پیش کرتے ہیں ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے اور جہاں کہیں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اس کی طرف بھی مدلل اشارے کر دیے جاتے ہیں تاکہ اس قسم کی کمیوں کو دور کیا جاسکے۔ اردو دنیا کے سبھی شمارے اپنے دیدہ زیب سرورق کے ساتھ تمام صفحات اپنے اندر خوبصورتی لیے ہوئے ہوتے ہیں جس سے قاری کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نے اردو زبان و ادب کی ترقی اور بقا کے لیے ہمیشہ عمدہ کام کیا ہے اور اب بھی کر رہا ہے ادارے کے تمام منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

چودھری امتیاز احمد: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

ماہ نومبر کی معنویت کے لحاظ سے سرورق پر تصاویر بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ نومبر میں ادبی و سیاسی لحاظ سے کئی ایک دانش ور پیدا ہوئے۔ بچوں کے ادب پر لکھے گئے کتابوں کا حال تصویروں کے ذریعے سے دیا گیا ہے۔ اداریہ میں مدیر نے سرقہ کے تعلق سے اہم نکات پیش کیے ہیں۔ گوشہ ادب اطفال کے بارے میں لکھا ہے اور بچوں کے شاعروں و ادیبوں کی سماج میں وقعت کم ہوئی ہے لیکن بچوں کے ادب لکھنے کے لیے بچوں جیسا ذہن، نفسیات، کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کا ادب بڑے لکھتے ہیں۔ بچوں کا ادب اگر بچے لکھیں تو بہت عمدہ ادب اردو کو ملے گا۔ قاضی مشتاق احمد نے اردو زبان و رسائل پر اچھی گفتگو کی ہے یقیناً اگر اردو پڑھنے لکھنے والے نہیں ہوں گے تو اردو کا اردو میں مرثیہ کون لکھے گا اس لیے اردو سے اولاد کی طرح محبت کریں۔ عبدالحق نے' اقبال کی داستان سرائی' میں اقبال کی شاعری، فکر و فن سے اچھی بحث کی ہے۔' مظہر احمد اردو طنز و مزاح کی روایت' اور نظیر اکبرآبادی کی شاعری اور نظموں کی نشاندہی کی جس میں طنز و مزاح مل جاتا ہے۔ جعفر زٹلی کے بعد ایک اور ابتدائی طنز و مزاح نگار کا انکشاف ہوا ہے۔ محمد اختر کے مولانا آزاد سائنس اور ٹیکنالوجی میں مولانا آزاد کی فنی و علمی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ فاروق بخشی نے جانے والے کو کہیں روک سکا ہے کوئی پروفیسر فضل امام کی یاد میں ان کی زندگی، حالات زندگی، ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ بچوں کے ادب گوشہ میں جملہ پانچ مضامین شامل ہیں جن میں بچوں کے ادب کے بارے میں تنقیدی تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ میری دانست میں بچوں کے ادب سے کما حقہ استفادہ کرنا ہو تو بچوں کو سیل فون، آئی فون، اسمارٹ فون وغیرہ کو بچوں سے علاحدہ کر کے رکھیں۔ بچوں کے ادب و رسائل سے ان میں دل چسپی پیدا کریں ورنہ جو ادب لکھا جا رہا ہے اگر یہ بچے نہ پڑھیں تو کیا فائدہ۔ اس کے علاوہ مزید جو 6 مضامین لکھے گئے ہیں وہ اچھے ہیں۔ اس شمارے کے باقی مشمولات ادبی معلومات سے پر ہیں اور بچوں کا گوشہ بھی فکر انگیز، بصیرت افروز ہے۔ بچوں کے ادب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

پہلی تخلیق پہلا تاثر

میر نے غالب کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ'' اگر غالب کو کوئی استاد مل گیا، اور اس نے غالب کو صحیح راستے پر ڈال دیا تو یہ ایک لاجواب شاعر ہوگا۔'' ایک شفیق استاد ہی طالب علم کو علم کی روشنی سے مالا مال کرتا ہے۔ استاد ہی طالب علم کے علم و ہنر اور ادبی صلاحیتوں کو پہچان کر اس کو اس راہ پر گامزن ہونے کی دعوت عمل دیتا ہے اور ایک قلم کار کی ادبی صلاحیتوں کو پرکھنے اس کو پروان چڑھانے کا سہرا رسائل کے سر ہوتا ہے۔ رسائل سے ہی قلم کاروں کے حوصلوں میں جان آتی ہے۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ زور پکڑتا ہے۔ ورنہ تخلیق کار کی ساری کاوشیں دیمک کی نذر ہوتی ہیں۔ یا صرف اس کی ہی لائبریری کی زینت بنتی ہیں۔ رسائل کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ قلم کار میں ایک جوش بھر دیتے ہیں، جس سے وہ اپنے مقصد کی طرف تیزی سے گامزن ہوتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اشاعت' اردو دنیا' کا شمارہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یوں تو اس ادارے کو کافی وقت سے جانتے تھے۔ اکثر سیمناروں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے جب بینر پر لکھا ہوا دیکھتے تھے تو ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ'' پروگرام تو اساتذہ نے رکھا ہے، پر اس ادارے کا نام کیوں لکھا ہوا ہے؟'' اتنی ذہانت نہیں تھی کہ یہ سمجھ سکیں کہ یہ ہندوستان میں زبان کو فروغ دینے کے لیے سب سے بڑا ادارہ ہے۔۔ اور جب اساتذہ کو ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے سنتے کہ'' مبارک ہو آپ کا مضمون' اردو دنیا' میں شائع ہوا ہے۔''

زیر مطالعہ لائبریری کی اکثر کتابوں پر لکھا ہوا ہوتا تھا۔'' قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے مالی تعاون سے۔'' تو پھر ذہن میں خود اس بات کا جواب پیدا ہوتا کہ

''شاید قومی اردو کونسل ہی سب سے بڑا ادارہ ہے اور 'اردو دنیا' ہندوستان کا سب سے بڑا رسالہ ہوگا۔لیکن جب شعور آیا تو دیکھا کہ واقعی قومی کونسل حکومت ہند کا زبان کو فروغ دینے میں سب سے بڑا ادارہ ہے۔ زبان کے لیے اس کی خدمات گرانقدر ہیں اور 'اردو دنیا' میں کافی معیاری مضامین شائع ہوتے ہیں جو کافی معلوماتی بھی ہوتے ہیں اور اکثر آن لائن پڑھنے کی عادت ڈال لی۔

اس کے علاوہ دوسرے رسائل بھی پڑھتے رہے۔لیکن ذہن میں ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ معیاری مضامین صرف اردو دنیا میں شائع ہوتے ہیں۔ چونکہ جن مضامین کو تلاش کرنے کے لیے ہمیں لائبریری کا رخ کرنا ہوتا تھا، وہ ہمیں یہاں آسانی سے مل جاتے تھے۔اس لیے اس کی ممبر شپ بھی لی۔ یقیناً پہلی تخلیق اپنا پہلا تاثر چھوڑتی ہے۔ چونکہ ہم کوئی قلم کار نہیں، ایک ادنیٰ سی طالب علم ہیں اور اپنے آپ کو قلم کار کے زمرے میں رکھتے بھی نہیں۔ اس لیے طالب علمی میں یہ صرف کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتا کہ کسی طالب علم کے کسی مضمون کی اشاعت معیاری رسائل میں ہو۔اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ہمارے لیے بھی مضمون 'آگرہ شہر کا ادبی تعارف' (مارچ 2021) کی اشاعت کسی اعزازی سند سے کم نہیں۔اس مضمون کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مضمون نے ہم سے خود کو لکھوایا ہے۔ اور شائع بھی اہتمام کے ساتھ بڑے مثالی رسالے میں ہوا۔ چونکہ آگرہ اور اردو سے وابستہ جو کچھ بھی ذہن میں تھا۔ بس اس کو صفحۂ قرطاس پر اتارتے گئے یوں یہ ایک مضمون کی شکل اختیار کر گیا۔ اور کتابوں کی ورق گردانی سے اس کو درست کرتے رہے۔ تیار ہوتے ہی اس کو قومی اردو کونسل کی آئی۔ڈی۔ پر بھیج دیا اور ادارے نے اس کو مارچ 2021 میں شائع کر دیا۔ درحقیقت پہلی تخلیق اپنا پہلا تاثر قائم کرتی ہے۔

اس لیے ہماری مسرت کی انتہا نہیں۔ چونکہ یہ ہماری ادنیٰ سی کوشش ہے۔ حیات اور وقت نے ساتھ دیا تو ان شاء اللہ۔ یہ کوشش جاری رہے گی اور یہ مضمون ہمارے لیے یادگار کے طور پر رہے گا۔ 'ماہنامہ اردو دنیا' کی یہ حوصلہ افزائی ان شاء اللہ ہمارے لیے میل کا پتھر ثابت ہوگی۔ اردو زبان سے اگر محبت نہیں ہوتی تو نہ معلوم آج ہم کس راہ پر گامزن ہوتے۔

محمودہ قریشی: 22/78، ڈھولی کھار، منٹولا، آگرہ فورٹ آگرہ، یوپی

مارچ 2021 کا شمارہ ماہنامہ اردو دنیا میں میری پہلی کاوش کی اشاعت کی خبر جب ایک دوست نے فون پر دی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایک معیاری مجلّے میں تحریروں کا شائع ہونا کسی اعزاز سے کم نہیں۔ 'اردو دنیا' ہندوستان کا واحد ایسا مجلّہ ہے جو پوری دنیا میں پڑھا جاتا ہے اور اس میں بیرونی ممالک کے قلمکاروں کی تحریریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ اس میں مختلف علوم وفنون پر تحریریں ملتی ہیں جیسے ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب وتمدن، زبان و بیان، تعلیم و تعلم، سائنس، طب اور نفسیات وغیرہ۔ ایک قلمکار کبھی اپنے پہلے اسکول، پہلی کتاب، پہلے استاد، پہلے انعام، پہلی نوکری اور پہلی تنخواہ کو کبھی نہیں بھولتا۔ خیر میرے مضامین دوسرے رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں، لیکن اس معروف ومقبول رسالے میں میرا مضمون پہلی بار شائع ہوا ہے جب کہ میں سمجھتا تھا کہ اس میں بڑے ادیب یا دوسرے ممالک کے ادیبوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہمارے مضامین اس لائق نہیں ہوتے ہیں۔ ہماری تحریروں میں وہ بات نہیں ہوتی ہے لیکن اب ہمارا اعتماد بحال ہوا۔ اب میں اپنی تحریروں کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔ یہ ادبی رسائل ذہن سازی میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والے رسالے 'اردو دنیا' اور 'فکر و تحقیق' سے مجھے پہلے سے رغبت تھی کیونکہ بچپن سے ہی میں اپنے والد محترم کو ان رسالوں کو پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ اردو زبان کی ترویج واشاعت کی خاطر این سی پی یو ایل اتنے کم قیمت پر معیاری رسالے شائع کرتا ہے جو واقعی قابل ستائش عمل ہے۔ آخر میں مدیر ومشیر اور معاونین کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس خاکسار کی حوصلہ افزائی کر کے عزت بخشی۔

زاہد احسن: بانسی، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی

■

صرف شخصیات نہیں صنفیات پر بھی مضامین ارسال کریں

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

علامہ اقبال کے دو ممدوح

شمیم طارق

مرزا غالب
اور
سوامی رام تیرتھ

علامہ اقبال نے مرزا غالب کو بھی منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے جن کا انتقال ان کی پیدائش سے 8 سال قبل ہو چکا تھا اور سوامی رام تیرتھ کو بھی جن کی پیدائش ان کی پیدائش سے 4 سال قبل ہوئی تھی۔ دونوں نظمیں 'بانگ درا' میں شامل ہیں۔ غالب نے اگرچہ دعویٰ کیا تھا کہ

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

اور بیعت بھی ہوئے تھے مگر ان پر تصوف تو کیا اسلام کی قبا بھی پوری طرح جچتی نہیں ہے۔ مگر سوامی رام تیرتھ کی زندگی ہی نہیں موت بھی 'ویدانتی' کی حیثیت سے جذب و مستی میں گزری تھی۔ ان دونوں نظموں کی مختصر تفہیم وتشریح پیش کی جارہی ہے۔

مرزا غالب

غالب اور اقبال دونوں نے فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں اور اردو میں بھی۔ شاعروں کی مختصر سے مختصر فہرست بھی ترتیب دی جائے گی تو اس میں غالب اور اقبال دونوں کے نام شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اردو کی مملکت شاعری پر غالب کے غلبے کے باوجود غالب کے رنگ میں شعر کہنے والے تو کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں یعنی چند ہی شعر میں سہی مگر انہوں نے غالب کی یاد تازہ کردی ہے مگر اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے رنگ میں کسی نے شعر کہنے کی جسارت کی تو اپنا رنگ بھی برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس کے باوجود اقبال نے نہ صرف غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ شعروں کے ان محاسن کی بھی نشاندہی کردی ہے جو شاعری کو عظیم یا بڑی بناتے ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم مرزا غالب میں غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

اس شعر میں چار لفظ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ پہلا لفظ 'لطف' مذکر ہے اور 'مزہ' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے خود اقبال نے اپنی نظم 'صدائے درد' میں استعمال کیا ہے۔

اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اور عنایت و مہربانی کے معنی میں بھی جیسے اقبال کی نظم 'وطنیت' کا مصرع ہے۔

ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور

دوسرا لفظ گویائی مونث ہے اور خود اقبال نے اس لفظ کو کئی طرح سے استعمال کیا ہے مثلاً صدائے درد (بانگ درا) کا ایک مصرع ہے۔

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں

زیر تبصرہ نظم 'مرزا غالب' میں یہ لفظ بولنے کی کیفیت یا عمل کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

اور فصاحت یا شعر گوئی کے معنی میں بھی مثلاً

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں

اقبال کی شاعری میں ایسی کئی تراکیب استعمال ہوئی ہیں جو دو لفظوں کے امتزاج یا ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً اپنی نظم عہد طفلی (بانگ درا) میں 'لطف جاں' استعمال کیا ہے۔ جو اس روحانی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے روح لطف اندوز ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

تھی ہر اک جنبش نشان لطف جاں میرے لیے

یہاں لطف گویائی سے شعر گوئی کا وہ ملکہ یا قدرت مراد ہے جو غالب کے لیے خاص تھی اور جس کے سبب غالب کا کوئی متبادل پیدا ہوسکا نہ مقابل۔

مصرع ثانی میں تخیل اور فکر یا فکر کامل کا استعمال اقبال جیسا قادرالکلام شاعر ہی کرسکتا تھا جس کے استعمال کیے ہوئے لفظوں، وضع کی ہوئی ترکیبوں اور تخلیق کیے ہوئے مصرعوں میں پوری معنیاتی کائنات سمٹ آئی ہے۔ غالب کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

مذکورہ شعر بھی غالب کے اس دعوے کی دلیل ہے۔

تخیل سے مراد وہ قوت ہے جو خیالات کی صورت

گری کرکے ان کو فہم کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے جبکہ منطق کی اصطلاح میں تخیل سے مراد وہ کیفیت ادراک ہے جو حواس خمسہ کے ذریعے خیالات میں جمع ہو جاتی ہے۔ انسان اندازہ نہیں کر پاتا کہ اس کا تخیل کہاں تک پرواز کرسکتا ہے اقبال نے اسی نظم میں غالب کے تخیل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے۔

ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

فکر کا استعمال سوچ بچار، تردد، تدبر اور اندیشے کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور فکر کرنا، شعر گوئی کے لیے بھی مستعمل ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں فکر جدید یا جدید تر معنی کے حصول یا جو معلوم ہے اس سے نامعلوم کی دریافت کو کہتے ہیں۔ اقبال نے اسی نظم میں کہا ہے۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا

تخیل تذکیر ہے اور فکر تذکیر و تانیث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں لفظوں یعنی تخیل اور فکر کے استعمال سے اقبال نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ تخیل یعنی محسوسات کے ذریعے جمالیاتی تشکیل اور فکر کامل یعنی معقولات کے ذریعے حاصل کیے گئے معنی کو وہ خوبصورت پیرایہ بیان عطا کرنے پر قادر ہے، جس میں ان کی ہمسری کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ نظم میں پانچ بند ہیں اور ہر بند میں مختلف انداز اور پیرائے میں اسی حقیقت کی ترسیل کی گئی ہے۔

پہلے بند میں اقبال نے غالب سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار اور ان کی شاعرانہ قدرت کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ غالب اس حسن کا متلاشی ہے جو سوز کائنات بن کر کائنات کی ہر شے میں پوشیدہ ہے۔ مگر جس طرح حسن ازلی پردے میں بھی ہے اور بے پردہ بھی اسی طرح غالب کی شاعری کا حسن یا جوہر پنہاں بھی ہے اور عیاں بھی۔ بہت کم لوگ ان کی شاعری کے محاسن کا ادراک کر سکے ہیں۔

زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ غالب کے کلام کے حقیقی محاسن ذکر و فکر کو جلا دینے کے باوجود ہمارے ادراک اور قوت اظہار کے لیے آزمائش کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

غالب بہت بڑے شاعر ہیں اور انہوں نے یہ عظمت اپنے کلام میں واردات عشق کی ہو بہو تصویر بنانے کے ساتھ ساتھ وہ شوخی پیدا کرکے حاصل کی ہے جو لب تصویر پر جنبش پیدا ہونے کے نادر تصور یا تخیل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی انداز بیان نہایت شوخ، دل کش اور نادر ہے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

تیسرے بند کا آغاز۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر

جیسے شاہکار مصرع سے ہوتا ہے۔ نطق مجموعہ ہے اس ادراک کا جو عقل اور احساس سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں اقبال نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ غالب کی فکر یا ان کے اختیار کیے ہوئے پیرایہ بیان میں یہ کائنات اپنی اصل سے زیادہ بڑی نظر آتی ہے اور یہی نہیں کہ غالب اپنے ذہن، اپنی شخصیت اور شاعری کے سبب بہت بڑے ہیں بلکہ وہ دہلی بھی جہاں غالب آسودہ خاک ہیں غالب سے نسبت کے سبب 'شیراز' کے لیے قابل رشک بن گئی ہے۔ اس بند میں انھوں نے اس شہر کا بھی ذکر کیا ہے جہاں جرمنی کا شاعر گوئٹے دفن ہے۔

چوتھے بند میں اقبال نے جو بات کہی ہے وہ غالب کا قصیدہ بھی ہے اور دلی کے ساتھ اس زبان اور شعری روایت کا مرثیہ بھی جس میں غالب نے اپنی عظمت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو زبان اور شاعری ابھی کمال کو نہیں پہنچی ہے دونوں کی ترقی کے امکانات باقی ہیں اس کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ مستقبل میں کوئی دوسرا غالب یا غالب کی ہمسری کرنے والا کوئی دوسرا شاعر پیدا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ تخیل اور فکر، غالب جیسے نابغہ روزگار میں ہی یکجا ہو سکتے تھے۔ یہ خصوصیت سب کا مقدر نہیں اور پھر ہندوستان کے حالات بھی بدل گئے ہیں۔

پانچویں بند میں دہلی کو گہوارہ علم و ہنر قرار دیتے ہوئے اعتراف کیا گیا ہے کہ اس سرزمین میں ایک سے ایک صاحبان علم آرام فرما ہیں مگر ان میں غالب جیسا فخر روزگار کوئی دوسرا نہیں ہے۔

اس شاہکار نظم میں غالب کی شاعری کا جو جوہر سامنے آتا ہے اور لفظوں کو جمالیاتی تناظر میں دیکھنے، لفظوں کے بنائے ہوئے Images سے نئے معانی برآمد کرنے اور ماورائی تصورات و کیفیات کو خالص انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی راہ استوار کرتا ہے۔ یہ وہ راہ ہے جہاں شاعر کی شوخی یعنی زندہ دلی اور جادو بیانی کے سبب زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ خیالوں کی تصویر بھی زندگی کے زندہ مظاہر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے مایوسی و پژمردگی کی کیفیت میں کہا ہوا شعر بھی زندگی بخش بن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کی فکر میں غالب کے شعروں میں لفظ و معنی کی یکجائی جمالیاتی تناظر فراہم کرتی اور انسانی قدروں کا احترام کرنا سکھاتی ہے اس لیے انھوں نے کہا ہے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

سوامی رام تیرتھ

علامہ اقبال اور سوامی رام تیرتھ الگ الگ مذاہب سے مگر ایک ہی ملک اور ملک کے ایک ہی خطے (پنجاب) سے تعلق رکھتے تھے۔ سوامی رام تیرتھ گجرانوالہ کے ایک گاؤں کے بہت ہی غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنہ پیدائش بہ اختلاف روایت 1873 بتایا جاتا ہے جبکہ اقبال 1877 میں پیدا ہوئے۔ سوامی رام تیرتھ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ریاضی میں ایم اے کیا تھا۔ اقبال 1904 میں اسی کالج میں لیکچرر ہوئے تھے اس لیے ممکن ہے دونوں میں ملاقات بھی رہی ہو مگر یہاں ان کے آپسی رشتے پر روشنی ڈالنا یا رشتے کی نفی کرنا مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ سوامی جی پر ویدانت کا رنگ ابتداء ہی سے غالب تھا۔ 'ویدانت' سنسکرت کے دو الفاظ Ved اور Ant کا مجموعہ ہے اور چونکہ ہر وید کا آخری حصہ 'اپنشد' ہے اس لیے 'ویدانت' اور 'اپنشد' ہم معنی ہیں۔ لغوی اعتبار سے اپنشد، کونوع الصادقین کے مترادف ہے اور اس میں عارفان حق کو اپنے شاگردوں اور ارادت مندوں کو سمجھائی ہوئی وہ تشریحات شامل ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں بھی وہی حقیقت جاری وساری ہے جو انسانی شخصیت کی بنیاد ہے اور اس حقیقت کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی فرض کی ہوئی شخصیت اور حیثیت کو بھول کر اس قدر وسیع النظر ہونا ضروری ہے کہ تنگی و کوتاہ نظری پاس بھی نہ پھٹکنے نہ پائے۔ منشی سورج نرائن مہر دہلوی کے لفظوں میں:

''لفظ 'اپ نشد' کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ اس کا مادہ یا دھاتو 'سد' ہے۔ اُپ بہ معنی قریب اور نی بہ معنی بالکل۔ دو اُپسرگ ہیں جنھیں انگریزی میں پری پوزیشن اور عربی فارسی، اردو میں حروف جار کا نام دیا جاتا ہے سد چار معنی میں مستعمل ہے۔ ہلاک کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا، چلنا، اور بیٹھنا۔ پہلے دو معنوں کے لحاظ سے اُپ نشد وہ بدیا (ودیا) یا علم ہے جس سے دنیا کا واہمہ باطل یعنی اگیان ناش ہو جاتا ہے یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں۔ دوسرے دو معنوں کے لحاظ سے اُپ نشد وہ گیان ہے جو گورو (گرو) کے پاس جا کر یا بیٹھ کر لیا جاتا ہے۔ اہل یورپ، سد کے معنی زیادہ تر بیٹھنے کے لیتے ہیں۔ کہتے ہیں

کہ زمانہ قدیم میں آچاریہ لوگ چیلوں کی جماعتوں کو بنوں میں بیٹھ کر تعلیم دیتے تھے۔ اس واسطے اس بدیا (ودیا) کو اُپ نشد کہنے لگے۔ مجازاً اُپ نشد کے معنی رازِ خفی کے لیے جاتے ہیں اور اس کا اطلاق برہم بدیا (ودیا) پر ہوتا ہے۔ چونکہ بعض کتابیں اسی برہم بدیا (ودیا) سے متعلق ہیں اس واسطے اول اول اس کا نام اُپ نشد پڑا اور بعد میں اُپ نشد کا اطلاق صرف انھی کتابوں پر ہونے لگا۔ وہ بدیا (ودیا) کا پہلا اطلاق جاتا رہا، اب اُپ نشد یہی کتابیں کہلاتی ہیں۔ ان میں سے دس بہت قدیم ہیں جن پر بھگوت پوجیہ پادشری شنکر آچاریہ نے شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں ایشاواسیہ سب سے پہلا اُپ نشد ہے۔''

(منشی سورج نرائن دہلوی، شری اپنشد، دہلی 1914، ص 1-2)

یہ حقیقت ویدوں کے تیسرے حصے میں ہی بیان کردی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں حقیقت مطلقہ کی ہی کارفرمائی ہے اور قربانی کے منتروں میں اسی کے ہونے کا اقرار و اظہار کیا جاتا ہے لیکن اپنشد میں ایک طرف حقیقت مطلقہ (برہمن بہ معنی برہمہ) کو اعلیٰ ترین حقیقت کے طور پر پیش کرکے اور دوسری طرف آرنیکا سے شروع ہونے والے باطنیت کے رجحان میں مزید غور و فکر سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر باہر ایک ہی لافانی ذات کی کارفرمائی ہے لیکن بقول سوامی وویکانند اس کا دیدار وہی کرسکتا ہے جو اپنی محدود شخصیت کو بھول کر ''سنسار کو بھرم مے یعنی بھرم (فریب حواس) سے بھرا ہوا'' دیکھے۔

(سوامی وویکانند، بھکتی اور ویدانت، لاہور، ص 74)

ابوریحان البیرونی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'الہند' کی پہلی جلد کے دوسرے باب میں خدا کی ذات و صفات سے متعلق ہندوؤں کے اعتقاد کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''اللہ پاک کی شان میں ہندوؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد ہے، ازلی ہے، جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ ہے، زندہ کرنے والا ہے، صاحب تدبیر ہے، باقی رکھنے والا ہے، اپنی بادشاہت میں یگانہ ہے جس کا کوئی مقابل اور مماثل نہیں۔ نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اس سے مشابہت رکھتی ہے۔..........'' (البیرونی مترجم سید اصغر علی، کتاب الہند جلد اول دہلی 1941، ص 29-24)

لیکن چونکہ البیرونی کے تجربے میں یہ حقیقت بھی تھی کہ مذہبی شاستروں میں خدا کے بارے میں جو عقیدہ بیان کیا گیا ہے، عوام میں رائج عقیدہ اس سے مختلف ہے اس لیے اس نے 'پاتنجلی'، 'گیتا' اور دوسری مذہبی کتابوں کے اقتباسات نقل کرنے کے بعد یہ رائے بھی دی ہے کہ:

''یہ ہے اللہ تعالیٰ کی نسبت ہندوؤں کے خواص کا قول۔ یہ لوگ اس کا نام ایشفر (ایشور) رکھتے ہیں، یعنی مستغنی اور جواد، جو دیتا ہے اور لیتا نہیں۔ اسی کی وحدت کو خالص وحدت سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے موجودات کے وجود کا سبب اور سہارا وہ ہے۔ یہ توہم کہ سب موجودات معدوم ہیں اور وہ موجود ہے، محال نہیں ہے اور یہ توہم کہ وہ موجود نہیں اور سب موجودات موجود ہیں محال ہے۔ جب ہم ہندوؤں کے خواص کے طبقے سے نکل کر عوام کی طرف آتے ہیں تو ان کے اقوال میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔'' (البیرونی، مترجم سید اصغر علی، کتاب الہند، جلد اوّل، دہلی 1941، ص 29-24)

سوامی جی عالم محویت یا جذب و مستی میں دریائے راوی کے کنارے 'بارہ دری کامران' میں بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی شری رام کی تلاش میں جن کے وہ بھگت تھے کنارے کنارے بہت دور نکل جاتے تھے۔ جیسے جیسے ان کی بھکتی یا عالم محویت کی شہرت بڑھتی گئی ان کے گرد عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ ایک مرتبہ وہ عقیدت مندوں اور شاگردوں کے ساتھ گنگا اشنان کے لیے ہری دوار گئے اور گنگا میں ہی سمادھی لگا دی یعنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

پچھے شعروں کی اس نظم میں اقبال نے سوامی رام تیرتھ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کئی ایسے نکات بیان کیے ہیں یا الفاظ استعمال کیے ہیں جن کو تصوف کی رہنمائی یا اس کی بعض اصطلاحات کو سمجھے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ مثلاً رنگ و بو، نفی، اثبات، بت، عشق وغیرہ۔

ذات و صفات و افعال و آثار کے ظہور کو 'رنگ' کہتے ہیں جو ہر آن اور ہر لحظہ نئی صورت میں جلوہ گر ہوتا یعنی نیا جلوہ دکھاتا رہتا ہے۔ 'راز رنگ و بو کھولا' سے مراد یہ ہے کہ موجودات یعنی حیات و کائنات کے راز سے پردہ اٹھایا۔ نفی اور اثبات تصوف کا بہت اہم مسئلہ ہے۔ اثبات سے 'احکام عبادت کا قائم رکھنا' اور نفی سے ''صفات مذمومہ کو نیست و نابود کرنا یا رذائل کو دور کرکے فضائل سے آراستہ ہونا'' مراد ہے۔ راقم نے نفی و اثبات اور ان کے فرق پر مختلف حوالوں سے اپنی کتاب ''تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات (ص 4-362)'' میں ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ہی شائع کی ہے۔

''حضرت مصنف 'کشف المحجوب' اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ نفی کے معنی نفسانی یعنی بری اور ناپسندیدہ عادات کو اپنے اندر سے دور کرنا بلکہ بالکل مٹا دینا ہے اور اثبات کے معنی حقیقت کو اپنے اوپر غالب و قاہر کرکے پسندیدہ عادات و خصائل کو پیدا کرنا بلکہ ثابت کردینا ہے۔ صفتِ بشریت کی فنا نفی اور غلبۂ حقیقت کا وجود اثبات ہے.....

صوفیا کا قول ہے کہ اسی نفی سے مراد، حق تعالیٰ کے اختیار کے اثبات میں، بندے کے اختیار کی نفی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ''...... بندے کے لیے حضرت حق کا اختیار اس کے اپنے علم سے بہتر ہے، جو بندے کو اپنے نفس کے لیے خدا سے غافل رہ کر اختیار ہو۔ اس لیے یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ محبت میں محبّ کے اختیار کی نفی محبوب کے اختیار کے اثبات سے وابستہ ہے۔''

راضی برضا اور تفویض کے سلسلے میں ایک واقعہ ہے کہ ایک درویش دریا میں غرق ہو رہا تھا۔ کسی نے اس سے کہا بھائی! کیا تجھے نکال لیا جائے؟ اس نے کہا نہیں۔ تو اس نے پوچھا پھر کیا چاہتا ہے کہ ڈوب جائے؟ درویش نے کہا نہیں۔ اس نے کہا عجیب بات ہے کہ نہ ہلاکت چاہتا ہے نہ نجات؟ درویش نے کہا مجھے ایسی نجات کی کوئی حاجت نہیں جس میں میرا اختیار شامل ہو۔ میرا اختیار تو وہ ہے جو میرے پروردگار کا اختیار ہے.....''

'بت' سے مطلوب حقیقی بھی مراد ہے اور انسان کامل بھی۔ 'عشق' اقبال کا بھی محبوب لفظ ہے اور صوفیا کا بھی۔ لفظ عشق کی تفہیم اقبال کے کلام سے بھی ہوجاتی ہے مثلاً

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق جو کاس الکرام

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

صوفیا کے اقوال اور تشریحات کے حوالے سے راقم الحروف نے عشق کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

''......عشق مشتق ہے عشقہ سے اور عشقہ اس گھانس کو کہتے ہیں جو درخت پر لپٹتی ہے اور درخت کو بے ثمر اور زرد و خشک کردیتی ہے اسی طرح عشق بھی عاشق کی ذات کو تجلی جمال معشوق میں محو کردیتا ہے تاکہ تفرقۂ عاشق و معشوق باقی نہ رہے۔ عشق انتہا ہے درجۂ محبت کا یہ خود بخود ہوتا ہے اختیار سے نہیں ہوتا۔ اس کے پانچ درجے ہیں۔ درجۂ اول فقدانِ دل یعنی دل کا گم کرنا۔ درجۂ دوم تاسف ہے وہ یہ ہے کہ معشوق کے بغیر عاشق بیدل ہر

وقت اپنی زندگی سے متاسف ہوتا رہے۔ درجۂ سوم وجود ہے اور یہ عجب قسم کا حال ہے جو تحریر و تقریر میں نہیں آسکتا اور اس کی وجہ سے عاشق کو کسی جگہ اور کسی وقت آرام اور قرار نصیب نہیں ہوتا۔ درجۂ چہارم بے صبری ہے اس درجے میں آتش شوق اس درجہ جوش میں آجاتی ہے کہ عاشق رات دن شور مچاتا رہتا ہے۔ درجۂ پنجم صیانت ہے۔ عاشق اس درجے میں پہنچ کر دیوانہ ہوجاتا ہے۔ بجز معشوق کے اس کو کسی کی یاد نہیں رہتی۔ عشق کی دو قسمیں ہیں مجازی و حقیقی۔ حقیقی خدا کا عشق ہے مجازی کی بھی دو قسمیں ہیں نفسانی و حیوانی۔ نفسانی باعث لطافت و صفائی نفس ہوتی ہے جس کی وجہ سے عاشق صاحب وجد اور صاحب فکر و گویا اور تعلقات دنیا سے منقطع ہوجاتا ہے۔ یہی مجاز ہے جو عمدہ ترین نعمت اور موہبت خداوندی ہے اور اس کی خاصیت ہے کہ یہ عاشق کو سوائے معشوق کے دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا اس میں درحقیقت عاشق کی توجہ معشوق حقیقی پر ہوتی ہے جو صورت میں آکر جلوہ نمائی کرتا ہے سلوک میں سوائے اس عشق کے دوسری چیز مطلوب پر فائز کرنے والی نہیں ہے۔'' (تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات، صفحہ 245-6)

مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں اقبال کی نظم کے شعروں کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو

اے قطرۂ بیتاب یعنی سوامی رام تیرتھ یعنی وہ جزو جو کل میں مل جانے کے لیے بیتاب تھا پہلے ہی گوہر تھا کہ قدرت نے تجھے ذاتی کمالات عطا کیے تھے اور تو اپنی اصل میں مل جانے کے لیے تپش عشق سے بیتاب ہوکر رذائل کو فضائل میں تبدیل کررہا تھا اور بالآخر دریا یعنی دریائے وحدت میں خود کو غرق کرکے 'گوہر نایاب' بن گیا یعنی تیری قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا۔ یہ تصوف کا بہت اہم مسئلہ ہے۔ صوفیا نے اشارہ کیا ہے کہ جب سالک کو عرفان حاصل ہوجاتا ہے تو اس کا ذاتی وجود باقی نہیں رہتا۔ مگر عشق میں اپنی ہستی کو فنا کرنے یا ذاتی وجود کو باقی نہ رکھنے کا کوئی مادی تصور نہیں ہے۔ اپنی ہستی کو فنا کرنے کی کسی ایسی صورت کو نفی ہستی نہیں کہا جاسکتا جس پر خودکشی کا گمان ہوتا ہو۔

آہ کھولا کس ادا سے تونے راز رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو

دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ تو نے کس شان سے راز رنگ و بو یعنی کائنات کے اسرار سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ جب ساری کائنات اس ایک ذات کے گوناگوں تعینات کا پرتو ہے تو یہاں کی مختلف اشیا میں فرق کیوں کیا جائے۔ تو نے واضح کردیا کہ عالم کثرت میں وحدت کا راز پوشیدہ ہے۔ مگر افسوس میں اپنی کوتاہ بینی اور ناقص عقل کے سبب عالم کثرت کی مختلف اشیا کے درمیان فرق کرتا رہا ہوں۔

مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آزر بنا

'غوغا زندگی کا' سے مراد زندگی کی سرگرمیاں ہیں اور 'آتش خانۂ آزر' سے مراد نمرود کا آتش کدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان جب اپنی اس ہستی کو فنا کردیتا ہے جس کو دیکھا جاسکتا ہے، چھوا جاسکتا ہے تو اس میں اور زیادہ طاقت پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ وہ واصل بحق ہوجاتا ہے۔ اس کی مثال اس قطرے کی ہے جو سمندر یعنی بحر ناپیدا کنار میں مل کر خود بھی بحر ناپیدا کنار بن جاتا ہے۔

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

اپنی ہستی یا ظاہری وجود کی نفی وہی کرسکتا ہے جو 'دل آگاہ' کا مالک یعنی اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے والا ہو کہ مالک و خالق اسی کو ملتا ہے جو اس کے علاوہ ہر حقیقت کی نفی کرچکا ہو۔ نفی و اثبات کی طرح فنا و بقا بھی تصوف کا بہت اہم مسئلہ ہے۔ راقم نے ''تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات (صفحہ 267-8)'' میں اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ بقا سے مراد وہ مقام ہے جہاں دیدار الٰہی میں کوئی چیز حجاب نہیں بنتی اور سالک حق کو موجود، باقی سارے عالم کو معدوم دیکھتا ہے۔ اسی طرح

''فنا سے وہ حالت مراد ہے جس میں سالک سے قولاً یا فعلاً یا عملاً جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ حق سے ہوتا ہے اور اسی مرتبے پر پہنچ کر بایزید بسطامی نے سبحانی اور منصور نے انا الحق کہا تھا۔

امام قشیریؒ کے مطابق ''صوفیا کے یہاں 'فنا' سے مذموم اوصاف کا ساقط ہوجانا مراد ہے اور 'بقا' سے اوصاف محمودہ کا بندہ کے ساتھ قائم ہونا۔'' (رسالہ قشیریہ)

امام ربانی مجدد الف ثانی نے لکھا ہے'' جو علوم کہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ سے تعلق رکھتے ہیں، حق تعالی نے اپنی عنایت سے وہ ظاہر فرمادیے ہیں اور اسی طرح خادم نے معلوم کرلیا ہے کہ ہر چیز کی وجہ خالص کیا ہے اور سیر فی اللہ کے کیا معنی ہیں اور تجلی ذاتی برقی کیا ہوتی ہے اور محمدی مشرب کون ہے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔''

(مکتوبات مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب 12)

امام ربانی نے اپنے ایک روحانی تجربے کے بارے میں بھی اپنے مرشد برحق کو لکھا ہے کہ'' جب سے اس خاکسار کو صحو میں لائے ہیں اور بقا عطا فرمائی ہے، عجیب و غریب علوم و معارف جو پہلے متعارف نہیں تھے، پے در پے و مسلسل وارد ہو رہے ہیں، ان میں سے اکثر قوم یعنی صوفیا کرام کے قول اور ان کی مروجہ و مستعمل اصطلاح کے ساتھ موافقت نہیں رکھتے۔ مسئلہ وحدت الوجود اور اس کے متعلقات کی نسبت جو کچھ ان حضرات نے بیان کیا ہے اس خاکسار کو اس حال سے ابتدا میں ہی مشرف کردیا گیا اور کثرت میں وحدت کا مشاہدہ حاصل ہوا۔ پھر اس مقام سے کئی درجے اوپر لے گئے اور اس ضمن میں کئی قسم کے علوم کا افادہ نصیب ہوا۔''

(مکتوبات مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب 8)''

چشم نابینا سے مخفی معنی انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

'چشم نابینا' سے مراد وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر وقت عشق الٰہی کی آگ میں جلتا رہے۔ اگر انسان عشق الٰہی کی آگ یا تپش یا تڑپ سے محروم رہے گا تو پھر انسان کیسا۔ سیماب تڑپ سے محروم ہوکر سیم خام رہ جاتا ہے۔ یہی حال روح کا ہے جو عشق سے محروم ہوکر عشق کہلانے کی مستحق نہیں رہ جاتی۔

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

عشق کی حیثیت حضرت ابراہیم جیسی ہے جو بت شکن واقع ہوئے تھے۔ اس لیے وہ 'بت ہستی' یعنی ظاہری وجود کو مرضی الٰہی کے تابع کردیتا ہے۔ راقم الحروف نے لکھا ہے:

'' **فنا فی اللہ**: سالک کا اپنی خودی کو حق میں نیست و نابود اور فنا کردینا مراد ہے چاہے یہ کیفیت ذکر و شغل کے سبب پیدا ہو یا من جانب اللہ۔ فنا فی الرسول: کہتے ہیں کہ سالک اپنے آپ کو وجود رسول میں فانی کردے اور اپنے وجود کو رسول کی صورت پر جانے۔ صوفیا نے بھی لکھا ہے کہ اس حال میں سنت کا اتباع عادتاً ہونے لگتا ہے۔''

(تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات، ص 268)

اقبال جس تصوف کو مانتے تھے اور سوامی جی جس بھکتی کے قائل تھے اس میں اتحاد فکر کے ساتھ یہ اختلاف پوشیدہ ہے کہ اقبال کے نزدیک نفی ہستی کا مفہوم دنیا میں رہتے ہوئے خود کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کرنا تھا اور سوامی جی کے نزدیک ''پران تیاگ دینا''

■

Shamim Tariq
Flat 27 4th Floor,
Marzban mantion,
Byculla Fruit Market, Mumbai-40002

تاجور نجیب آبادی کی اقبال شناسی

ابرار اجراوی

شمس العلما احسان اللہ خاں علامہ تاجور نجیب آبادی (1894-1951) کی شخصیت مختلف الجہات تھی۔ جہان علم و ادب میں وہ مثلِ آفتاب تھے۔ وہ ناقد و ادیب اور شاعر و صحافی تھے، اردو پرست اور رجال ساز شخص تھے، تادم مرگ فروغ اردو تحریک سے وابستہ رہے اور معشوقۂ اردو کی منتشر زلفوں کو آراستہ کرتے رہے۔ اتفاق یہ کہ وہ کسی عصری ادارے یا جامعہ کے سند یافتہ نہیں، مشرقی نوعیت کے قدیم مدرسے دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ انھوں نے دار العلوم کی چھاؤں میں ایک لمبا عرصہ گزارا، دس سال کی عمر میں دیوبند میں فروکش ہوئے اور دس برس تک اس منبع علم وفن سے کسب فیض کیا۔ معاشی طور پر کمزور گھرانے سے تعلق تھا، بد قسمتی سے بچپن میں ہی یتیمی کا جاں گسل درد بھی جھیلنا پڑا تھا۔ چنانچہ فراغت کے بعد جب قوت لا یموت کا مسئلہ در پیش ہوا، تو منشی فاضل کا امتحان پاس کرکے پہلے دیال سنگھ اسکول لاہور میں استاد مقرر ہوئے اور پھر ترقی کرکے دیال سنگھ کالج کے شعبۂ فارسی میں لکچر شپ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

اردو زبان سے تاجور کا تعلق رسمی نہیں، جنون کی حد تک تھا، پنجاب اور ملک میں اردو زبان کی تشہیر و توسیع کا جذبہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، وہ اطراف ملک میں اردوزبان کی نشر و اشاعت کو مذہبی فریضہ یقین کرتے تھے اور اس راہ میں سب کچھ قربان کردینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔انہوں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی۔وہ ایک بے پروا، آزاد منش اور قلندر صفت شخص تھے۔

وہ روایتی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے اور قدامت پسند علما کے دامن تعلیم وتربیت سے وابستہ رہے تھے، مگر ان کا علم ومطالعہ مذہبیات و اسلامیات اور روایتی عربی فارسی علوم وفنون تک محدود نہ تھا، ان کا جہان پرواز بہت وسیع وعریض تھا، وہ خداداد تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت کے حامل تھے اور اردو ادبیات وشعریات کی کنہیات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ کلاسیکی شعر و ادب، قدیم متون، اردو زبان کی قدیم وجدید تاریخ اور ادبی مباحث ومسائل پر ان کی نظر گہری تھی۔ عربی فارسی کے ساتھ، علم بلاغت اور علم عروض پر انھیں زبردست گرفت حاصل تھی، اسی لیے کسی کی پیروی یا سفارش کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اپنی قابلیت اور استعداد کے بل پر ہی دیال سنگھ کالج لاہور جیسے ملک گیر شہرت کے حامل حکومتی تعلیمی ادارے میں استاد مقرر ہوئے اور درس وتدریس کی راہ سے اردو کی کئی نسلوں کو فیض یاب کیا۔ انھیں زبان وبیان کے نکات سکھائے اور ان کو شعر ونثر کی باریکیاں ازبر کرائیں۔

اردو زبان سے تاجور کا تعلق رسمی نہیں، جنون کی حد تک تھا، پنجاب اور ملک میں اردو زبان کی تشہیر وتوسیع کا جذبہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، وہ اطراف ملک میں اردو زبان کی نشر و اشاعت کو مذہبی فریضہ یقین کرتے تھے اور اس راہ میں سب کچھ قربان کردینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کی۔ وہ ایک بے پروا، آزاد منش اور قلندر صفت شخص تھے۔ انھوں نے اردو کو مال و دولت کی تحصیل کا وسیلہ کبھی نہیں بنایا، بلکہ حسینۂ اردو کے قدموں میں اپنی ساری جمع پونجی یہاں تک کہ گھر کی خواتین کے بیش بہا زیورات تک نذر کردیے۔

علامہ تاجور نے اپنے نام ونسب، جائے پیدائش اور تعلیمی وتربیتی مراحل کے بارے میں خود کہا تھا:

’’میں نسباً درانی افغانی ہوں، اپنے وطن نجیب آباد میں فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنے برادر معظم سے حاصل کی، ماہ صفر 1326ھ میں دس سال کی عمر میں دار العلوم دیوبند کا طالب علم بنا۔ دس سال وہاں رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کرکے اگست 1914 میں لاہور آیا اور حسب ایما حضرت شمس العلماء مفتی عبد اللہ ٹونکی اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے 1915 میں مولوی فاضل اور 1916 میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ 1916 ہی میں رسالہ مخزن کا ایڈیٹر بنا۔ 1921 میں دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا، اسی سال رسالہ ہمایوں لاہور میں مدیر معاون بنایا گیا۔ 1929 میں رسالہ ادبی دنیا اور 1934 میں رسالہ شاہکار جاری کیا۔ ادبی دنیا میری انتظامی نا قابلیت اور زود اعتمادی کے سبب میرے ہاتھوں سے منتقل ہوکر دوسرے

ہاتھوں میں پہنچ گیا اور شاہکار اب تک میری نگرانی میں جاری رہا۔ میں [نے] سارا عہد طالب علمی امتیازی شہرت میں بسر کیا تھا مگر غالباً کسی گناہ کبیرہ کی پاداش کے طور پر قدرت نے مجھے اردو کے جنون خدمت میں مبتلا کر دیا۔ اردو زبان و ادب کی راہ میں اپنا ذاتی سرمایہ تیس ہزار روپے کاروباری آمدنی کا، اپنی جوانی، صحت و طاقت اور متعلقین کا حال و مستقبل سب کچھ نثار کر دیا۔''

(مضمون شمس العلماء تاجور کی کہانی تاجور کی زبانی، مشمولہ شمس العلماء، محمد حنیف شاہد، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، مارچ 2006، ص 68)

وہ شاعری میں رسا رام پوری کے شاگرد تھے۔ وہ تعمیری افادی ادب کے پیرو تھے اور ادب برائے زندگی کے فلسفہ پر یقین رکھتے تھے، انھیں شعر گوئی کا ملکۂ راسخ حاصل تھا، زبان کی نوک پلک پر عبور حاصل تھا، الفاظ کے در و بست پر تنقیدی نگاہ رکھتے تھے، اردو الفاظ کے صحیح تلفظ کی دوسروں کو تاکید کرتے اور اس پر خود بھی سختی سے کاربند رہتے تھے، اپنے رسالہ میں تصحیح الفاظ کے لیے ایک صفحہ بھی خاص کر رکھا تھا، جس میں وہ اردو میں رائج غلط الفاظ و تراکیب کا نوٹس لیتے تھے اور اس کا صحیح و فصیح متبادل پیش کرتے تھے۔ تاجور نے زبان و ادب کی عصری صورت حال کی عکاسی کے ساتھ اپنے زیر ادارت رسالوں میں شاعری کی تنقید بھی لکھی، نثری مضامین کے علاوہ بہت سی عمدہ نظمیں بھی ان کے قلم سے نکلیں۔ مگر افسوس کہ نام و نمود سے بیزار اور آزاد رو شخص تھے، اس لیے اپنے کلام اور نثری سرمایے کی حفاظت نہ کر سکے۔ اشعار کا کچھ حصہ تو اپنے شاگردوں کی ہونہاری کی پرورش و پرداخت کی نذر کر دیا اور بیش تر حصہ افسران وقت کے تخلص کی نذر ہو گیا۔ ان کے کلام کے کچھ نمونے رسائل و جرائد میں منتشر ہیں، مگر کون ہے جو ان کے سرمایۂ ادب کی تلاش و جستجو اور تدوین نو کی فکر کرے اور اس لازوال ادبی سرمایے کو منظر عام پر لانے کا جتن کرے۔ شورش کاشمیری علامہ تاجور کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی اردو نوازی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ بیسیوں شاعروں کو پروان چڑھایا اور دسیوں ادیبوں کو لکھنا سکھایا۔ قلم میں زور تھا۔ زبان میں نفاست۔ زندگی بھر شعر کہتے رہے۔ لیکن کلام کا بہت سا حصہ تقسیم ہو گیا۔ کچھ خواتین لے گئیں۔ کچھ شاگردوں نے اڑنچھو کر لیا۔ کچھ آئی سی ایس افسروں کی نذر ہو گیا۔''

(چہرے، ص 237، مکتبہ ماحول کراچی، 1965)

لاہور میں علامہ تاجور کا قیام تاحیات رہا، وہاں ان کے معتقدین اور پرستاروں کا ایک بڑا حلقہ آباد تھا، مگر ان کے مخالفین کا گروہ بھی بہت سرگرم رہا، علامہ خود اپنی ذات میں ایک تحریک، ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ انھوں نے انجمن ارباب علم کے نام سے 1918 میں ایک حلقہ بھی قائم کیا، مولانا کے پاس وسائل کم تھے اور زمانہ سازی کا ہنر بھی ذرا کم آتا تھا، اس لیے دوسرا ادبی حلقہ یعنی نیاز مندان لاہور بوجوہ ان پر حاوی رہا، دوسرے ادیب اور شاعر سر پر پیر رکھ کر لاہور سے بھاگ نکلے، مگر تاجور نے ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا، کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کی کہ وہ گرچہ ظاہری اسباب و وسائل سے کسی قدر محروم تھے، دولت و حشمت کی طاقت ان کے پاس نہ تھی، مگر علم و قلم کی دولت سے انھیں وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ لاہور کے ادبی حلقوں کا ذکر کرتے ہوئے شورش کاشمیری اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''دوسرا حلقہ علامہ تاجور نجیب آبادی کا تھا، علامہ زبان کے یگانہ استاد تھے اور صاحب طرز، ان کے حلقے میں بظاہر نامور لوگ نہیں تھے لیکن ان کے قلم میں نیاز مندان لاہور کی بہ نسبت جان زیادہ تھی۔ انھیں ابھرنے کا موقع نہ ملا۔ کیونکہ ان کے پاس وسائل کم تھے، اور وہ اکٹھے ہو کر بھی نیاز مندان لاہور کی تاب نہ لا سکتے تھے، اس حلقہ میں وقار انبالوی، فاخر لدھیانوی، روش صدیقی، اختر شیرانی، احسان دانش وغیرہم شریک تھے لیکن علامہ تاجور فی نفسہٖ چومکھی لڑنے میں طاق تھے۔ ادبی دنیا اور شاہکار میں انہوں نے اپنا لوہا منوالیا تھا۔''

(بوئے گل نالۂ دل، دود چراغ محفل، ص: 64-63، چٹان پرنٹنگ پریس لاہور، 1972)

تاجور کو شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال سے بھی بڑی گہری عقیدت تھی۔ اتفاق سے دونوں ایک ہی شہر لاہور میں فروکش بھی تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ادبی کارناموں کے معترف اور مداح بھی تھے۔ گرچہ اقبال تاجور سے عمر میں کچھ بڑے تھے، تاجور کو اقبال کے مقابلے میں حیات مستعار کا حصہ بھی کچھ زیادہ میسر ہوا، مگر بے شک و شبہ دونوں ہم عصر ہی نہیں ہم شہر بھی تھے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے قدرداں تھے۔ ان دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک نہ تھی۔ علامہ تاجور نجیب آبادی عزت و شہرت کے معاملے میں کسی طرح کم بھی نہیں تھے، دیال سنگھ کالج کے پروفیسر اور وہ اپنے عہد کے مشہور سخن گو تھے، غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ ان کا ارادت مند تھا اور مشاعروں کے مشہور شاعر بھی تھے، مگر وہ علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی فکر و فلسفہ کے دل سے قائل تھے۔ یہ معاملہ یک طرفہ نہ تھا، علامہ اقبال بھی تاجور کی تحریکی شخصیت اور پنجاب و لاہور میں ان کے علمی و ادبی کارناموں کے ثناخواں تھے۔

تاجور اور علامہ اقبال کے درمیان مراسم بہت استوار تھے، دونوں ایک دوسرے سے ربط ضبط رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کی ادبی تخلیقی سرگرمیوں سے آگاہ رہتے تھے اور ایک دوسرے کی تعریف اور حوصلہ افزائی میں عصبیت یا ذاتیات کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ علامہ اقبال کے نام تاجور کا کوئی مکتوب اب تک مجھے دست یاب نہ ہو سکا، مگر علامہ اقبال نے تاجور نجیب آبادی کے نام خط تحریر کیا ہے۔ تاجور کے ہفت روزہ باتصویر اخبار 'پریم' کی تعریف پر مبنی ایک خط علامہ اقبال نے روانہ کیا اور اس میں رسالہ ہٰذا کی خریداری کی ترغیب و تشویق ان سطروں میں یوں کی:

''بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس کے جاری کرنے سے فاضل ایڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو اور مسلم بچوں کے دلوں میں ابتدائے عمر سے باہمی اتحاد اور الفت کا بیج بو دیا جائے۔ کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ مقصد نہایت قابل عزت ہے۔ مولانا تاجور زبان اردو کے مشہور ادیب اور ناقد ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائیں گے ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعلیٰ معیار کے ہوں گے۔''

''بچوں کے لیے عمدہ نظمیں ہیں۔ سرورق دیدہ زیب۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ اور باوجود ان اوصاف کے چندہ چھ روپے سالانہ ہے۔ میری رائے میں اسکول کے ہر طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔''

(ادبی دنیا، لاہور، جولائی، 1929)

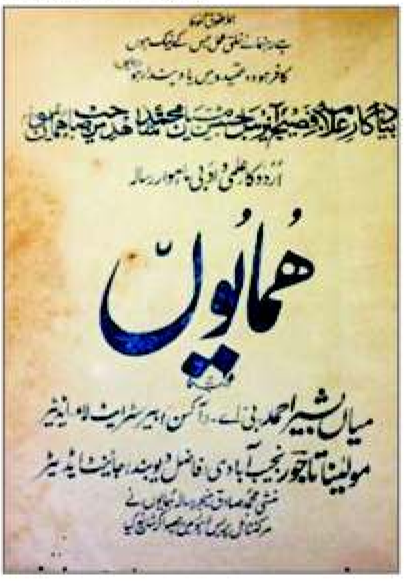

تاجور نے ہر طرح اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے گوشوں کو سینچنے اور سنوارنے اور اس کو چہار دانگ ادب میں متعارف کرانے کی کوشش کی۔ حالاں کہ اس وقت علامہ اقبال کی شہرت کا ستارہ بلندی پر تھا اور وہ سرحدوں کی خلیج کو بھی پھلانگ چکے تھے، بیرون ملک ان کے شاعرانہ افکار کی گونج سنائی دیتی تھی، مگر اقبال شناسی کے فروغ کے سلسلے میں تاجور نے جو جی توڑ، بے غرض اور بے لوث جد و جہد کی ہے، اس کو کسی بھی قیمت پر درکنار نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال شناسوں کی فہرست میں تاجور کا نام بھی مندرج ہونا چاہیے۔ ادبی تاریخ نویسوں کو عصبیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ دوسروں نے تو پکی پکائی روٹی کھائی ہے اور دوسروں کے اگلے ہوئے نوالوں کو چبایا ہے، مگر انھوں نے فکر اقبال کے تعارف اور اس کی ترویج و تشہیر میں بنیادی اور اساسی درجے کا کام کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف نجی طور پر، بلکہ اپنے رسالوں: ادبی دنیا، مخزن اور ہمایوں وغیرہ میں مضامین اور تنقیدی مقالات شائع کر کے اقبال کے فکر و فن کے نئے آفاق سے متعارف کرایا اور ادبی دنیا کو ان کے مقام و مرتبے کے اعتراف کی طرف توجہ دلائی۔

تاجور نجیب آبادی نے ناشرین کی مشہور فرم عطر چند کپور تاجران کتب لاہور سے رابطہ کر کے اردو مرکز لاہور کی بنیاد رکھی، اور اس کے پلیٹ فارم سے علمی و ادبی تصنیفات و تالیفات شائع کیں۔ یہ بات آج سے لگ بھگ سو سال قبل یعنی اگست 1925 کی ہے۔ یہ اردو مرکز کوئی معمولی انجمن نہیں، ملک کی پہلی اردو اکیڈمی تھی، اس سے جتنے شعری و ادبی انتخابات تاجور نے شائع کیے، ان تمام میں علامہ اقبال کی تخلیقات کو تلاش کر کیا نھیں ترجیحی طور پر شامل کیا گیا۔ اور جس انتخاب میں ضرورت پڑی، اقبال کی شاعری اور ان کے فکر و فن پر تاجور نے مدلل کلام بھی کیا۔ اردو مرکز ایک اہم ادبی ادارہ تھا، جس کا بنیادی مقصد اردو زبان کا فروغ تھا اور اردو زبان و ادب کے منتخبات کی اشاعت اور ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر اس کے اہداف میں شامل تھی۔ اس کے زیر اہتمام جتنے شعری و نثری منتخبات شائع ہوئے، ان تمام کی ابتدا میں اکادمی کے اغراض و مقاصد، اس کے معاونین اور مجلس مشاورت وغیرہ کی تفاصیل پر مبنی علامہ تاجور کی جو طویل تحریر شامل ہے، وہ اس ادارے سے شائع ہونے والی تقریباً تمام کتابوں میں حرف آغاز کے طور پر شامل ہے، اس ابتدائیہ میں اردو کی کم مائیگی اور بے مائیگی کا مرثیہ پڑھنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ آج کل اردو کی کمتری کا مرثیہ پڑھنا کسی دردمندی یا ہمدردی کا اظہار نہیں، بلکہ یہ زمانے کا ایک فیشن بن گیا ہے۔ تاجور نے اردو ادب کے فضائل و فوائد شمار کراتے ہوئے دوسرے قدیم و جدید شعرا و ادبا کے ساتھ علامہ اقبال کا نام بھی لکھا ہے:

''یہ صحیح ہے کہ اردو ادبیات کا دامن رطب و یابس کے بدنما داغوں سے کلیتاً پاک نہیں۔ لیکن یہ عیب دنیا کی ان ترقی یافتہ زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے، جو فی زمانہ علمی زبانیں کہلاتی ہیں۔ اگر اردو میں پست و پامال لٹریچر کی اشاعت بڑی کثرت و سرعت سے ہو رہی ہے، تو انگریزی میں بھی چار آنے کے لکھنے والے مصنفین کی تعداد کسی طرح کم نہیں رہی۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ان کی تصانیف بلا استثنا مبتذل اور سوقیانہ انداز کی ہوتی ہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں انگریزی لٹریچر کی فضیلت کے ثبوت میں ملٹن، شیکسپیئر، ورڈسورتھ، جانسن، میکالے اور رائڈر ہیگرڈ وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ وہاں اردو ادبیات کی محفل بھی میر و غالب، انیس اور دبیر، حسن اور نسیم، داغ اور حالی، آزاد اور نذیر احمد، سرشار اور شرر، سرسید اور شبلی، اکبر اور اقبال جیسی بلند شخصیتوں سے خالی نہیں۔''

تاجور نے اردو ادب کے جاں فروز مرثیوں کا جو انتخاب 'مدائح و مراثی' کے نام سے، اسی مرکز کے زیر اہتمام شائع کیا، اس میں نادرۂ روزگار شعرا کی ایک دو تخلیقات کو ہی جگہ ملی ہے، جب کہ علامہ اقبال کی اس حصہ میں ۱۱ نظمیں شامل ہیں۔ شہدائے طرابلس، مرزا غالب، بلالؓ، بلالؓ، داغ، سوامی رام تیرتھ، فاطمہ بنت عبداللہ، شبلی و حالی، والدہ مرحومہ کی یاد میں، گرونانک، شکسپیئر اور ہمایوں۔

اردو شاعری کا انتخاب اور اردو شعرا پر تبصرے کے تشریحی عنوان سے نظموں کا جو انتخاب بعنوان 'روح نظم' جلد اول (مرتبہ: علامہ تاجور اور پنڈت میلا رام وفا، ناشر: شمشیر سنگھ اینڈ پبلشرز لاہور) شائع ہوا، اس میں بھی دوسرے شعرائے اردو کی مثنوی و مراثی اور غزلوں، نظموں کے شانہ بشانہ علامہ اقبال کی اس صنف سے متعلق منتخب شعری تخلیقات کو اہتمام کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں یہ اہتمام بھی موجود ہے کہ ہر صنف کے آغاز سے پہلے اس کا تاریخی ادوار پر مشتمل تعارف اور پھر اس پر غیر جانب دار تنقیدی تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ حصہ نظم میں علامہ اقبال کی یہ تین نظمیں موجود ہیں۔ شعاع آفتاب، عرفی، چاند۔ علامہ اقبال نظموں کے کامیاب شاعر تھے، ان کا رنگ شاعری اسی صنف میں زیادہ کھلتا تھا، علامہ کا یہ طرز شاعری اس زمانے میں بھی مستحکم ہو چکا تھا، مگر تاجور نے ہمت و حوصلہ سے کام لیا اور حصۂ غزلیات میں علامہ اقبال کی بھی ایک غزل 'چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں'

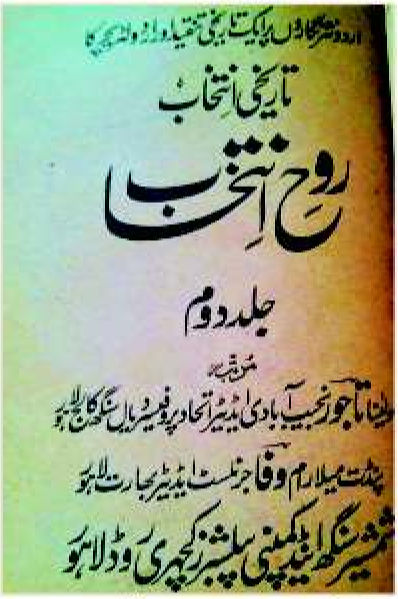

شامل کر رکھی ہے۔ اس حصہ میں جدید نظم کے حوالے سے اقبال کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا تاجور نے لکھا ہے:

''یوپی میں لسان العصر اکبر الہ آبادی اور پنجاب میں ترجمان حقیقت علامہ سر اقبال کی نوا طرازیوں نے اس زمین کے قلابے آسمان سے ملا دیے۔''

(روح نظم، ج:۱، ص:74، شمشیر سنگھ اینڈ پبلشرز لاہور)

اسی انتخاب (روح نظم) میں غزل والے باب کے آغاز سے پہلے صنف غزل کا لغوی و اصطلاحی تعارف اور اس کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کے بارے میں یہ مبالغہ آمیز سطریں بھی تاجور نے لکھیں:

''سر اقبال نے اس صنف کی جانب کم توجہ کی، مگر جو دو چار غزلیں کہیں وہ اردو کی معیاری غزلیں کہی جاسکتی ہیں۔'' (روح نظم، ج 1، ص 140)

روح نظم جلد دوم (مرتب: تاجور نجیب آبادی اور پنڈت میلا رام وفا) بھی اسی اردو مرکز سے شائع ہوئی، اس میں بھی علامہ اقبال کو کہیں فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل تین نظمیں شامل ہیں۔ گورستان شاہی، صبح کا استعارہ اور محبت۔

'تصویر مناظر' کے عنوان سے قدرتی اور فطری مناظر پر مبنی نظموں کا ایک انتخاب علامہ تاجور نے تیار کیا، اس کی بھی کئی جلدیں اقبال کے کلام سے مزین ہیں۔ جلد اول میں سب سے زیادہ صفحات علامہ اقبال کی نظموں کے لیے ہی مختص کیے گئے ہیں۔ صحرا نوردی، جگنو، ماہ نو، نمود صبح، گھٹا، چاندنی رات، کنار راوی، صبح، خاموشی، صبح، حسن؛ یہ ساری نظمیں خانہ پری کے مقصد سے یا از راہ عقیدت و محبت نہیں، بڑے اہتمام سے اس انتخاب کی زینت بنی ہیں۔ اس کتاب کی تمہید میں نیچرل شاعری

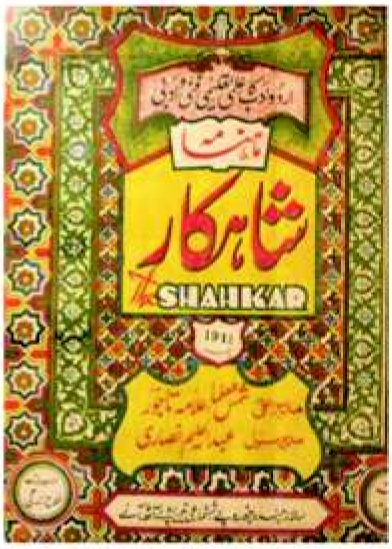

یعنی فطری مناظر پر مبنی نظم نگاری اور اس خاص طرز شاعری کے محرکین و مبلغین سے بحث کرتے ہوئے تاجور نے خاص طور پر علامہ اقبال کا ذکر کیا ہے اور انھیں پنجاب میں اس رنگ شاعری کا گویا امام کہا ہے:

''پنجاب میں اس رنگ کو ترقی دینے والوں میں اقبال کا نام سب سے نمایاں درجہ رکھتا ہے۔ آپ کے کلام سے نیچر کی نہایت بیش بہا مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ آپ کے کلام کا بیشتر حصہ مذہب اور فلسفہ کے مضامین سے لبریز ہے۔ مگر نیچرل پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ آپ کے کلام کے ننانویں فیصد اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔''

(تصویر مناظر، ج 1، مرتب: تاجور نجیب آبادی، پروفیسر دیال سنگھ کالج، ص 3، اردو مرکز لاہور)

'تصویر مناظر' جلد دوم میں بھی علامہ اقبال کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ اس میں اقبال کی جو نظمیں شامل ہیں، وہ بالترتیب یہ ہیں۔ کوہستان ہمالہ، گل رنگیں، ابر کہسار، آفتاب، آفتاب صبح، گل پژمردہ، موج دریا، چاند۔

اردو مرکز لاہور سے ہی ایک اور منتخب نظموں کا مجموعہ بعنوان 'روحانیات' ج: اول (گراں مایہ مذہبی نظموں کا انتخاب) شائع ہوا، جس میں سب سے زیادہ علامہ اقبال کی نظموں کو نمایاں طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ترلقمہ، شمع و شاعر، طلوع اسلام، شکوہ جواب شکوہ، تحفۂ امت، فاطمہ، بلاد اسلامیہ، ترانہ مسلم، ہلال عید، ایک حاجی مدینہ کی راہ میں، شفاخانہ حجاز، ایثار صدیق، خطاب بہ مسلم، جزیرہ سسلی۔

'تصویر جذبات' کے عنوان سے بھی کئی ضخیم جلدیں مرتب کی گئیں۔ اس میں اردو کی بیش قیمت جذباتی نظموں کا انتخاب شامل کیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس مجموعۂ نظم میں بھی علامہ اقبال کی نظموں کا تناسب کمیت کے اعتبار سے دوسرے تمام شعرا پر فائق ہے۔ تصویر درد، گورستان شاہی، ایک آرزو، بچہ اور شمع، محبت، حقیقت حسن، رخصت اے بزم جہاں، چاند، اختر صبح، انسان، تنہائی، ستارہ، شمع اور شاعر، یہ ساری نظمیں شامل ہیں۔

ابتدا میں جدید نظم سے بحث کرتے ہوئے تاجور نے رسالہ مخزن کو اس قسم کی نظموں کے آغاز و فروغ کا نقش اولیں قرار دیا ہے، اس رسالے کا بیسویں صدی کے پہلے سال 1901 میں اجرا ہوا تھا۔ تاجور نے اس کو جدید نظموں کے دوسرے دور کا سالار قافلہ قرار دیا ہے، جس میں علامہ اقبال ماہ بہ ماہ اپنی عمدہ نظمیں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، نہ صرف علامہ اقبال کی سب سے پہلی نظم، بلکہ ان کا سب سے پہلا نثری مضمون (بچوں کی تعلیم و تربیت) بھی اسی رسالہ کے جنوری 1902 کے شمارے کی زینت بنا۔ لکھتے ہیں:

''مخزن کے لیے یہ فخر کچھ کم گرانقدر [گراں قدر] نہیں ہے کہ علامہ اقبال جیسے یکتائے روزگار شاعر اور مولانا ابوالکلام دہلوی [مولانا ابوالکلام آزاد] جیسے بے پناہ انشا پرداز پہلے پہل مخزن ہی کے ذریعے روشناس خلق ہوئے۔ علامہ اقبال کی سب سے پہلی نظم اور مولانا ابوالکلام کا سب سے پہلا مضمون مخزن ہی کے صفحات میں ذوق افروز اہل نظر ہوا۔ جدید شاعری کے اس دور نے اکبر و اقبال کو پیدا کر کے ایک مدت مدید کے لیے اردو کے مستقبل کو بے فروغ کر دیا۔''

(تصویر جذبات، ج 1، ص 5، مرتب تاجور نجیب آبادی، اردو مرکز لاہور)

اس کے معا بعد جدید نظموں کے دور دوم کی سلسلہ وار خصوصیات شمار کی گئی ہیں، نمبر 7 پر اقبال کے طرز و اسلوب شاعری کے حوالے سے تاجور لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے مرزا غالب کی طرز نگارش کو زندہ کر کے اسے قبولیت عامہ کا شرف بخشا۔'' (ایضا، ص 6)

اور اگلے صفحہ پر ذرا مبالغے سے کام لیا ہے اور جوش نے عقیدت میں یہاں تک لکھا ہے کہ اردو کے صاحب طرز سحر نگاروں میں سب سے پہلا نام علامہ اقبال کا ہے۔ (ایضا، ص 7)

اسی سلسلے کی دوسری جلد یعنی 'تصویر جذبات' ج 2، میں اقبال بحیثیت شاعر موجود ہیں اور اس حصہ میں علامہ اقبال کی درج ذیل نظمیں شامل ہیں۔ صبح کا ستارہ، کلی، فراق، پھول کا تحفہ عطا ہونے پر، چاند، پھولوں کی شہزادی۔

تاجور نے اپنے ذہن و قلم کی مدد سے علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی تبلیغ و ترسیل ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ ان کے رنگ سخن کی پیروی کی بھی کوشش کی ہے۔ اور خود استاد شاعر ہوتے ہوئے ان کے طرز و رنگ میں نظمیہ شاعری کی ہے۔ مجموعۂ نظم (تصویر مناظر ج: 1) میں علامہ تاجور کی بھی قدرتی فطری مناظر پر مشتمل ایک خوب صورت نظم 'کوہسار شملہ' شامل ہے، جس میں علامہ اقبال کی مشہور نظم 'ہمالہ' کا طرز تخاطب اختیار کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ علامہ کی یہ مشہور نظم مخزن میں کوہستان ہمالہ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، مگر بانگ درا میں یہ صرف ہمالہ کے نام سے شامل ہے۔ نظم کے مرکزی عنوان ہی نہیں، الفاظ و مرکبات کی ساخت میں بھی کوہسار شملہ میں علامہ اقبال کی اس نظم سے روشنی لی گئی ہے۔ روحانیات پہلی جلد میں بھی ص 92 پر تاجور کی دو نظمیں 'دعا' اور 'ہلال عید' شامل ہیں۔ جس پر علامہ اقبال کے طرز و اسلوب شاعری کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے۔

تاجور نجیب آبادی عنوان سازی میں بھی علامہ اقبال کے مشہور زمانہ اشعار یا مصرعوں کو ترجیح دیتے تھے، حالاں کہ میر و سودا اور ذوق و غالب کے ضرب المثل اشعار سے بھی وہ استفادہ کر سکتے تھے، جو ان کے مدعا و منشا کے موافق بھی ہوتے اور موقع و محل کی مناسبت سے بھی عاری نہ ہوتے، مگر اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے، اسی لیے عنوان سازی میں بھی ان کی نظر انتخاب سے پہلے علامہ اقبال پر جا کر ہی ٹھہرتی تھی۔ اردو ادب کے جاں فروز مرثیوں کا علمی انتخاب 'پیام زندگی' کے مرکزی نام سے 11 جلدوں میں اشاعت پذیر ہوا، ان تمام جلدوں کے ٹائٹل پیج پر جلی حروف میں اقبال کا یہ مشہور مصرع جلی حروف میں مندرج ہے: ''ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی''

علامہ تاجور نجیب آبادی استاد اور شاعر ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے مشہور صحافی اور کامیاب مدیر بھی رہے۔ انھوں نے کئی رسالوں کا اجرا کیا، اور اس راہ سے نہ صرف ادب عالیہ کی خدمت کی، بلکہ ادب آلیہ کو بھی اپنے فکر و قلم کی آنچ دی۔ 'مخزن'، 'ادبی دنیا'، 'ہمایوں'، 'شاہ کار' اور 'اتحاد' ان کے مشہور ادارتی مرحلے ہیں۔ ان تمام رسالوں میں 'ادبی دنیا' کو متحدہ ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں جو پذیرائی ملی، وہ اس وقت کے دوسرے رسالوں کو نصیب نہ ہو سکی، ہندستان اور اردو خواں منطقے کی بات چھوڑیے، اس رسالے کی غیر ملکی ڈاک اتنی تھی کہ بقول مناظر عاشق ہرگانوی: ''دس بیس اردو ماہناموں کی

علامہ تاجور نجیب آبادی استاد اور شاعر ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے مشہور صحافی اور کامیاب مدیر بھی رہے۔ انہوں نے کئی رسالوں کا اجرا کیا، اور اس راہ سے نہ صرف ادب عالیہ کی خدمت کی، بلکہ ادب آلیہ کو بھی اپنے فکر و قلم کی آنچ دی۔

مجموعی ڈاک بھی اس مقدار کو نہیں پہنچی ہوگی''۔ یہ تعمیری ادب کا ترجمان تھا اور ادب کی افادیت اور اس کی سماجی اہمیت پر زور دیتا تھا۔ ادبی دنیا نے 'نیرنگ خیال' اور 'عالم گیر' جیسے مقتدر رسائل کے عہد شباب میں بھی اپنی زندگی اور درخشندگی کا ثبوت دیا۔ مولانا نے ادبی دنیا کی بنیاد مئی 1929 میں رکھی اور شاید پہلی بار ملک کے مایۂ ناز قلم کاروں کی تخلیقات اور مقالات بالمعاوضہ شائع کیے۔ رسالہ مخزن کے مدیر شیخ عبد القادر بھی اس رسالے کے نگراں تھے۔ گرچہ قلیل عرصے تک ہی تاجور اس رسالے سے باضابطہ منسلک رہے، مگر وہ علاحدگی کے بعد بھی اس کے اعزازی مدیر رہے اور اس رسالے کی ترقی کے لیے دل و جان سے کوشاں رہے، چار سال بعد علامہ اکتوبر 1933 میں اس رسالے سے قانونی طور پر علاحدہ ہو جاتے ہیں اور اس کی ادارت مولانا صلاح الدین کو تفویض کر دیتے ہیں، جنھوں نے اس رسالے کا حق ملکیت خرید لیا تھا اور منصور احمد کو اس کی ادارت سونپ دی تھی۔ اس رسالے میں علامہ تاجور کے حین حیات تو بہت کچھ اقبال کی شخصیت یا ان کے فکر و فن پر شائع نہ ہو سکا کہ علامہ اقبال باحیات تھے اور حین حیات کسی شخصیت پر مضمون کی اشاعت اس وقت بھی معیوب تصور کی جاتی تھی۔ مگر علامہ کے انتقال کے بعد ادبی دنیا کے کارپردازوں نے اقبال کو اپنا مطمح نظر بنایا اور اس کے صفحات میں علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر بہت کچھ شائع ہوا۔ ان تمام مشمولات کی تفصیل 'ادبی دنیا اور اقبال شناسی' نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ادبی دنیا جنوری 1935 کے شمارے میں علام اقبال کے اردو مجموعۂ کلام 'بال جبریل' کا اشتہار نمایاں انداز میں شائع ہوا۔ اپریل 1938 میں علامہ اقبال کی وفات پر عاشق حسین بٹالوی نے تعزیتی اداریہ لکھا تھا۔[1]

ماہ نامہ ادبی دنیا نے اقبال شناسی کے باب میں کیا کچھ خدمات انجام دی ہیں، اس کا اندازہ ان جملوں سے ہوگا:

''ماہ نامہ 'ادبی دنیا' ان معدودے چند ادبی رسائل میں سے ہے جو علامہ اقبال کی زندگی میں جاری ہوئے اور ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد بھی تا دیر چھپتے رہے۔ اس رسالے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں اقبال کے فلسفۂ وفن پر چند مضامین اقبال کی زندگی میں شائع ہوئے اور جب ادبی دنیا کی ادارت مولانا صلاح الدین احمد نے سنبھالی تو انھوں نے اس پرچے کو فکر وفنِ اقبال کا مظہر بنا دیا۔'' (پیش لفظ 'اقبال شناسی اور ادبی دنیا')

1926 میں علامہ اقبال پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے، تو ان کے بعض عقیدت مند احباب نے اس کا جشن منانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اسی سلسلے میں فیروز پور میں ایک مشاعرے کا انعقاد طے ہوا، تاکہ ان کی زیارت اور ان کا شایان شان استقبال کیا جا سکے اور ان کی حمایت میں عظیم الشان جلوس بھی نکالا جا سکے۔ علامہ کی خدمت میں جب یہ تجویز رکھی گئی تو انھوں نے جلوس کو اپنے مذاق و مزاج کے خلاف قرار دیا اور صرف مشاعرے کی اجازت دی، مگر اس شرط کے ساتھ وہ خود صدارت نہیں کریں گے، بلکہ ان کی جگہ مولانا عبد المجید سالک اس کی صدارت کریں گے۔ اس مشاعرے میں مولانا تاجور بھی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، میلا رام وفا اور منوہر سہائے انور وغیرہ کے ساتھ شریک ہوئے اور اپنا کلام بھی سنایا۔

(بحوالہ یاران کہن، عبد المجید سالک، ص 207، مطبوعات چٹان لاہور 1955)

تاجور نجیب آبادی نے اقبال شناسی کے باب میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ماہر اقبالیات نہیں تھے کہ ان کے فکر و فلسفہ پر کوئی مفصل اور مبسوط تحریر بشکل کتاب لکھی ہو، مگر مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انہیں علامہ اقبال کے شاعرانہ افکار و نظریات سے گہری مناسبت تھی اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے سعی و کوشش سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے۔

تاجور نجیب آبادی نے اقبال شناسی کے باب میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ماہر اقبالیات نہیں تھے کہ ان کے فکر و فلسفہ پر کوئی مفصل اور مبسوط تحریر بشکل کتاب لکھی ہو، مگر مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انھیں علامہ اقبال کے شاعرانہ افکار و نظریات سے گہری مناسبت تھی اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے سعی و کوشش سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے۔ مگر افسوس کہ اردو دنیا نے اس ادیب بے نظیر کی خدمات کا کوئی صلہ نہیں دیا، ان کی ادبی خدمات کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ ایک ایسا ادیب و شاعر جس نے اپنے دامن تربیت سے منسلک رکھ کر سیکڑوں کیا، ہزاروں شاعروں و ادیبوں کی تربیت کی اور ان کی خوابیدہ تخلیقی صلاحیتوں کو خون جگر پلا کر، ادبی دنیا میں پروان چڑھایا، مگر وہ خود طاق نسیاں کی نذر کر دیے گئے۔ وہ ایک خاص پس منظر کے حامل ادیب تھے، اس لیے افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کے عمل سے مجتنب رہے، مگر اس میں کیا شک ہے کہ انھوں نے کئی نامور افسانہ نگار اور ڈرامہ نگاروں کی تربیت کی اور انھیں ادبی افق پر نمایاں کیا، شہرہ آفاق افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو انہی کا شرف تلمذ حاصل رہا تھا۔ یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے پنجاب میں اردو شاعری اور انشا پردازی کا صور پھونکا، اردو کی جڑوں کو اپنے لہو سے سینچا، ہندوؤں اور سکھوں میں اردو کو مقبول بنایا اور اردو کی ترویج و ترقی میں وہ بیش بہا خدمت انجام دی کہ گوپال متل نے لکھا:

''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے بعد اردو کی ترویج میں غالباً سب سے زیادہ انھیں کا حصہ ہے''

(دار العلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، حقانی القاسمی، ص 132)

مگر ان کی وفات کے بعد ان کی ذات کو ہی نہیں، ان کے پیش کردہ ادبی سرمایے کو بھی درگور کر دیا گیا اور شورش کاشمیری کو یہ لکھنا پڑا:

''ایک زمانہ میں ان کے لکھے ہوئے اردو نصاب ہائی کلاسز میں پڑھائے جاتے تھے۔ وہ پیٹ کے لیے دوسروں کے نام پر کتابیں لکھ دیتے تھے۔ آج بھی ایک بڑے ادارے کا مالک ان کی تحریریں اپنے نام سے بیچتا ہے۔ مگر جب وہ رحلت کر گئے تو محکمۂ تعلیم نے ان کے پیش کیے ہوئے نصاب کو مسترد کر دیا۔ ان کی ذات کا تو لحاظ ہو سکتا تھا لیکن ان کی موت کے بعد ان کے نصاب یا اولاد کا مسئلہ ہی ناقابل اعتنا ہے۔'' (چہرے، ص 239)

(1) حاشیہ: تین سال بعد ہی ادبی دنیا کو پھر اپنے مدیر سے محروم ہونا پڑا۔ 1937 میں منصور احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد حفیظ ہوشیار پوری اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اس رسالہ کی ادارت کی۔ ادبی دنیا میں مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال شناسی کے پہلو کو بہت اہمیت دی، انھوں نے ہی اس رسالے میں سلسلۂ اقبالیات کا آغاز کیا اور اس سلسلہ کا پہلا مضمون جو ہندی گیت بندے ماترم اور اقبال کے ترانۂ ہندی کے تقابلی موازنے پر مشتمل تھا، اکتوبر 1937 کے شمارے میں اقبال کی زندگی میں ہی شائع کیا۔ مولانا کے عہد میں ہی اکبر علی، کرشن چندر اور جگن ناتھ آزاد جیسے ناقدین کے اقبال پر مضامین شائع ہوئے۔ آزادی کے بعد مولانا صلاح الدین احمد نے 'ادبی دنیا' کو اقبالیات کے سلسلے میں ایک آزاد فورم کی شکل دے دی۔ اقبال پر متعدد مضامین چھاپے، جن سے فکر اقبال کے نئے زاویے روشنی میں آئے۔ مولانا صلاح الدین کے انتقال کے بعد بھی ادبی دنیا میں اقبال شناسی کی تحریک کی لو مدھم نہیں ہوئی۔ بعد میں اس کے مدیر محمد عبد اللہ قریشی مقرر ہوئے، جنھوں نے اقبالیات پر نئے نئے موضوعات کی تلاش کی اور ایک ضخیم 'اقبال نمبر' بھی شائع کیا۔ جو عبد اللہ قریشی کے عہد ادارت کا یادگار اور وقیع کارنامہ ہے۔ ادبی دنیا میں جتنے مضامین چھپے تھے، ان سب کو اقبال شناسی اور ادبی دنیا میں ڈاکٹر انور سدید نے جمع کر دیا ہے۔ دیکھیے: اقبال شناسی اور ادبی دنیا، مرتب: ڈاکٹر انور سدید، بزم اقبال لاہور، نومبر 1988

■

Dr Abrar Ahmad
At+Po IjraVia Rayam Factory
Distt. Madhubani Pin: 847337 (Bihar)

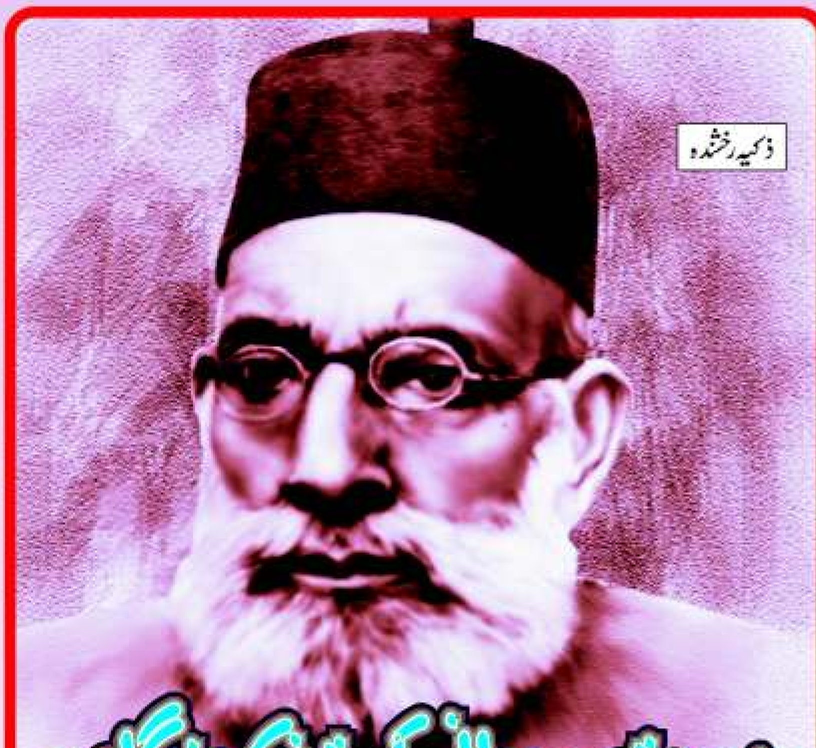

ذکیہ رخشندہ

حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری

اردو زبان کی نثری اصناف میں تذکرے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔ اس صنف ادب میں تذکرہ نگار اپنے محسوسات، جذبات اور تاثرات مثبت انداز میں پیش کرتا ہے اور اگر تنقید کرتا بھی ہے تو اس کا جذبہ مصنف کا قد اونچا کرنے اور زبان و ادب کو سر بلندی عطا کرنے کا ہوتا ہے۔ اسے ماہرین نے سیرت نگاری کی ایک شاخ بھی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بجا طور پر رقم طراز ہیں:

''درحقیقت تذکرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مرکب نوع تصنیف ہے۔ وہ اجزا جن پر ایک تذکرہ مشتمل ہوتا ہے عموماً تین ہوتے ہیں... جدید اصطلاحات کی رو سے ان کے تذکروں میں بیاگرافکل ڈکشنری (قاموس)، لٹریری ہسٹری (تاریخ ادب) اور لٹریری کرٹسزم (تنقید ادب) کے عناصر سہ گانہ یکجا مجتمع ہوتے تھے۔''[1]

یہاں اس امر کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ اردو میں تنقید کی ابتدا انھیں تذکروں کی مرہون منت ہے۔

جس طرح عربی سے فارسی نے اکتساب فیض کیا، اسی طرح اردو نے فارسی زبان سے جلا پائی، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو تذکرہ نگاری بھی اردو شاعری کی طرح فارسی کی مرہون منت ہے۔ فارسی کے تذکرے اردو تذکروں کے لیے اساس اور نمونہ ثابت ہوئے، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر بیشتر قدیم تذکروں کی زبان فارسی ہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا قدیم ترین اور اولیں تذکرہ یعنی نکات الشعرا (میر تقی میر) فارسی میں ہی لکھا گیا، جو اہمیت کے لحاظ سے بھی سب سے ممتاز اور مقدم ہے اور تذکرے کے تقاضوں کو بہمہ وجوہ پورا کرتا ہے۔

جملہ ماقبل تذکروں پر سیر حاصل گفتگو واقعی مفید ثابت ہوتی، تاہم طوالت کے خوف سے محض چند تذکروں تک مقالہ کو محدود رکھا جائے گا۔ نکات الشعرا، تحفۃ الشعرا، اور گلشن گفتار 1752 میں تصنیف کیے گئے۔ اس کے علاوہ تذکرہ مخزن الشعرا (قاضی نور الدین فائق)، تذکرہ مخزن نکات (محمد قیام الدین قائم چاند پوری)، گلزار ابراہیم (علی ابراہیم خاں) فارسی زبان میں ہی لکھے گئے۔ کم و بیش پچاس سال تک فارسی سایہ فگن رہی۔ اسی دوران کبھی کبھی اردو زبان بھی اپنے جلوے دکھا دیتی تھی۔ مثال کے طور پر تذکرہ گلشن ہند کو اردو زبان میں اولیت حاصل ہے، جس کے مصنف میرزا علی لطف ہیں۔ انھوں نے گلزار ابراہیم کا ترجمہ کرکے حذف و اضافہ کے بعد 1801 میں مکمل کیا اور شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی تصحیح و تحشیہ کے بعد بابائے اردو مولانا عبدالحق کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ دار الاشاعت پنجاب نے 1906 میں شائع کیا۔ مرزا لطف علی ہی کے زمانے میں انتخاب دواوین کے نام سے شعرا کے کلام کا انتخاب مع مختصر حیات اردو میں لکھا۔ یہی تذکرے آئندہ اردو زبان میں تذکرہ نگاری کی بنیاد بنے، حالانکہ اس کے بعد بھی فارسی زبان میں تذکرہ نگاری کا سلسلہ جاری رہا، تاہم 1260ھ/...... کے بعد اردو شعرا کے بیشتر تذکرے اردو میں ہی لکھے گئے۔

ابتدائی ادوار میں اردو شعرا کے تذکرے فارسی زبان میں لکھنے کی روایت تھی کیونکہ اس وقت ہندوستان میں فارسی زبان اپنے عروج پر تھی، تاہم اردو زبان بھی معیار و اعتبار بہر حال حاصل کر چکی تھی، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ فارسی کا تذکرہ علامہ شبلی نعمانی نے اردو زبان میں لکھ کر فارسی جیسی ترقی یافتہ زبان کے ماہرین کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ پانچ جلدوں پر مشتمل شعر العجم نے فارسی زبان و ادب کے ماہرین سے نہ صرف داد و تحسین حاصل کی، بلکہ مدت مدید تک بنیادی مآخذ کے طور پر فارسی زبان و ادب کے محققین اور دانشوروں کا مرکز نگاہ بنی رہی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حسرت کے مزاج میں بلا کی جولانی تھی، وہ زندگی بھر کبھی خاموش نہیں بیٹھے، بلکہ اُن کی سیماب صفت طبیعت نے جہاں ایک طرف سیاست میں انھیں حصہ لینے پر مجبور کیا، وہیں پابند سلاسل ہوکر بھی وہ ملک و ملت کی خاطر جملہ ناروا سزائیں کاٹتے گئے۔ علمی و ادبی دنیا میں بھی اُن کا شاداب ذہن برق رفتاری سے کام کرتا رہا جو بیک وقت متعدد موضوعات پر مفید اور کارآمد لٹریچر اردو دنیا کو عطا کرتا تھا، چنانچہ انھوں نے اردوئے معلی اور ارباب سخن کی بھی خوبصورت بزم آراستہ کرنے کی سعی بلیغ کی۔

ارباب سخن: حسرت دراصل اردو شعراء کا ایک ایسا قاموس مرتب کرنے کا منصوبہ ذہن میں تیار کر چکے تھے، جس میں تذکرہ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخی شعور بھی شامل ہو۔ حسرت کی تذکرہ نگاری سے دلچسپی علی گڑھ میں دوران طالب علمی ہی میں ظاہر ہونے لگی تھی۔ مثال کے طور پر حسب ذیل موضوعات پر انھوں نے انجمن اردوئے معلی کے اجلاس منعقدہ 1901/2 میں مقالات پیش کرکے ارباب علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کیا:

(1) اصغر علی خاں نسیم (2) سید محمد خاں رند (3) منیر، (4) سالک، (5) میر کے بہتر نشتر

ارباب سخن کے متعلق احمر لاری لکھتے ہیں:

''حسرت کے تذکرہ ارباب سخن کا پہلا اور دوسرا حصہ پہلے اردوئے معلی (جنوری تا اگست 1927) بعد میں کتابی شکل میں رئیس المطابع کانپور سے شائع ہوا، تیسرا حصہ اردوئے معلی تذکرۃ الشعرا کے اوراق میں اور انتخاب دواوین کے مقدموں کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ چوتھا اور پانچواں حصہ غالباً لکھا ہی نہیں گیا اور اگر لکھا گیا تو چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔''[2]

حسرت شعرائے اردو کے تذکرہ پر مربوط انداز میں کام کرنا چاہتے تھے، جس کے لیے انھوں نے خاکہ بھی مرتب کر لیا تھا، جس میں مفید رہنمایانہ مناہج متعین کیے گئے تھے۔ جس سے ان کے منصوبہ کی بھرپور غمازی

ہوتی ہے۔ یہ خاکہ انھوں نے ارباب سخن (اول، دوم) میں شامل کیا تھا۔

''اس نام سے ہم شعرائے اردو کا ایک جامع و مستند تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں جس کے مفصلہ ذیل پانچ حصے قرار دیے گئے ہیں:

(1) حصہ اول سلاسل شعرائے اردو جس میں شعرائے اردو کی ترتیب و تقسیم ان کے سلسلہ شاعری کے اعتبار سے درج کی جائے گی جس کے دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو سکے گا کہ کس شاعر کا کس خاندان سے تعلق ہے۔

(2) حصۂ دوم فہرست شعرائے اردو جس میں مذکورہ بالا سلاسل کے جملہ اردو شاعروں کی ایک مکمل فہرست بقید نام و نشان مرتب کر دی جائے گی۔

(3) حصہ سوم تذکرہ شعرائے اردو جس میں تمام قابل ذکر شعرائے اردو کا حال مع انتخاب کلام درج کیا جائے گا۔

(4) حصہ چہارم طبقات شعرائے اردو جس میں اردو زبان کے جملہ مشہور اور صاحب دیوان اساتذہ کی تقسیم ان کے زمانہ شاعری کے لحاظ سے مفصلہ ذیل سات طبقوں میں کی جائے گی۔

طبقہ اول از ابتدائے عہد تا 1180ھ، طبقہ دوم از 1180ھ تا 1210ھ، طبقہ سوم از 1211ھ تا 1240ھ، طبقۂ چہارم 1241ھ تا 1270ھ، طبقہ پنجم از 1271ھ تا 1300ھ، طبقہ ششم از 1301ھ تا 1330ھ، ہفتم 1331۔

(5) حصہ پنجم مربیان شعرائے اُردو۔ جس میں شاہان و امرائے دہلی و اودھ دور اور نوابان و امرائے مرشد آباد، عظیم آباد، حیدر آباد، رامپور، بھوپال، ٹونک، بنارس، کدورہ، فرخ آباد، باندا، مہر دین سے ان سب کا حال درج کیا جائے گا جو خود شاعر تھے اور جنھوں نے اپنے زمانے میں مشاہیر سخن کی مربی گری کی تھی۔

حصہ اول سلاسل شعرائے اردو، اس حصے میں مندرجہ ذیل سلاسل شعرا کا نقشہ پیش کیا جائے گا: سلسلہ شاہ حاتم تا شاہ نصیر (باستثنائے ذوق و مومن)، 2-سلسلہ ذوق و شاگردان ذوق تا شاگردان داغ و ظہیر، 3-سلسلۂ مومن و شاگردان مومن ''تا نسیم و تسلیم و شاگردان تسلیم، 4-سلسلۂ ظہیر جانجاں، 5-سلسلۂ میر تقی میر، 6-سلسلہ خواجہ میر درد، سلسلہ سوز، 7- سلسلۂ حسرت و جرأت و شاگردان جرأت، 9- سلسلۂ مصحفی و شاگردان مصحفی، 10 -سلسلہ آتش و صبا و شاگردان آتش وغیرہ، 11-سلسلۂ اسیر و امیر، 12 - شاگردان ناسخ، 13- سلسلۂ غالب، 14-اساتذہ و متفرق صاحب دیوان۔[3]

اس کے بعد شجروں کا سلسلہ 7 صفحات (8-2) پر محیط ہے۔ جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان

شجروں کی تدوین میں کس قدر عرق ریزی اور دماغ سوزی سے کام لیا ہوگا۔

حصہ دوم شعرائے اردو کی فہرست پر مشتمل ہے۔ جو ص9 تا ص36 پر محیط ہے، جو بڑی جامع ہے۔ جس میں ان کے دواوین /قلمی/ مطبوعہ کے بھی حوالے ہیں۔ تمام سلسلوں کی تکمیل کے بعد شعرائے متفرق کی فہرست بھی پیش کی گئی ہے، جسے حروف تہجی کے اعتبار سے ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ دس صفحات (27 تا 36) پر مشتمل ہے۔

دراصل اردوئے معلّٰی پہلے مرحلے میں جولائی 1903 تا جون 1913 جاری رہا، لیکن اس دوران بھی مئی 1908 تا ستمبر 1909 پرچہ بند رہا (حسرت کی گرفتاری کے سبب)، 1925 میں دوبارہ چھپنا شروع ہوا اور یہ سلسلہ 1942 تک جاری رہا۔ اسی اثنا میں جب اردوئے معلّٰی بند ہو گیا تھا، حسرت نے جولائی 1914 سے سہ ماہی تذکرۃ الشعراء جاری کیا۔ جس کے محض سات ہی شمارے منظر عام پر آ سکے۔ ان رسائل میں بھی حسرت شعراء کا تذکرہ شائع کرتے رہے۔ ثاقب بدایونی کا تذکرہ اسی رسالے میں چھپا تھا۔

ثاقب بدایونی: تاریخ ولادت گیارہ ربیع الاول شریف 1285ھ یوم جمعہ بوقت صبح صادق۔ حسرت کے تذکروں سے اکثر شعرا کی شاعری کی ابتداء اور اس کے تدریجی ارتقاء پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ثاقب بدایونی کی ابتدائی شاعری اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف رقمطراز ہیں:

''اس کا شوق آپ کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے۔ آپ کے اجداد میں سے ایک نہ ایک کو اردو، فارسی، عربی وغیرہ کسی نہ کسی زبان میں اس کا شوق رہا۔ آپ کا آٹھ برس کی عمر سے اس کی طرف رجحان ہے

چنانچہ ہشت سالہ عمر میں جو غزل سب سے پہلے لکھی تھی اس کا مطلع بجنسہٖ درج ہے۔

کیا بتاؤں تمھیں کہ کیا ہوں میں
اے بتو! بندۂ خدا ہوں میں

ایک غزل فارسی کی جو نو سال کی عمر میں لکھی تھی اس کا بھی ایک شعر بحالہٖ درج کیا جاتا ہے۔

چہ پرسی واعظ نادان از سوز درون من
خدا شاہد کہ داغ عشق محبوب خدا دارم

پچیس سال کی عمر تک کسی سے اصلاح نہیں لی بلکہ یہ طریق اختیار کیا کہ اردو کے اساتذۂ متقدمین و متاخرین میں سے ایک ایک کے رنگ میں تھوڑی تھوڑی مدت تک بطور خود مشق کرتے رہے اور ہمیشہ یہ خیال پیش نظر رہا کہ کسی رنگ میں طبیعت مجبور نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کے جمیع اصناف شعر میں طبیعت کی روانی دکھاتے رہے۔ اردو، فارسی، عربی، ہندی، چار زبانوں میں مشق سخن حاصل ہے۔ مگر اردو کی طرف ہمیشہ سے زیادہ رجحان رہا۔''[4]

مندرجہ بالا اقتباس سے نہ صرف اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ شاعری کا شوق ثاقب بدایونی کو خدا کی طرف سے وراثت میں ودیعت ہوا تھا بلکہ انھوں نے کمسنی یعنی محض آٹھ سال کی عمر سے ہی اردو میں شاعری کی ابتداء کر دی تھی اور نو سال کی عمر میں فارسی زبان میں بھی غزل کہہ ڈالی۔ اتنی کم عمر میں اردو، فارسی، ہندی، عربی، چار زبانوں پر نہ صرف عبور حاصل کر لیا تھا بلکہ ان زبانوں میں طبع آزمائی بھی کرتے رہے لیکن اردو کو سب زبانوں پر فوقیت دیتے تھے۔ اس تذکرے سے ثاقب بدایونی کی استادی شاگردی نیز میدان سخن میں ان کو حاصل ہونے والے امتیازات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ابتدا میں ثاقب بدایونی اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لیا کرتے تھے۔ لیکن اقتباس ذیل اس بات کا شاہد ہے کہ بعد میں لوگوں کے اصرار سے انھوں نے داغ دہلوی اور ظہیر دہلوی سے مشورہ لینا شروع کیا، مصنف رقمطراز ہیں:

''آخر کار احباب کے اصرار پیہم سے ابتداء اپنا کلام نواب فصیح الملک مرحوم داغ دہلوی کی خدمت میں گاہ بگاہ رجوع کیا اور بعد ازاں بزمانہ قیام ریاست ٹونک نواب راقم الدولہ حضرت ظہیر دہلوی سے وقتاً فوقتاً مشورہ کرتے رہے۔ استاد ظہیر نے اسی زمانے سے اپنے کل تلامذہ کی اصلاح آپ کے سپرد کر دی اور بسا اوقات تقریراً و تحریراً آپ کو اپنا جانشین ظاہر کیا۔ جس کا استدلال ان مرحوم کی چند تحریروں سے ہو سکتا ہے۔ حقیقتِ امر تو یہ ہے کہ جب طبیعت ہونہار اور مواد علمی کامل طور پر تیار ہو تو اصلاح کی چنداں محتاج نہیں رہتی بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے

کہ ایسے شاگرد شروع ہی سے مایۂ ناز و فخر استاد ہوتے ہیں۔ اسی زمانہ قیام ٹونک میں امام الکلام پہلوان سخن کا معزز خطاب حاصل کیا اور زمانہ قیام ریاست بڑودہ میں طوطی گجرات کا خطاب حاصل کیا۔''5

استاد ظہیر دہلوی نے اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا۔ لہٰذا انھوں نے نہ صرف ثاقب کو اپنے تلامذہ کا استاد مقرر کر دیا بلکہ اکثر اوقات تحریری و تقریری طور پر بھی ان کو اپنا جانشین بنا دیتے تھے۔ ایسے مایہ ناز شاگردوں کو فخر استاد قرار دیا ہے اور اسی کے ساتھ مندرجہ بالا اقتباس سے ثاقب بدایونی کو میدانِ شاعری میں حاصل ہونے والے خطابات کا بھی ہمیں علم ہو جاتا ہے۔

ان تذکروں سے شاعر کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے، لہٰذا مرزا مظہر جانِ جاناں (1115ھ تا 1195ھ) کے اخلاق و عادات کے ذیل میں حسرت نے جو درج کیا ہے اس کے ایک اقتباس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں:

منشی کریم الدین ترجمہ تاریخ شعرائے اردو مطبوعہ 1848 میں اپنے زمانے کی زبان میں لکھتے ہیں:

''نفاست اور نزاکت اس قدر مزاج میں تھی کہ اس کے بیان کرنے کے واسطے ایک دفتر درکار ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے مکان میں کوئی شے بدزیب یا بے قرینہ رکھی نہ دیکھی، اگر میرزا بازار کو بارادہ سیر آتے تھے اور راہ میں کسی غریب کی چارپائی خراب یا جھلنگا پڑی پاتے اسی جائے بیٹھ جاتے اور کہتے کہ جب تک یہ درست نہ ہولے گی میں آگے نہ جاؤں گا۔ کوئی نواب عالی قدر ان کی ملاقات کے واسطے ایک روز آیا تھا اس نے جھجر میں سے پانی پی کر آبخورا ٹیڑھا رکھ دیا تھا۔ اس سے خفا ہوئے اور کہا کہ تو بالکل گدھا ہے۔ کس بے وقوف نے تجھے نواب بنا دیا ہے۔ آبخورا سیدھا رکھنا بھی نہیں آتا۔ مرزا کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی شخص بے انتظام یا بدزیب پاتے تو فوراً مثل ماہی بے آب تڑپنے لگتے۔''6

مندرجہ بالا اقتباس صرف مرزا مظہر جانِ جاناں کی نازک مزاجی کا دلچسپ مرقع نہیں ہے، بلکہ اس سے حسرت جیسے شاعر کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ وہ بین السطور اپنے قاری کے لطف کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے مضامین بھی تلاش کرکے درج کرتے جاتے ہیں جو قاری کو ان کی تحریروں سے جوڑنے کا وسیلہ ثابت ہوں اور وہ بوریت کا شکار نہ ہوں۔

تذکروں میں شاعر کے حالاتِ زندگی، شاعر کی شخصیت، اس کا نمونہ کلام اور کلام پر تنقید شامل ہوتی ہے۔

حسرت خاندان مومن و نسیم دہلوی کے شعرا نیز اپنے دیگر ممتاز معاصر شعراء کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ گستاخ رامپوری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''گستاخ رامپوری: (1866 تا 1914) کرامت اللہ خاں نام، گستاخ تخلص، خلف عبداللہ خاں مرحوم۔ رام پور کے ایک مشہور اور با اثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں کے واقعۂ قتل میں آپ کے والد کی نسبت بھی سازش کا شبہ کیا گیا، جس کا نتیجہ خود ان کی اور ان کے کل خاندان کی بربادی کی صورت میں نمودار ہوا۔ مگر حسن اتفاق کا کرشمہ دیکھیے صرف یہی نہیں ہوا کہ اس وقت کرامت اللہ خاں مرحوم حکومت کی دار و گیر سے بچے رہے، بلکہ بعد میں بدگمانیوں کے رفع ہونے پر والیِ رامپور کی نوازشِ خاص سے بھی بہرہ اندوز ہوئے۔

اردو فارسی کی رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔ سلسلۂ ملازمت کی ابتدا رامپور سے ہوئی۔ مگر بعد میں حکومت انگریزی کے محکمۂ جیل میں جگہ مل گئی، جہاں آخر وقت تک داروغی جیل کی خدمت ادا کرتے رہے۔ چنانچہ راقم حروف کو پہلے پہل جب آپ سے نیاز حاصل ہوا تو آپ علی گڑھ جیل کے داروغہ تھے۔ علی گڑھ کے بعد ایٹہ، اناؤ، سلطانپور وغیرہ مختلف اضلاع میں بڑی کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ جیلری کی۔ ارادہ یہ تھا کہ وطن میں قیام کرکے باقی حصہ عمر نواب صاحب بہادر رامپور کے خسروانہ مراحم و الطاف کی بدولت بآسانی و آرام بسر کریں گے، مگر افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور بہ مرض استسقا 50 سال کی عمر میں بہ مقام دہلی انتقال کیا۔ گستاخ کی تصنیف سے ان کی غزلوں اور چند قصیدوں کے سوا اور کچھ دستیاب نہیں ہوا۔ غزلیں بھی نہایت ابتر اور بے ترتیب حالت میں ملیں... شاعری میں گستاخ مرحوم منشی امیر احمد مینائی کے شاگرد تھے...''7

حسرت شاعر کی زندگی اور شخصیت سے زیادہ اس کے کلام پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ اپنے تذکرے میں شعراء کے کلام پر کوئی رائے دیتے ہوئے زیادہ تر زبان اور اسلوب بیان کو پیش نظر رکھتے ہیں، کیونکہ اُن کا بنیادی مقصد اصلاح زبان ہے۔ درج ذیل اقتباسات ان کے اس طرز کے عکاس ہیں جس سے ان کی تنقیدی آراء کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نسیم دہلوی:

''دلفریبی خیال اور رنگینی بیان شاعری کے دو خاص جوہر نسیم کو مومن خاں سے بحیثیت میراث استاد حاصل ہوئے تھے جن کو انھوں نے بہ اضافۂ تجرید زبان خوب سے خوب تر بنا کر دنیائے شاعری میں اس آن بان کے ساتھ پیش کیا کہ لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جلوہ جیسا مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے، اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی اور یہی وجہ ہے کہ ہم نسیم کی منتخب غزلوں کو اردو شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔''8

وفا رامپوری:

''الفاظ کی رنگینی، تراکیب کی خوبی، مضمون کی نزاکت اور معنی کی دشواری کو کلام وفا کی خصوصیات میں سمجھنا چاہیے۔ ان کی شاعری سوقیانہ مذاق اور عامیانہ مضامین سے بالکل پاک ہے اور متانت مضمون اور بلندی خیال کے لحاظ سے بھی ہر آئینہ ستائش کی مستحق ہے... صرف دشوار پسندی کا ایک عیب البتہ ایسا ہے جس سے کبھی کبھی ان کے شعر کی کل اور خوبیاں بے کار ہو جاتی ہیں...''۔9

حسرت نہ صرف ممتاز شاعر ہیں بلکہ ایک بہترین نقاد بھی ہیں اور صاحب طرز ادیب بھی۔ ان کے تذکروں کی تنقید میں بھی ادب کا رنگ غالب رہتا ہے۔ اُن کے یہاں یہ ادبیت محض تشبیہات و استعارات اور رنگینی عبارت کی مرہون منت نہیں ہوتی، بلکہ ان کی تحریریں سلیس اور رواں ہوتی ہیں۔ اس کے باوصف حسرت کی طرزِ تحریر خشک اور روکھی پھیکی نہیں ہوتی بلکہ اس کی شگفتگی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

مذکورہ جائزے کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حسرت کے تذکروں کی اہمیت اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ برقرار رہے گی کیونکہ یہ ادب عالیہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

حواشی:

1. شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، مکتبہ جدید، لاہور 1952، 92,93، بحوالہ حسرت موہانی - حیات اور کارنامے، احمر لاری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1973، ص 305
2. ایضاً، ص 317
3. اربابِ سخن، حصہ اوّل و دوم، سید فضل الحسن حسرت موہانی، رئیس المطابع کانپور، 1929، ص 1
4. تذکرۃ الشعرا (جزو اول) ثاقب بدایونی، مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی، مطبع فیض عام علی گڑھ، جولائی 1914، ص 1,2
5. ایضاً، ص 2
6. تذکرۃ الشعراء، حضرت مرزا مظہر جان جاناں، از سید فضل الحسن حسرت موہانی، اردوئے معلّٰی فیض عام علی گڑھ، مارچ 1907، ص 2
7. اردوئے معلّٰی، سید فضل الحسن حسرت موہانی، احمد المطابع، کانپور، اپریل، مئی، جون، 1925، ص 1-3
8. ایضاً، مطبع فیض عام، علی گڑھ، جنوری 1907، ص 7
9. ایضاً، احمد المطابع، کانپور، مارچ 1925، ص 5,6

■

Dr. Zakia Rakhshinda,
'Dilkusha',N-49,Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

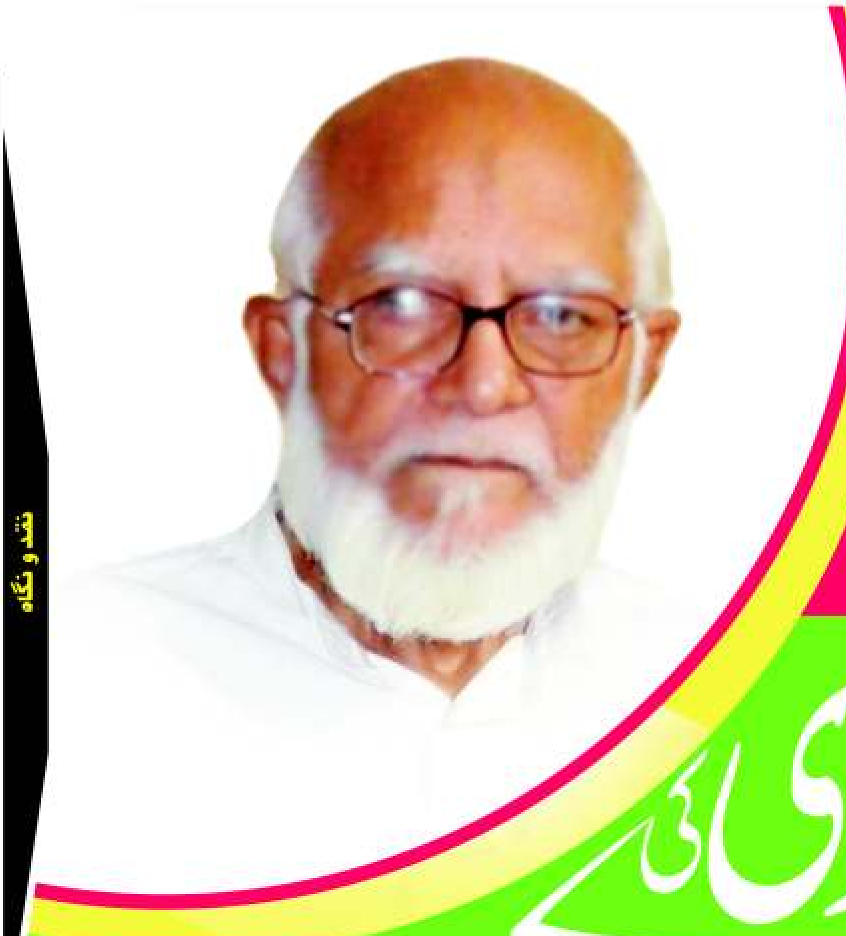

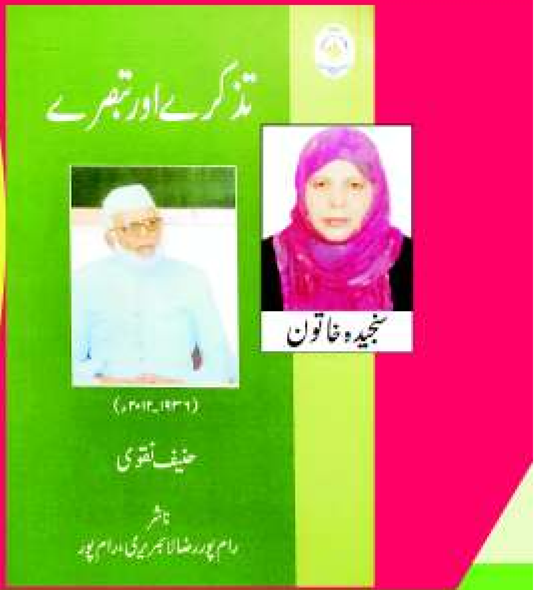

سنجیدہ خاتون

حنیف نقوی کی بعد از وفات مطبوعہ نئی تصانیف

پروفیسر حنیف نقوی (1936-2012) کا شمار عصر حاضر کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، پروفیسر گیان چند، ڈاکٹر ابومحمد سحر اور رشید حسن خاں جیسے ممتاز اور معروف اہل قلم اور ارباب تحقیق نے ان کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

پروفیسر نقوی نے اپنی تحقیق کا آغاز شعرائے اردو کے تذکروں کے گہرے مطالعے اور ان کی قدر و قیمت کے تعین سے کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'کربل کتھا'، رجب علی بیگ سرور اور رائے بنی نرائن دہلوی سے متعلق بھی اعلا درجے کی تحقیقات پیش کی ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ انھوں نے غالب کی سیرت و شخصیت، تلامذہ و احباب، ان کی اردو و فارسی تصانیف اور خطوط وغیرہ سے متعلق بھی درجنوں مضامین و مقالات لکھے ہیں، جن کی بنا پر ان کا شمار ممتاز غالب شناسوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے دوراول کی تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

1. شعرائے اردو کے تذکرے، طبع اول 1976، طبع دوم 1998
2. انتخاب کربل کتھا مع مقدمہ و فرہنگ، طبع اول 1983، طبع دوم 1991
3. تلاش و تعارف 1987
4. انتخاب کلام رجب علی بیگ سرور، 1988
5. رجب علی بیگ سرور: چند تحقیقی مباحث، 1991
6. مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن) 1997
7. رائے بنی نرائن دہلوی، 1997

پروفیسر نقوی کی یہ تمام کتابیں بیسویں صدی کے ربع آخر میں شائع ہوئی ہیں۔ اس فہرست میں دو کتابیں اور بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔

1. غالب-احوال و آثار، کیونکہ اس کی پہلی اشاعت 1990 میں منظر عام پر آئی، لیکن اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن 2007 میں شائع ہوا۔
2. مآثر غالب (تصحیح و ترتیب جدید) 1995، اس کا بھی دوسرا ایڈیشن 2000 میں شائع ہوا۔ اس لیے ان دونوں کتابوں کا ذکر میں نے آخر میں کیا ہے۔

اب پروفیسر نقوی کی ان تصانیف کے نام درج کیے جاتے ہیں جو اکیسویں صدی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، انھیں ان کے دور دوم کی تصانیف کہا جا سکتا ہے۔

1. میر و مصحفی، 2003
2. غالب کی چند فارسی تصانیف، 2005
3. تذکرہ شعرائے سہسوان، (ترتیب و تدوین) 2010
4. تذکرۃ العلما (ترتیب و تدوین جدید) 2010
5. غالب اور جہان غالب، 2012

پروفیسر نقوی کی یہ تمام تصانیف یا مرتبہ کتابیں اکیسویں صدی میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں۔ لیکن میں یہاں خاص طور پر پروفیسر نقوی کی ان تین کتابوں کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب کا نام ہے:

1. تحقیق و تعارف:

اس کتاب کو پروفیسر حنیف نقوی نے اپنی حیات ہی میں مرتب کر دیا تھا اور اس کی کتابت بھی ان کے سامنے ہو چکی تھی۔ اس پر وہ مقدمہ بھی تحریر کر چکے تھے،

لیکن اس کی اشاعت سے قبل ہی ان کی وفات ہوگئی۔ بعد ازاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 2013 میں اسے شائع کیا۔ یہ کتاب ان کے 20/ مقالات کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(1) بیاضِ آبرو (2) سودا کا سالِ ولادت (3) میر کا دیوانِ چہارم (4) مثنوی ہدایت در تعریفِ بنارس (5) منظوماتِ آگاہ کے نثری دیباچے (6) فسانۂ عجائب کا حقِ اشاعت (7) شبستانِ سرور کا ماخذ (8) غالب اور عیوبِ قوافی (9) مرزا دبیر شعرائے اردو کے تذکروں میں (10) منشی انوار حسین تسلیم (11) محاکمۂ تسلیم بہ مقدمۂ دبیر و انیس (12) منشی عبدالعزیز اعجاز (13) مکاتیبِ حالی (14) منشی بنواری لال شعلہ (15) اودھ اخبار کی ادبی قدر و قیمت (16) مولانا محمد علی جوہر کے خاندان کا رامپور سے تعلق (17) اقبال سے منسوب ایک غزل (18) اقبال کے ایک فارسی قطعے کی تضمین (19) کچھ کالڑا صاحب کے بارے میں (20) پروفیسر مختارالدین احمد

پروفیسر نقوی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ کسی موضوع پر اسی وقت قلم اٹھاتے ہیں جب اس پر مدتوں تلاش و تحقیق اور غور و فکر کرکے انھیں نئی معلومات یا اہم نکات فراہم ہوگئے ہوں۔ اس کتاب میں شامل تمام مضامین کے عنوانات خود بتا رہے ہیں کہ ان میں تحقیق و جستجو کی شان جلوہ گر ہے۔ مقدمۂ کتاب میں نقوی صاحب لکھتے ہیں:

''راقم کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس کے معروضات صرف پیش پا افتادہ معلومات کا مجموعہ نہ ہوں۔ ان میں کسی نہ کسی حد تک پڑھنے والوں کی ضیافتِ علمی کا سامان بھی موجود ہو۔ (تحقیق و تعارف، ص8)

اس کتاب کا پہلا مضمون 'بیاضِ آبرو' ہے۔ اس میں انھوں نے ایک قدیم بیاض کا تعارف کرایا ہے جس میں ولی، شاہ مبارک آبرو اور ان کے معاصر 18 قدیم شعرا کے اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے شعرا ہیں جن کا کلام کہیں اور دستیاب نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیشتر شعرا گم نام اور غیر معروف ہیں۔ مثلاً مدن، اشرف، عمر، مسکین، نقشبندی وغیرہ۔ اس سے اس بیاض کی قدر و قیمت کا اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بیاض کا وہ تعارف پیش کررہے ہیں وہ آبرو کی اصل بیاض نہیں بلکہ اس کی نقل ہے۔ اس کے ساتھ ہی کاتبِ بیاض کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ بہت عجلت پسند اور غلط نویس ہے۔ اس لیے اس کے نقل کیے ہوئے اشعار کا صحیح طرح سے پڑھنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی انھوں نے خاص طور پر غیر معروف

نقوی صاحب مرحوم کا ارادہ تھا کہ 'غالب کے فارسی خطوط' کے عنوان سے بھی ایک مجموعۂ مضامین شائع کریں. اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک فولڈر میں متعلقہ مضامین کی کتابت شدہ کاپیاں یکجا کرکے رکھ دی تھیں اور فولڈر کے اوپر کتاب کا نام لکھ کر نیچے کی سطروں میں مضامین کے عنوانات بھی ترتیب وار لکھ دیے تھے. غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سید رضا حیدر سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس کی اشاعت کے لیے نہ صرف آمادگی بلکہ اشتیاق کا اظہار کیا. اب یہ کتاب انہیں کے زیر اہتمام شائع ہورہی ہے.

شعرا کا کلام قیاسی تصحیح کے بعد نقل کردیا ہے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

اس کتاب کا دوسرا مضمون 'سودا کا سالِ ولادت' ہے۔ اس مضمون میں نقوی صاحب نے سودا کے سالِ ولادت سے متعلق مختلف بیانات کا محققانہ جائزہ لینے کے بعد حاصلِ گفتگو کے طور پر یہ لکھا ہے:

''میر حسن کے اندازے کے مطابق سودا اور میر کی عمروں میں تقریباً 10 سال کا فرق تھا، یعنی سودا میر سے دس سال بڑے تھے... میر کے متعلق یہ بات طے ہوچکی ہے کہ وہ 1135ھ کے اواخر (1723) میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سودا ان سے دس سال پہلے 1125ھ (1713) میں پیدا ہوئے ہوں گے۔''
(ایضاً، ص41)

اس کتاب کا تیسرا مضمون 'میر کا دیوان چہارم' ہے۔ میر کے دیوان کا یہ بہت اہم قلمی نسخہ ہے۔ اس سے متعلق نقوی صاحب کا یہ مضمون نہایت محققانہ ہے۔ اس میں نقوی صاحب نے اس قلمی نسخے کا تعارف بھی کرایا ہے۔ اور اس سے متعلق پروفیسر اکبر حیدری کی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین بیش قیمت تحقیقی معلومات پر مشتمل ہیں۔ ان کے مطالعے سے ادب کے طالب علم میں تحقیق کا ذوق بھی پیدا ہوسکتا ہے اور وہ تحقیق کے صحیح طریق کار سے واقف بھی ہوسکتا ہے۔

2. غالب کے فارسی خطوط: پروفیسر حنیف نقوی کی دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب بھی نقوی صاحب کی وفات کے بعد 2015 میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ نقوی صاحب کے شاگرد پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے 'تقریب' کے عنوان سے اس پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نقوی صاحب مرحوم کا ارادہ تھا کہ 'غالب کے فارسی خطوط' کے عنوان سے بھی ایک مجموعۂ مضامین شائع کریں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک فولڈر میں متعلقہ مضامین کی کتابت شدہ کاپیاں یکجا کرکے رکھ دی تھیں اور فولڈر کے اوپر کتاب کا نام لکھ کر نیچے کی سطروں میں مضامین کے عنوانات بھی ترتیب وار لکھ دیے تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سید رضا حیدر سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کی اشاعت کے لیے نہ صرف آمادگی بلکہ اشتیاق کا اظہار کیا۔ اب یہ کتاب انھیں کے زیرِ اہتمام شائع ہورہی ہے۔''

یہ کتاب نقوی صاحب کے آٹھ مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر مضمون کسی نہ کسی پہلو سے غالب کے فارسی خطوط سے تعلق رکھتا ہے۔ کتاب کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(1) غالب کی فارسی مکتوب نگاری (2) نامہ ہائے فارسی غالب (3) تفہیم غالب کی دشواریاں، فارسی خطوط کے حوالے سے (4) غالب کے چار غیر مطبوعہ فارسی خط (5) غالب کا ایک نو دریافت فارسی خط (6) غالب کا ایک فارسی خط (7) غالب کے تین فارسی خطوط (8) جنون بریلوی سے منسوب دو فارسی خط۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کتاب کے پہلے مضمون کا عنوان ہے ''غالب کی فارسی مکتوب نگاری'' یہ اس کتاب کا سب سے مفصل مضمون ہے جو 34 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ دراصل ایک طویل خطبہ ہے جو 2008 میں شعبۂ اردو، دہلی میں نظام اردو خطبات کے تحت پیش کیا گیا تھا۔ اس میں نقوی صاحب نے غالب کے فارسی خطوط کا بہت گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ غالب کے فارسی خطوط مختلف پہلوؤں سے ہماری ادبی تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کا بیان مختصراً ذیل میں کیا جاتا ہے:

1. غالب کے اردو خطوط سے ان کی زندگی کے صرف آخری بیس بائیس برسوں کے حالات و واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے برخلاف ان کے فارسی خطوط ان کی نوجوانی کے زمانے سے لے کر پچاس سال کی عمر تک کے

واقعات اور حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کیونکہ غالب اس زمانے میں زیادہ تر فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے۔ البتہ پچپاس سال کی عمر کے بعد وہ زیادہ تر اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔

2. ان کے فارسی خطوط سے ان کی سیرت و شخصیت اور ان کی بعض عادتوں اور طور طریقوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اپنی نوجوانی کے زمانے ہی میں وہ رات کا کھانا چھوڑ چکے تھے، لیکن دن کا کھانا ہر حال میں ضرور کھاتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتوار کے دن گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔

3. غالب کے سفر کلکتہ، وہاں کے قیام کے دوران پیش آنے والے مختلف واقعات اور وہاں کے ادبی معرکوں سے متعلق زیادہ تر تفصیلات کے جاننے کا اصل ذریعہ ان کے فارسی خطوط ہی ہیں۔

پروفیسر نقوی کی یہ کتاب بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اسے رضا لائبریر ی، رامپور نے مئی 2018 میں شائع کیا ہے۔ اس کتا ب کے مضامین بھی انھوں نے ایک فولڈر میں خود ہی یکجا کردیے تھے۔ اور فولڈر کے اوپر کتاب کا نام لکھ کر مضامین کی ترتیب بھی خود ہی قائم کردی تھی۔ ان کی اس تحریر کا عکس کتا ب کے آخر میں ص 336 پر موجود ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصے میں نو مضامین ہیں اور یہ سب تذکرں سے متعلق ہیں۔

4. ان کے فارسی خطوط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنے زمانے کے کن کن امیروں اور نوابوں کو انھوں نے فارسی میں خطوط لکھے اور ان کی شان میں فارسی قصیدے لکھ کر انعام حاصل کرنے کے لیے بھیجے۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انھیں کہاں کہاں کامیابی ملی اور کب کب انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ نقوی صاحب کا یہ طویل مضمون اس کے علاوہ بھی بہت سی اہم اور نادر معلومات پر مشتمل ہے جس سے استفادے کے لیے اس مضمون کا اول سے آخر تک توجہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔

اس کتاب کا دوسرا مضمون 'نامہ ہائے فارسی غالب' ہے۔ اس میں نقوی صاحب نے پہلے یہ بتایا ہے کہ 'نامہ ہائے فارسی غالب' غالب کے 31 فارسی خطوط اور پانچ متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے جسے سید اکبر علی ترمذی نے غالب کی صد سالہ تقریب کے موقع پر ترتیب و تدوین کے بعد فروری 1969 میں غالب اکیڈمی، نئی دہلی سے شائع کیا۔ اس کے بعد اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ترمذی صاحب نے اس مجموعے کی ترتیب و تدوین کا کام ساڑھے چار مہینے سے بھی کچھ کم مدت میں مکمل کرلیا۔ کچھ اس عجلت کی وجہ سے اور کچھ ترتیب و تدوین کے کاموں میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے ان کا مرتب کیا ہوا غالب کے فارسی خطوط کا یہ مجموعہ بہت سی کمیوں اور غلطیوں کا شکار ہوگیا۔ اس کے بعد نقوی صاحب نے ترتیب و تدوین کے اصولوں کی روشنی میں نہایت دیدہ ریزی اور تحقیقی دیانت داری کے ساتھ اس مجموعے میں پائی جانے والی غلطیوں اور کمیوں کی نشان دہی کی ہے۔ پہلے مضمون کی طرح یہ مضمون بھی نہایت مفصل ہے اور 32 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا مضمون ہے 'تفہیم غالب کی دشواریاں: فارسی خطوط کے حوالے سے'۔ پروفیسر نقوی کا یہ مضمون بھی نہایت محققانہ ہے۔ اور 23 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ غالب کے فارسی خطوط کو پڑھنے، سمجھنے اور اس سے نتائج نکالنے کے لیے بہت احتیاط، توجہ اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ پھر بہت سی مثالوں کے ذریعے انھوں نے غالب کے محققین اور مترجمین کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً 'مآثر غالب'، مرتبہ قاضی عبدالودود میں شامل غالب کے چوبیسویں فارسی خط کے بارے میں انھوں نے بتایا ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے اس خط کا مکتوب الیہ مرزا احمد بیگ تپاں کو قرار دیا ہے۔ لیکن اس خط کو بہ غور پڑھنے اور اس کے داخلی شواہد پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے یہ خط تپاں کے نام نہیں بلکہ مرزا افضل بیگ کے نام لکھا تھا۔ تپاں غالب کے دوستوں میں تھے اور افضل بیگ ان کے شدید مخالفین میں تھے۔ خط کی عبارت بتا رہی ہے کہ خط مخالف کے نام لکھا گیا ہے، نہ کہ کسی دوست کے نام۔ نقوی صاحب کا یہ پورا مضمون ایسے ہی تحقیقی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے تعارف کو یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔

3. تذکرے اور تبصرے:

پروفیسر نقوی کی یہ کتاب بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اسے رضا لائبریری، رامپور نے مئی 2018 میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین بھی انھوں نے ایک فولڈر میں خود ہی یکجا کردیے تھے۔ اور فولڈر کے اوپر کتاب کا نام لکھ کر مضامین کی ترتیب بھی خود ہی قائم کردی تھی۔ ان کی اس تحریر کا عکس کتاب کے آخر میں ص 336 پر موجود ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں نو مضامین ہیں اور یہ سب تذکروں سے متعلق ہیں۔ ان کے عنوانات اس طرح ہیں:

(1) عقد ثریا (2) کچھ مخزن نکات کے بارے میں (3) سرو آزاد اور شعرائے اردو (4) دستور الفصاحت اور شعرائے اردو (5) تذکرۂ مسرور (6) تذکرہ شعرائے سہسوان (7) تذکرۂ بے جگر کا مؤلف (8) خم خانۂ جاوید (9) طبقات شعرائے ہند

دوسرا حصہ چھے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(1) فضلی اور کربل کتھا (2) حکیم احسن اللہ خاں: چند معروضات (3) اردو مثنوی شمالی ہند میں (4) ماہ نامہ شاعر کا اقبال نمبر (5) اردو ادب کا اولین نقاد باقر آگاہ (6) اردو کی ترقی میں نماز کا حصہ۔

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ پروفیسر نقوی نے اپنی تحقیق کا آغاز شعرائے اردو کے تذکروں سے کیا تھا۔ چنانچہ اسی موضوع پر کام کرکے انھوں نے Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مختلف موضوعات پر تحقیقی خدمات انجام دیتے رہے، جن کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی جاچکی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تذکروں سے بھی ان کی دلچسپی برقرار رہی ہے۔ اس لیے وہ تذکروں سے متعلق مضامین بھی برابر لکھتے رہے۔ تذکروں سے متعلق اس کتاب میں شامل ان کا ہر مضمون تذکرہ شناسی کے فن میں ان کی مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ ان مضامین پر الگ الگ گفتگو کے بجائے یہاں پر پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے نقوی صاحب کی اس کتاب پر 'حرفے چند' کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''نقوی صاحب کا نشانِ امتیاز یہ تھا کہ وہ کسی بھی کتاب کا بہ نظر غائر اور بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے۔ تذکروں کے سلسلے میں بھی وہ اسی روش پر قائم رہے، چنانچہ جن تذکروں پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے، وہ قلمی ہوں یا مطبوعہ، انھیں لفظ بہ لفظ بلکہ حرف بہ حرف پڑھ کر ہی اس کی قدر و قیمت سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اسی لیے موضوع زیر بحث سے متعلق ان کی آرا نہایت وقیع اور اہمیت کی حامل ہیں۔'' (ص 12)

اسی طرح ڈاکٹر حسن عباس اس کتاب پر اپنے پیش نامہ میں تحریر کرتے ہیں:

''نقوی صاحب نے عقد ثریا، مخزن نکات، دستور الفصاحت پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے اور ایک بالکل نامعلوم تذکرے، تذکرۂ مسرور (تالیف شرف الدین احمد مسرور) کے چند اوراق جو اورینٹل کالج لاہور کے فروری 1933 کے شمارے میں شائع ہوئے تھے، ان کی اساس پر یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ یہ مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ چند اوراق سے کتنی قیمتی باتیں حاصل کی گئی ہیں۔'' (ص،8)

اس کتاب کا دوسرا حصہ نقوی صاحب کے تحریر کردہ چند تبصروں پر مشتمل ہے۔ ان تبصروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرسری اور روایتی تبصرے نہیں ہیں، بلکہ ان میں تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کو مستقل مقالے یا مضمون کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ مالک رام اور مختار الدین احمد کی مرتبہ کربل کتھا پر ان کا مضمون یا تبصرہ 107 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے ایک مختصر کتاب یا کتابچہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کربل کتھا کے مصنف فضل علی فضلی کے بارے میں ایک قیاس یہ تھا کہ وہ پنجاب کے باشندے تھے۔ دوسرا قیاس یہ تھا کہ وہ دکن کے رہنے والے تھے۔ نقوی صاحب نے ان دونوں قیاسات کی تردید کرتے ہوئے پختہ دلائل اور تحریری شواہد پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ فضلی بنارس کے قریب مرزاپور کے اطراف کے باشندے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اس مضمون میں بہت سے لسانی مباحث بھی اٹھائے ہیں۔ اس کے علاوہ کربل کتھا میں مستعمل بہت سے نامانوس الفاظ کی اصل سے بھی بحث کی ہے۔ اور اس ضمن میں دکن اور شمالی ہند کے قدیم شعرا کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر نقوی صاحب کے مطالعے کی وسعت اور نگاہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کے اس حصے میں شامل ان کے دوسرے مضامین بھی اسی طرح نہایت محققانہ اور عالمانہ ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص اور وزیر اعظم تھے۔ پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن نے ان پر مقالہ لکھا تھا۔ نقوی صاحب نے ان کے مقالے پر بہت سی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' پروفیسر گیان چند کی تصنیف ہے، جو نقوی صاحب کے استاد تھے۔ نقوی صاحب نے اس کتاب پر مفصل تبصرہ لکھا اور بہت سی نئی معلومات پیش کیں، جنھیں پڑھ کر پروفیسر گیان چند بہت خوش ہوئے اور شاگرد کی حوصلہ افزائی کی۔ شاعر کے اقبال نمبر پر بھی نقوی صاحب کا تبصرہ بہت جامع ہے۔ اخیر کے دونوں تبصروں (اردو ادب کا اولین نقاد: باقر آگاہ از علیم صبا نویدی) اور (اردو کی ترقی میں نماز کا حصہ از ڈاکٹر سید صفدر رضا) کے بارے میں ڈاکٹر سید حسن عباس کا یہ بیان نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ دونوں تبصرے ایسے محققین و مصنفین کو ضرور پڑھنے چاہئیں جنھیں اپنی تحقیقات پر کچھ زیادہ ہی ناز ہو۔'' (ص 9-10)

نقوی صاحب کی تین بعد از وفات مطبوعات کے بارے میں گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ان کی کتب کی قدر و قیمت کا اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ نقوی صاحب نے اردو تحقیق کو سمت و رفتار عطا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ وہ محققوں کے محقق ہیں۔

آخر میں نقوی صاحب کی ایک اور کتاب کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا جو ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی لیکن اس کے مرتب ڈاکٹر شمس بدایونی ہیں۔ یہ کتاب بہ اسم 'حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں' مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، سیوان، بہار سے 2016 میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں حنیف نقوی کے 16ر مضامین اور ایک ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ ان مضامین کا زمانہ تصنیف و اشاعت 1955 تا 1961 ہے، جو حنیف نقوی کا دور طالب علمی ہے جسے مرتب نے حنیف نقوی کے ادبی سفر کا دور اول کہا ہے۔ مرتب کے بہ قول ان کا پہلا مضمون مثنوی گلزار نسیم تھا جو ماہنامہ 'مومن' بدایوں کے جنوری 1956 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں شامل چھے مضامین تنقیدی ہیں۔ پانچ تحقیقی موضوعات کے تحت آتے ہیں۔ چار مضامین کو شخصی تحقیق کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

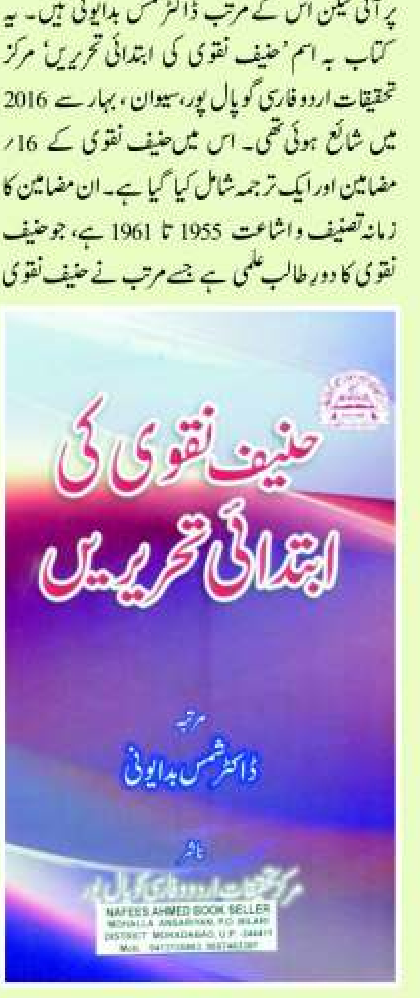

اس طرح یہ کتاب نقوی صاحب کے ادبی سفر کے دور اول کے ان کے اسلوب اور تلاش و تحقیق کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتی ہے۔ مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(1) نسیم اور ان کی مثنوی (2) غالب کے خطوط کی نفسیات (3) اردو زبان و ادب اور حالی (4) مومن اردو کا بے نظیر غزل گو (5) مثنوی کید فرنگ (6) لکھنؤ اور غزل کی روایات (7) چند قدیم خطوط (8) بعض روایات کا غلط انتساب مزید چار قسطیں (9,10,11,12,13) یادرفتگاں، تسلیم سہسوانی (14) صابر حسین صبا (15) اعجاز احمد معجز (16) منشی عبدالعزیز اعجاز (17) بہادر شاہ ظفر۔

شمس بدایونی نے کتاب کے آغاز میں ایک مقدمہ لکھا ہے اور مضامین پر جگہ جگہ حواشی بھی دیے ہیں۔ آخر میں حنیف نقوی کے جملہ کام کا اشاریہ بھی شامل ہے جو 2014 میں مرتب کیا گیا تھا۔

کتاب کے آخر میں حنیف نقوی کے پہلے اور دوسرے مضمون کا ابتدائی متن (اصلاح استاد سے پیشتر) بھی دیا گیا ہے۔ مرتب نے اس کتاب کا انتساب اپنے تین ادبی دوستوں کے نام کیا ہے جن میں سرفہرست نام ظفر احمد صدیقی مرحوم کا ہے۔

حرف آخر کے طور پر یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ حنیف نقوی کی وفات کے بعد ان کی تین کتب تحقیق و تعارف (2013)، غالب کے فارسی خطوط (2015)، تذکرے اور تبصرے (2018)، میرے رفیق سفر پروفیسر ظفر احمد صدیقی (متوفی 2020) کی کوششوں سے ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزر کر نقوی صاحب کی مطبوعات میں اضافے کا موجب بنیں۔ 2016 میں ایک کتاب حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں ظفر صاحب کے دوست ڈاکٹر شمس بدایونی کی کوشش سے منظر عام پر آئی۔ کسی محقق کی ابتدائی تحریروں کی تدوین کی غالباً یہ پہلی روایت ہے۔ اپنے بزرگوں کی تحریروں کو محفوظ کرنے اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا یہ عمل بہرحال قابل ستائش ہے۔

■

Dr. Sanjeeda Khatoon
Asst. Prof. Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

اسلوب احمد انصاری بحیثیت غالب اور اقبال شناس

شاکر علی صدیقی

اسلوب احمد انصاری (1925-2016) شاعری تنقید کے ایک ممتاز ناقد ہیں۔ ان کے دو خاص شاعر غالب اور اقبال ہیں جن پر انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ ان دونوں کے فکروفن کا مختلف جہتوں سے تجزیاتی مطالعہ کرکے صحت مند عملی تنقید کی نادر مثالیں پیش کی ہیں۔ انھوں نے غالب پر 'نقش غالب (1970)'، 'نقش ہائے رنگ رنگ (1998)' لکھیں، اور 'غالب: جدید تنقیدی تناظرات (2004)' مرتب کی، اس میں غالب پر ان کے دو مضامین شامل ہیں۔ 'غزل تنقید کے چند نمونے 2013' میں غالب کی چھ غزلوں کے تجزیے کیے ہیں، اسی طرح ان کی ترتیب شدہ کتاب 'نذر منظور' میں پانچ مضامین غالب کے فکروفن سے متعلق ہیں اور تین غزلوں کے تجزیے بھی شامل مجموعہ ہیں۔ انھوں نے غالب پر مبنی اپنے بیشتر مضامین کو 'نقش ہائے رنگ رنگ' اور 'غزل تنقید کے چند نمونے' میں یکجا کردیا ہے۔ نقش ہائے رنگ رنگ میں سولہ مضامین شامل ہیں۔ شاعری کی عملی تنقید کے لحاظ سے بطور خاص 'غالب کی شاعری میں استعارے کا عمل، غالب: استفہام کی شاعری، غالب اور اقبال: مشترکہ شعری محرکات، کلام غالب کا ایک رخ' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ 'غالب کا فن، مثنوی ابر گہر بار کا ایک پہلو، مومن اور غالب: نکتہ سنجی کے دو انداز، غالب کی شاعری میں شعلے کا رمز، دو غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ، اور 'غزل تنقید' میں شامل غزلوں کے تجزیے' ان کے ایسے مضامین ہیں جو اپنی بصیرت اور معنی انشراح کے باعث عملی تنقید کے مثالی نمونے کہے جا سکتے ہیں جس کے چند حوالے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کی اطلاقی تنقید کی بنیادی خوبی ہے کہ وہ اول فن پاروں کے مطالعے میں سیاق وسباق کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اسی روشنی میں متن کی قرات انجام دے کر ہر ممکن تفہیم وتعبیر اور تعین قدر کرتے ہیں۔ انھوں نے غالب کے مختلف پہلوؤں مثلاً شخصیت، اس دور کی سیاسی اور سماجی صورت حال، ان کے فلسفیانہ تصورات کو موضوع بحث بنا کر ان کے شاعرانہ امتیازات، تجربات اور شعری خواص کے سرچشموں کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس کا بین ثبوت ہمیں 'نقش ہائے رنگ رنگ' کے متعدد مضامین اور نقش غالب کے دو مضمون 'کلام غالب کا ایک رخ، اور غالب کا فن' سے ملتا ہے۔ بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ ہو کہ کس طرح انھوں نے اپنے مباحث کو اشعار کی پیش کش سے مبرہن کرتے ہوئے غالب کی شاعری کے متعلق معنی خیز نتیجہ برآمد کیا ہے:

''غالب کا کلام ہند مغل تمدن کی روح کا عکس پیش کرتا ہے۔ ان کے یہاں ہمیں انسان کی عظمت کا احساس، زندگی میں نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ، قوی اور معنی خیز احساسات کو اظہار بیان میں لانے کی کوشش اور کائنات کی دل فریب اور دل کش اشیا سے لطف اندوز ہونے کی حرص پوری طرح نظر آتی ہے۔ .... ان کی شاعری کا لہجہ مائل بہ امید آفرینی ہے، کیونکہ ایک طرف تو ان کے مزاج میں وہ توازن اور حساس مزاج تھا، جو زندگی کے گرم وسرد اور سخت وست کو ہموار کرسکتا ہے، اور دوسری طرف قبولیت کی وہ استعداد، ضبط کا وہ جوہر اور عینیت پسندی کا وہ سہارا تھا، جو ایک نئے آدم کے ظہور کا منتظر رہتا ہے، زندگی کی نئی تشکیل کو اپنا سکتا ہے اور فضا کی اداسی اور افسردگی سے امید کی کرنوں کو چھین سکتا ہے۔ .... غالب کے یہاں ہمیں جدید ذہن کا بڑا کامیاب نمونہ ملتا ہے۔ اس ذہن کی خصوصیات، اس کی ندرت، پیچیدگی، ذہنی اور جذباتی کشاکش کے باوجود توازن، وحدت اور ترتیب قائم کرنے کی طرف میلان کا پایا جانا ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک ذہنی بیداری اور چوکنا پن نظر آتا ہے۔''

(اسلوب احمد انصاری: نقش غالب، دہلی: غالب اکادمی 1970، ص 34-33)

ان کا خیال ہے کہ ابھی تک غالب کے تفوق و برتری کا واحد معیار لسانیاتی ہنرمندی اور حسن وخوبی کو تصور کیا جاتا رہا ہے اور مسلکہ خوبی مضمون آفرینی اور جدت طرازی کو کلام کا تمغۂ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے، لیکن:

''حرف ومعنی کا اندرونی طور پر جو گہرا رشتہ ہے اور شاعری کا استعاراتی اسٹرکچر جس طرح زندگی اور زمانے میں شاعر کی بصیرت کو ملفوف رکھتا ہے اور شعری اظہاریت کے شیون جتنے انگنت اور متنوع ہیں، یہ سب نظروں سے اوجھل رہے۔''

(اسلوب احمد انصاری: نقش ہائے رنگ رنگ، پیش لفظ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی 1988، ص 4)

اسی دیباچے میں آگے انہوں نے غالب کی عظمت کا کلیدی عنصر ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''ان کا ذہن ہر طرح کے تصورات اور ایقانات کے لیے ایک شاہراہ عام ہے۔ ان کی شاعری میں انسان اور کائنات کا ایک کلی یعنی Total امیج ملتا ہے۔ ایک ایسی یکتا تصویر جسے تخیل کی آنکھ دیکھ سکتی اور اسے خوش آمدید کہہ سکتی ہے۔ وہ صرف رنگ تماشا باختن ہی کے قائل نہیں ہیں، زندگی کی آگہی اور عرفان کے بھی طلبگار نظر آتے ہیں۔ شیکسپیئر کی طرح آفاقیت اور ہمہ گیری ان کی شاعری کے متن پر جلی حروف کی طرح نمایاں ہیں۔ نادر جمالیاتی قدریں ان کی بڑائی کا واحد اور ممتاز عنصر ہے۔'' (ایضاً، ص 6)

اسلوب احمد انصاری نے اپنے مخصوص تنقیدی شعور کی کارفرمائی سے کلام غالب کی توضیح میں محاسن شعری کو بطور خاص اپنے تجزیے کا مرکز بنایا ہے اور ان تمام فنی خوبیوں کی نشان دہی کی ہے جن کے باعث غالب کی تخلیقی قوت، تخلیقی ندرت، اور انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ مثلاً انھوں نے غالب کے شعری پیکروں پر تفصیلی بحث

کرکے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ غالب کے کلام میں شعری پیکروں کی کثرت پائی جاتی ہے، جن کا زیادہ تر تعلق حس باصرہ اور حس سامع سے ہے، جن میں انتہائی موزونیت، دلکشی اور اشاریت موجود ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''غالب جس قسم کے حسی پیکروں کی طرف مائل ہیں، وہ بصری، سماعی اور حرکی ہیں۔ اور یہ سب انھیں تجربے کے انضباط میں مدد پہنچاتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر آنکھ، دل، آئینہ، تماشہ، شوق، وحشت، جنوں، تمنا، دشت اور صحرا کے پیکر ہماری توجہ کو بار بار اپنی طرف کھینچتے ہیں۔''

(ایضاً، ص 70)

اسلوب احمد انصاری کے مذکورہ خیال کی اب عملی دلیل بھی دیکھیے، غالب کی ایک غزل جس کا مطلع

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

کے پانچویں شعر

شورِ تمثال ہے کس رشکِ چمن کا یا رب
آئینہ بیضۂ بلبل نظر آتا ہے مجھے

کا تجزیہ ملاحظہ ہو

''غالب نے 'بیضۂ قمری' (کو اسی غزل کے پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی میں باندھا ہے۔) اور 'بیضۂ بلبل' کے علاوہ 'بیضۂ طوطی' اور 'بیضۂ طاؤس' جیسی تراکیب بھی مختلف سیاق و سباق میں استعمال کی ہیں اور وہ کافی معنویت رکھتی ہیں۔ یہ محض آرائش سخن کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ شورِ تمثال کی ترکیب فوراً توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے کہ شورِ تمثال سے رشکِ چمن محبوب کی انفرادیت اور طرح داری کا غلغلہ بلند ہوتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ شاعر کا ذہن شورِ تمثال کو جس میں ایک سماعی پیکر استعمال کیا گیا ہے رشکِ چمن سے جس میں تمام تر ایک بصری امیج لایا گیا ہے، منسلک اور متعلق کر دیتا ہے۔ رشکِ چمن میں حسن، تازگی اور دلکشی کے گوناگوں تلازمات شامل ہیں جنھیں الگ الگ بین کے بجائے واحد اور روشن نقش میں ڈھال دیا گیا ہے۔''

(اسلوب احمد انصاری: غزل تنقید کے چند نمونے، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2013، ص 80)

اسی طرح انھوں نے 'غالب کی شاعری میں استعارے کا عمل' کے ضمن میں غالب کی استعارہ سازی پر جو سیر حاصل عملی بحث کی ہے وہ ان کے پختہ شعور کی عمدہ مثال ہے۔ جب وہ استعارے کے بنیادی عوامل اور اس کی قوت کی نشان دہی اور اس کے مختلف النوع طرق کی مثالیں غالب کے کلام سے اخذ کرتے ہیں، تو اس وقت اس کا علم ہوتا ہے کہ غالب نے کائنات کے پھیلاؤ اور اس کی وسعت کو اپنے استعاروں کے ذریعے کس قدر سمیٹا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ شعر

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

کے استعاراتی نظام کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''یہاں استعارہ مخفی یعنی Implicit ہے لیکن ایک پوری کیفیت کی نقش گری اس کے باوجود کر دی گئی ہے۔ پہلے مصرعے میں عیش و نشاط کی فراوانی کے لیے موجِ رنگ کا طوفان بہت معنی خیز استعارہ ہے اور دوسرے میں عاشق کے اندرون میں جلن اور تڑپ کے لیے 'سوختن کا باب' میں سوچنے اور غور کرنے کے لیے بہت گنجائش ہے یعنی وہ مقام ہے جہاں پیکر نگاری اندرونی ارتکاز یعنی Concentration کی وجہ سے استعارے میں بدل گئی ہے۔''

(اسلوب احمد انصاری: نقش ہائے رنگ رنگ، پیش لفظ، غالب اکادمی، 1998، ص 122)

یا اسی طرح غالب کا یہ مشہور شعر دیکھیے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس شعر میں کس ہنرمندی سے غالب نے استعارے کے التزام سے اپنے مفہوم کو ادا کیا ہے، اس کی توضیح اسلوب صاحب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''یہاں عمر کے لیے رخش کا استعارہ لائق توجہ ہے۔ اسی سے ملتا جلتا استعارہ حکیم افلاطون کے یہاں ملتا ہے۔ دوسرا مصرع بہت صاف ہے لیکن پہلے مصرعے میں مرکوز استعارے سے مربوط ہے۔ اور اس پورے شعر میں وقت کی برق رفتاری اور سیماب پائی کو بڑی ہنرمندی اور بہ غایت سہولت اظہار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔''

(ایضاً، ص 127)

غالب تنقید میں ان کا خاص طریق کار یہ رہا کہ انھوں نے متن کے عمیق اور تجزیاتی مطالعے کے ذریعے ان کے شعری خواص پر زیادہ تر توجہ صرف کی ہے، انھوں نے محض شارح کی حیثیت سے فن پارے کی تفہیم و توضیح میں محاسن شعری کی نشان دہی تک ہی اپنے کو محدود نہیں رکھا، بلکہ مجرد تصورات کے ماخذ و مصدر کی بازیافت سے ادبی شہ پاروں کی نئی قرأت کا عمل انجام دیا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ شعر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

دیکھیے! اس میں انھوں نے تصورات کے ماخذ کو اساس بنا کر ایک نئی قرأت کے ذریعے معنی برآمد کرنے کی کوشش کی ہے:

''اس شعر میں ہمیں اپنے قیاس کی محکم بنیاد مل جاتی ہے، جس کا شروع ہی میں ذکر کیا گیا تھا، یعنی غالب کے تحت الشعور میں زرتشتیوں کے اس عقیدے کا جاگزیں ہونا کہ ہر شئے کی فطرت اور نہج آتش پر رکھی گئی ہے۔ 'نالہ ہائے شرر بار' کا سرزد ہونا تو محبت کے شدید داخلی تجربے کا حتمی انعکاس ہے، اور اس سے وہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، جس کا ذکر شعر کے پہلے مصرعے میں کیا گیا تھا۔''

(ایضاً، ص 312)

بحیثیت مجموعی غالب تنقید میں اسلوب صاحب نے متن کا عمیق تجزیہ اور دور رس انسلاکات کی تشریحات میں جس سنجیدگی اور دقت نظری کا ثبوت فراہم کیا ہے، وہ ان کے وسیع مطالعے اور تنقیدی شعور کی پختگی کا مرہون منت ہے۔

اسی طرح اسلوب احمد کا خاص الخاص موضوع اقبال ہے۔ وہ ناقد اقبال ہی نہیں بلکہ پرستار اقبال بھی ہیں۔ اقبال پر ان کا پہلا طویل مضمون 'اقبال کا ذہنی ارتقا' جو کم و بیش ستر صفحات کو محیط ہے، 1940 کے آس پاس منظر عام پر آیا۔ وہ 1940 سے 2016 تک مسلسل اقبال کو پڑھتے اور پرکھتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی متعدد کتابیں مثلاً اقبال کی تیرہ نظمیں (1977)، Iqbal: Essays and Studies (1978)، نقش اقبال (1979)، اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں (1994)، اقبال حرف و معنی (1998)، اقبال: جدید تنقیدی تناظرات (2005) اور نذر منظور (جس میں ان کے چھ مضامین شامل ہیں) منظر عام پر آئے۔ یہ تمام سرمایے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہیں اور یہی ان کی شاعری تنقید کے دائرے کا مرکزی نقطہ بھی ہے، جس میں اقبال کی تمام جہات کا تجزیاتی مطالعہ کرکے عملی تنقید کی فقید النظیر مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

انھوں نے اقبال پر جو بھی کام کیا ہے وہ تجزیاتی، استدلالی، اور معروضاتی نوعیت کا ہے۔ مثلاً انھوں نے 'اقبال کی تیرہ نظمیں' یا بعد میں 'اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں' کے عنوان سے نظموں اور غزلوں کا دقت نظری سے تجزیاتی مطالعہ کیا ہے، بنتیجہ سولہ نظموں میں 'تسخیر فطرت، تنہائی، شبنم' کو اساطیری زمرے میں رکھ کر، اور فلسفیانہ نظموں کے ضمن میں 'ارتقا، اور والدہ مرحومہ کی یاد میں' رکھ کر اپنے تجزیے کا موضوع بنایا ہے۔ نیز خضر راہ، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ، لالہ صحرا، مسعود مرحوم، لا الہ الا اللہ، ابلیس کی مجلس شوری، شعاع امید، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام نظمیں بھی شامل تجزیہ ہیں۔ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان تمام نظموں اور مشمولہ دس غزلوں کے فکر و فن کی ہم آہنگی کو غیر معمولی طور پر اپنے تجزیاتی مراحل سے گزار کر اقبال فہمی کے نئے پہلو روشن کیے ہیں۔ مثلاً وہ اقبال کی نظم 'شبنم' کے تجزیاتی مطالعے سے ابھرنے والے تاثر کو مجموعی طور پر یوں پیش کرتے ہیں:

''اقبال کی اس انوکھی اسطوری نظم میں دو مرکزی کردار 'شبنم' اور 'گل' ہیں، جن کے جوابی تاثر اس صورت حال کے بارے میں، جس سے وہ دو چار ہیں، قابل توجہ ہیں۔ شبنم روح انسانی کا رمز ہے۔ جو عالم بالا سے عالم سفلی کی طرف رخ کرتی ہے۔ لیکن بالآخر یہاں سے مراجعت کرنے پر مصر نظر آتی ہے۔ اور اپنی اس خواہش اور اس امکان سے کبھی بھی غافل نہیں رہتی۔ گل اسی مادی کائنات میں پیوست ہے۔ اور اسی سے برآمد ہوا ہے، اور مادی کائنات اور جسم انسانی کا رمز ہے۔ شبنم کے لیے ذوق جدائی، اور گل کے لیے ذوق نمود، بالترتیب اہم محرکات ہیں۔ جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اول الذکر کے لیے چکیدی، اور موخر الذکر کے لیے دمیدی جیسے کلیدی افعال لائے گئے ہیں۔''

(اسلوب احمد انصاری: اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، غالب اکادمی، دہلی، 1994، ص40)

اسی طرح وہ اقبال کے آخری دور کی مشہور نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کا تجزیہ اس کے پورے سیاق و سباق کی روشنی میں کرتے ہیں اور فن پارے کی فکری اور فنی ہم آہنگی کو بڑی شرح وبسط سے زیر بحث لا کر اس کے استعاراتی بیان کی توضیح سے متن فہمی کی مشکل گرہیں وا کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ اقبال کے ان دو شعروں۔

کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں
کون کر سکتا ہے اس نخل کہن کو سرنگوں

کو زیر بحث لا کر جب 'آتش سوزاں' اور 'نخل کہن' کی تراکیب کی وضاحت کرتے ہیں، تو وہ قابل دید ہے:

'''نخل کہن' کی ترکیب غور طلب ہے، یہ اشاریہ ہے، شر اور فساد کی قوتوں کا، اور اس کی شاخوں کی بلندی اور ان کا پھیلاؤ، شر اور خطا کے عناصر کے ہر سمت بڑھنے، وسعت اختیار کرنے اور ابرومند ہونے کے مترادف ہے۔ 'آتش سوزاں' کا بھڑکتے رہنا اور ظلم و جہل کے نخل کا برگ و بار لانا، دونوں اندرونی طور پر فساد کی قوتوں کی افزونی اور شادابی کا استعارہ ہیں۔'' (ایضاً، ص 95-194)

ایک مثال اسلوب احمد انصاری کی غزل تنقید سے بھی ملاحظہ ہو، اقبال کی ایک مشہور غزل جس کا مطلع۔

اک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی، حیرت کی فراوانی

اور آخری شعر۔

تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

اس غزل میں کل سات شعر ہیں، جس کا بالتفصیل جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے اقبال کے تصورات کو متن کے فنی توسل سے مربوط کر کے بحیثیت مجموعی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''یہ غزل اقبال کے بعض اہم تصورات کی آئینہ بندی کرتی ہے۔ اس میں تین عناصر خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اول ایک طرح کی صوتی گونج جو پہلے شعر سے لے کر آخری شعر تک سنائی دیتی رہتی ہے۔ پہلے شعر کے پہلے مصرعے: 'اک دانش نورانی، اک دانش برہانی' سے لے کر آخری شعر کے آخری مصرعے 'دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی' تک تمام اشعار غزل کے مخصوص آہنگ کو حس سماعت پر مرتکز رکھتے ہیں اور اس آہنگ کی چوٹ ذہن کے سندان پر برابر پڑتی رہتی ہے۔ دوسرے ایک طرح کے استفہام یعنی Interrogation کا انداز جو اقبال کی ان بیشتر غزلوں میں نظر آتا ہے جن میں خدا سے براہ راست خطاب کیا گیا ہے، جو ان کی جرات گفتار پر بھی دال ہے۔ .... تیسرے طنز کے عنصر کی کارفرمائی جس کی لطافت، تلخی اور برش ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک کھلا ہوا چیلنج بھی ہے، اور عائیت کا اظہار بھی اور چشم و ابرو کے تیکھے اشارے بھی۔''

(اسلوب احمد انصاری: غزل تنقید کے چند نمونے، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ 2013، ص194)

انھوں نے اپنے بیشتر تجزیوں میں نظموں کی ساخت اور اس کے داخلی آہنگ کی مضبوط گرفت کے ذریعے متن کی پیچیدگی کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان میں فکری، اور فلسفیانہ پہلوؤں کے ساتھ اقبال کے تخلیقی سرچشموں کی بھی وضاحت کی ہے، یعنی انھوں نے قوت متخیلہ کی کارفرمائی، اساطیری کیفیت کے اسرار، تمثال آفرینی کی جاذبیت، استعارہ سازی کی معنویت کو جمالیاتی وحدت میں پرو کر اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں اقبال کی نظموں کی فکری اور فنی تکمیلیت کا عمیق نقش منعکس ہوتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری کے نزدیک اقبال کی تفہیم و تعبیر کے لیے اسلامی تعلیمات اور افکار و خیالات کی معلومات ناگزیر ہے، قرآنی تعلیمات اور اسلامی افکار کی چشم پوشی سے اقبال کی تفہیم اور شاعرانہ عظمت تک رسائی ناممکن ہے۔ کیونکہ ان کے کلام میں متصوفانہ وجودی تجربات اور مابعد الطبیعیاتی عناصر مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اقبال کے تجزیاتی اور تشریحاتی مطالعے میں قرآنی تصورات کا جواز فراہم کر کے اسی کو عرفان و آگہی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں اور یہی نہیں، بلکہ اپنے دعویٰ کو مدلل و مبرہن کرنے کے لیے دانتے، ملٹن، بلیک، ایلیٹ اور ایسے دیگر شعرا کا حوالہ پیش کرتے ہیں، جن کے مذہبی وژن اور شعور نے ان کی شاعرانہ عظمت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ایک دو مثال ملاحظہ ہوں، مثلاً اقبال کے اس شعر۔

کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا
فریب سود و زیاں لا الہٰ الااللہ

کے مصدر و منبع کے متعلق لکھتے ہیں۔

''(اس شعر) کا مصدر و منبع سورۃ آل عمران اور سورۃ الحدید کی یہ آیت معلوم ہوتی ہے: 'وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور' یہ اضافہ کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ متاع غرور کی ترکیب قران میں کئی بار استعمال کی گئی ہے۔'' (اسلوب احمد انصاری، اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، غالب اکادمی، 1994 دہلی، ص168)

وہ اقبال کے متن کا مطالعہ اس کے مسلکہ اسلامی نظام اور تصورات کی روشنی میں انجام دیتے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے ترجیحاتی تناظر اور تخصیصاتی تفوق کا براہ راست رشتہ قرآن و حدیث سے مربوط کر کے فن پارے کا تفہیمی عمل انجام دیا ہے۔ جس کو بطور خاص ان کے مضامین 'اقبال کے ہاں تصورات کی شاعری' اور 'اقبال کا تصور فقر' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بہرکیف بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن پارے کے مسلکہ سیاق و سباق پر گہری نظر مرتکز کر کے فن پارے کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں اور متن فہمی کی روایتی اساس سے گریز کر کے وہ معنی / مفہوم / تعبیر / تقدیر اخذ کرتے ہیں جو معروضی اصول نقد شعر سے عبارت ہے۔ قرأت شعر سے برآمد ہونے والے مفہوم کی اساس خارجی حوالوں کے بجائے داخلی حوالوں پر منضبط ہونے کے باعث ان کا تنقیدی رویہ سائنٹفک اور استدلالی ہے۔ انھوں نے عموی طور پر تنقید کو اخلاقی اور جمالیاتی قدروں کے امتزاج کا روشن پہلو تصور کیا ہے۔ ان کے یہاں ادب کے ہمہ جہت تفاعل اور فکر و فن کی تخلیقی آمیزش کا حوالہ شعر و ادب کی معیار بندی میں کارفرما ہے اور یہ امتیاز کہ ان کا طریق کار تجزیاتی ہے اور تجزیاتی مطالعے کی اساس مشاہداتی اور معروضاتی ہے۔ جس کا ثبوت ہمیں شاعری تنقید میں غالب، اقبال، شاذ تمکنت، فراق، مجاز، حسرت، فانی اور بعض دیگر فن پاروں کے تجزیاتی مطالعے اور تقدیری فیصلوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا یہی اختصاصی رویہ شاعری کی تنقید کے دیگر ناقدین سے انھیں ممتاز کرتا ہے۔

■

Dr. Shakir Ali Siddiqui
715/15, Near Sunni Jama Masjid
Loha Khan Ajmer - 305001 (Rajasthan)
Email.: asiddiqui18@gmail.com
Mob.: 9891579220

بہت سے دلوں میں ہے اردو سیکھنے کی چاہت

صالحہ صدیقی

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: کسی بھی زبان کی موت تو نہیں ہوتی لیکن ہاں عوام سے ان کا رشتہ منقطع ہونے یا سماج میں بول چال، تحریر و تدریس میں اس زبان کا استعمال کم ہوجانے کے سبب وہ صرف کتابوں یا تاریخ کا حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ہندستان میں اس کی مثال سنسکرت زبان ہے۔ مشکل ترین بنا کر ایک خاص طبقے تک محدود کردینے کے سبب اس کا رشتہ عوام سے منقطع ہو گیا نتیجتاً سنسکرت زبان ہندستان میں جو کسی زمانے میں بول چال، درس و تدریس کی زبان تھی آج لائبریریوں تک سمٹ کر رہ گئی۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ عوام سے زبان کا رشتہ ہونے کے ساتھ وہ زبان آسان و سلیس ہو۔ اس میں نئی تبدیلیوں کو اپنانے کی سکت ہو۔

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: کوئی بھی زبان ان لوگوں میں زندہ رہتی ہے جو انھیں تہذیب و ثقافت کا حصہ بناتے ہیں، نئی تبدیلیوں کے ساتھ، نئی سرگرمیوں کے ساتھ اپناتے ہیں، انھیں درس و تدریس کے ساتھ آنے والی نسلوں کو اس زبان سے متعارف کراتے ہیں انھیں اس زبان سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ سب سے اہم بات کہ عوام سے اس کا رشتہ قائم و دائم رہے۔ ساتھ ہی زبانوں کی ترقی کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں قائم کریں جیسے فلاحی تنظیمیں اور اشاعتی ادارے۔ آج کا عہد ٹکنالوجی کا ہے اس لیے زبانوں کو نئی نسلوں سے جوڑنے اور عالمی سطح پر لوگوں سے اس زبان کو متعارف کرانے کے لیے کام کیا جانا چاہیے۔

سوال: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: زبان تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کا اہم جز ہے۔ جس سماج میں جو زبان بولی جاتی ہے وہاں کی تاریخ اسی زبان میں رقم ہوتی ہے۔ کھانا، پینا، رہنا، سہنا، آرٹ، کلچر سبھی کچھ اسی زبان میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس قوم کی شعوری، جذباتی، ذہنی، سماجی، ثقافتی، معاشرتی ترقی کا زبان وسیلہ ہوتی ہے۔

سوال: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: بالکل! جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا زبان کا عوام اور اس کی تہذیب و ثقافت سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ کوئی بھی انسانی تاریخ اور تہذیبی ورثہ زبان میں ہی محفوظ ہوتا ہے، اس لحاظ سے اگر زبان پر آنچ آئے گی تو انسانی وراثت بھی محفوظ نہیں رہے گی۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: جی بالکل! لیکن بنیادی بات میں یہ کہوں گی کہ اگر زبان درس و تدریس، عوام اور اس کی تہذیب و ثقافت سے جڑی ہے تو ظاہر ہے مذکورہ مواد الگ نہیں، بلکہ یہ بنیادی مواد زبان کا اہم حصہ ہے۔ جس کو نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا اور اگر اس کی کمی ہے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ زبان ترقی نہیں کر رہی بلکہ سمٹ کر رہ گئی ہے۔

سوال: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: آنے والی نسلوں کو اس زبان سے جوڑنے میں ناکامی، ان میں اس زبان سے محبت نہ پیدا کر پانے کی ناکامی، گھر میں اردو پڑھنے لکھنے کا رواج ختم ہونا، ان کے نصاب میں اس زبان کا شامل نہ ہونا، اردو رسائل و جرائد کا گھروں میں آنا بند ہونا، ٹکنالوجی سے جوڑنے میں ناکامی، بڑھتی بے روزگاری، نئے مواقع، نئی سوچ، نئے روزگار پیدا نہ کر پانے کی ناکامی وہ بنیادی مسائل ہیں جس پر وقت رہتے کام نہ کیا گیا تو یقیناً یہ زبان خطرے میں ہوگی۔

سوال: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: تبدیلی ترقی کا زینہ بھی ہے اور خطرہ بھی۔ ہر نئی چیز اپنے ساتھ مثبت و منفی دونوں اثرات ساتھ لاتی ہے۔ اردو کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات شیشے کی طرح صاف نظر آتی ہے کہ اردو ہمیشہ عوام میں پلی بڑھی، ہمیشہ نئے الفاظ خود میں سموئے، یہ بھی یاد رہے کہ مختلف زبانوں کے میل جول سے ہی اردو زبان بنی۔ ظاہر ہے یہ سلسلہ نہ رکا تھا اور نہ رکنے والا ہے۔ آج کی نسل بھی سوشل میڈیا پر زبانوں میں نئی تبدیلیوں کے ساتھ شعر و شاعری میں نئے رجحانات کو جنم دے رہی ہے۔ جس کے سبب اردو میں بھی بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں اب اردو کی وہ صورت آج نہیں جو پچاس سال پہلے تھی اور پچاس سال بعد وہ بھی نہیں رہے گی جو آج ہے۔ اس لحاظ سے میں بس یہی کہنا چاہتی ہوں کہ نہ تو اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے اور نہ شکل بگڑ رہی ہے بلکہ اردو اسی چہرے کو اپنا رہی ہے جس صورت میں اسے آنے والی نسل دیکھنا چاہتی ہیں۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: ان شاء اللہ اردو ہمیشہ پھلتی پھولتی، نئے نئے

چہرے بدلتی عوام میں زندہ رہے گی، ہمیشہ روشن و تابناک مستقبل بھی رہے گی بس ہمیں انھیں مسائل کی طرف سنجیدگی سے سوچنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے جن کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ کیونکہ "آج جو کچھ بوؤگے کاٹوگے کل"۔ یہ زبان عوام کی تھی عوام نے اسے پروان چڑھایا اس لیے عوام میں ہمیشہ بنی رہے اس کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

جواب: اس سوال کے جواب میں وہی باتیں کہوں گی جو خطرات کے ضمن میں کہی ہیں، ساتھ ہی یہ بھی کہ اس میں بنیادی رول اسکول کالجز، یونیورسٹیز اور اردو کی تنظیمیں ادا کر سکتی ہیں۔ اساتذہ اور پروفیسر حضرات کی بڑی ذمے داری بنتی ہے کہ زبان کے حوالے سے ہونے والے بگاڑ پر طلبہ کے ساتھ عوام میں بھی رسائل و جرائد میں مقالے کے ذریعے انھیں آگاہ کریں اور صحیح زبان بولنے اور لکھنے کے طریقے پر مدلل مقالے لکھیں۔ ساتھ ہی اردو تنظیمیں اس سلسلے میں فری ورکشاپ، سیمینارس، کانفرنس کا انعقاد کر کے چھوٹے بڑے ہر سطح پر نہ صرف مسائل پر غور کریں بلکہ انھیں سدھارنے کا عملی کارنامہ بھی انجام دیں۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر بھی ان بگاڑ کے بارے میں آگاہ کیا جانا چاہیے تاکہ اردو سے محبت کرنے والے اس سے سیکھ سکیں اور بگاڑ کو روکا جا سکے۔

سوال: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: بہت اچھا اور بنیادی سوال آپ نے پوچھا، اس سوال میں اردو زبان کے بگاڑ اور خطرات کی اہم وجہ کا جواب بھی پوشیدہ ہے۔ افسوس کہ آج یہی صورت حال اردو تنظیموں، رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ اسکول کالج ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ آج اردو میں بڑے بڑے فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو تو مل جائے گی لیکن طلبہ و طالبات بعض دفعہ نئے مقرر ہوئے اساتذہ بھی اردو زبان کی باریکیاں، قواعد، شعر و ادب کے علوم فنون سے نا واقف ہوتے ہیں۔ آج 99 فیصد گفتگو ادب پر کی جاتی ہے مضامین بھی رسائل و جرائد میں شعر و ادب پر بھرے پڑے ہیں۔ کتابیں بھی لاتعداد لکھی جا رہی ہیں، لیکن افسوس زبان پر کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ اس کا اثر صاف طور پر آج کے ادب کے معیار پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر زبان درست نہیں ہے تو ادب پر گرفت کی اور اس کے بیان میں درستگی کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: یہ بہت اہم سوال آپ نے پوچھا۔ میرا تعلق الہ آباد سے ہے یہاں اردو کے 9 کالجس ہیں جو الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق ہیں جن میں شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، ایونگ کرسچن کالج کے۔ ایس۔ ساکیت پی جی کالج، بال گووند پٹیل اسمارک ڈگری کالج، الہ آباد ڈگری کالج، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، محمد شامی گرلس ڈگری کالج، سامداریہ بالیکا مہا ودیالیہ، چودھری مہادیو پرشاد ڈگری کالج، اترپردیش راج شری ٹنڈن اوپن یونیورسٹی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹیٹ کالج میں رجو بھیا کالج وغیرہ۔ یہاں کے انجینئرنگ کالج میں اردو زبان ہے۔ یہاں تقریباً بیس اسکولوں میں اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں کے کرسچن اسکول جیسے میری وانا میکر گرلس انٹر کالج وغیرہ میں بھی اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ الہ آباد میں اردو اسکولوں اور کالجوں کی کوئی کمی نہیں، لیکن افسوس کہ ان میں اساتذہ کی بہت کمی ہے۔ لمبے وقت سے تقرری یا بحالی نہ ہونے کے سبب پرانے اساتذہ یا تو ریٹائر ہو چکے ہیں یا ان کے بعد عارضی طور پر (کانٹریکٹ بیس) اساتذہ رکھے جاتے ہیں۔ نئی ویکنسی نہ آنے سے اساتذہ کی بحالی نہ ہونے کے سبب ڈپارٹمنٹ خالی پڑے ہیں۔ بچوں کے سامنے اساتذہ کی قلت کے سبب اردو بحیثیت سبجکٹ لینے میں دشواری ہوتی ہے کیونکہ انھیں پڑھانے والا کوئی نہیں ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب : شہر الہ آباد میں تقریباً گیارہ ایسی لائبریریاں ہیں جہاں اردو کی کتابیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں مثلاً اردو گھر، سینٹرل لائبریری، الہ آباد پبلک لائبریری، ڈپارٹمنٹ آف اردو الہ آباد یونیورسٹی لائبریری، الہ آباد یونیورسٹی سینٹرل لائبریری، بھارتی بھون لائبریری، روضۂ ولی مسجد وغیرہ۔ مندرجہ بالا تمام لائبریریوں میں صرف الہ آباد یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری میں کتابیں اچھی تعداد میں موجود ہیں جہاں سے طلبا و طالبات استفادہ کرتے ہیں لیکن اس لائبریری کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی اردو جاننے والا ان کتابوں کی دیکھ ریکھ کرنے والا موجود نہیں۔ جس کے باعث یہاں بہت بیش قیمتی کتابیں دیمک کی نذر ہو گئی ہیں اور بہت سی کتابیں خستہ حالی کے سبب نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ یہاں کی لائبریری میں ایسے نسخے، مخطوطات اور قدیم مسودے ہیں جو شاید ہی دنیا کی کسی دوسری لائبریری میں دیکھنے کو ملیں، لیکن یہ بیش قیمتی مسودات دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب اپنی آخری سانس

آج اردو میں بڑے بڑے فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو تو مل جائے گی لیکن طلبہ و طالبات بعض دفعہ نئے مقرر ہوئے اساتذہ بھی اردو زبان کی باریکیاں، قواعد، شعر و ادب کے علوم فنون سے نا واقف ہوتے ہیں۔ آج 99 فیصد گفتگو ادب پر کی جاتی ہے مضامین بھی رسائل و جرائد میں شعر و ادب پر بھرے پڑے ہیں۔ کتابیں بھی لا تعداد لکھی جارہی ہیں، لیکن افسوس زبان پر کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ اس کا اثر صاف طور پر آج کے ادب کے معیار پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اگر زبان درست نہیں ہے تو ادب پر گرفت کی اور اس کے بیان میں درستگی کی امید کیونکر کی جاسکتی ہے۔

لے رہے ہیں۔ یہاں کوئی میوزیم بھی نہیں ہے کہ ان قیمتی مسودات کو رکھا جا سکے۔ الہ آباد سینٹرل یونیورسٹی کے علاوہ مذکورہ بالا تمام لائبریریوں میں نہ تو کتابیں ہیں اور نہ طلبا و طالبات یا عام اردو قاری کو انھیں پڑھنے یا دیکھنے کی اجازت۔ اردو کتابوں کے نام پر ان لائبریریوں میں خالی الماریاں ہیں جو دھول مٹی پھانک رہی ہیں۔

رہی بات رسائل و جرائد کی تو یہاں اردو اخبارات مثلاً سہارا اردو، انقلاب وغیرہ مل جاتے ہیں لیکن انھیں پڑھنے والوں کی تعداد محدود ہے۔ یہاں جو جرنل نکلا کرتے تھے اب ان کے نام و نشان تک مٹ چکے ہیں۔ میں جس علاقے میں رہتی ہوں وہاں پورے اشوک نگر پتر کار کالونی میں واحد گھر میرا ہے جہاں اردو اخبار آتا ہے۔ اس لیے ہاکر سے اکثر تکرار ہو جاتی ہے کہ ہفتے میں وہ تین سے چار دن ہی اخبار لاتا ہے پوچھنے پر کہ بھائی آج کا اخبار آپ کیوں نہیں لائے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں میڈم مجھے ایک اخبار کے لیے سول لائنس جانا پڑتا ہے۔ اب آپ خود آگے کی کہانی سمجھ جائیے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

جواب: یہاں کہنے کو تو بہت سی تنظیمیں اور ادارے ہیں مثلاً انجمن اردوئے ادب، اردو گھر، ادب گھر وغیرہ لیکن افسوس کہ ان کی حیثیت بھی برائے نام رہ گئی ہیں۔ مثلاً 1930 میں قائم انجمن اردوئے ادب جسے دوسرے شعبے کے لوگوں نے اردو کے فروغ کے لیے قائم کیا تھا۔ لیکن اردو والے اس کی حفاظت نہ کر سکے اور یہ طویل عرصے سے بند رہا۔ دوبارہ عربی فارسی شعبے کی صدر پروفیسر صالحہ

رشید اور دیگر اردو سے محبت کرنے والی شخصیات کی کوششوں سے اس تنظیم کے بند تالے کو توڑا گیا۔ لیکن افسوس ابھی بھی اردو والے گہری نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔ یہاں کچھ نئی تنظیموں کی بنیاد ڈالی گئی ہیں مثلاً 'ضیائے حق اردو فاؤنڈیشن' جو اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں امید ہے اس تنظیم سے الہ آباد میں نئی روشنی کی کرن پھوٹے گی۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب: یہ سوال بھی آپ کو ناامیدی ہی دے گا۔ مجھے بتاتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن یہاں بھی وہی حال ہے جو لائبریریوں اور اداروں کا ہے۔ الہ آباد میں علمی ادبی، شعری شخصیات کی کوئی کمی نہیں ہیں۔ لیکن افسوس ان کو نہ تو کوئی پلیٹ فارم مل پاتا ہے اور نہ کوئی ان کی خدمات کا اعتراف یا انھیں منظر عام پر لانے میں ان کی مدد کر رہا ہے۔ جس کے سبب یہ شخصیات گوشۂ گمنامی میں جی رہے ہیں۔ جن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں بزرگ، نوجوان دونوں ہی شامل ہیں۔ ان میں بہت شخصیات ایسی بھی ہیں جنھیں لکھنا پڑھنا اور اردو کے تخلیقی ادب سے شغف ہے لیکن انھیں منظر عام پر لانے انھیں عوام تک پہنچانے کی جانکاری نہ ہونے کے سبب ان کی تخلیقات ڈائری کے پنوں میں ہی قید ہو کر رہ گئی ہیں۔ دل تڑپ اٹھتا ہے ان حالات کو دیکھ کر لیکن کرسی پر بیٹھے لوگوں کی آنکھوں پر بندھی پٹی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا اور نہ انھیں فکر کہ کتنا بڑا سرمایہ آنے والی نسلوں سے محروم ہو جائے گا۔ الہ آباد میں بہت سی نامور ہستیاں بھی رہیں جن کی انٹرنیشنل لیول پر پہچان رہی۔ ادارے ان کے ایک اشارے پر خرچ کرنے کو تیار لیکن افسوس کہ انھوں نے بھی ان مسائل کی طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔

سوال: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: میں ابھی خود ایک طالب علم ہوں میری پڑھائی ابھی مکمل ہوئی ہے۔ لیکن شہر الہ آباد میں اردو کی صورت حال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جس کا نتیجہ 'ضیائے حق فاؤنڈیشن' کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ میں اردو کے فروغ کے لیے اپنے آس پاس کے علاقے کے بچوں کو فری اردو کلاسس دیتی ہوں۔ انھیں ہر ماہ کچھ رسالے و اخبارات خرید کر دیتی ہوں تاکہ ان میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ اس کے علاوہ میں کئی سیمنار، مشاعرے، افسانوی نشست کرا چکی ہوں۔ ان سیمنار میں شہر کے ان لوگوں کو میں پڑھنے کے لیے بلاتی ہوں جن کو پلیٹ فارم نہیں مل پاتا۔ ان شاء اللہ آنے والے وقت میں زیادہ سے زیادہ اردو اور ہندی زبانوں کے گمنام شاعر و ادیبوں کو پلیٹ فارم مہیا کرانے کی کوشش ہے۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: چھوٹے بچوں کو گھر گھر میں اردو زبان پڑھائی جائے، بچوں کو اردو رسائل و جرائد سے واقف کرایا جائے۔ جن گھروں میں ماؤں کو اردو زبان نہیں آتی ان کو بھی سکھایا جائے تاکہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کر سکیں۔ آس پاس کے علاقوں میں موجود اسکولوں اور کالجوں میں بحیثیت سبجکٹ اردو پڑھانے کی پہل کی جائے اور جہاں اردو موجود ہے وہاں کوشش کی جائے کی اساتذہ کی کمی نہ ہو اور اچھے استاد رکھے جائیں۔ گھر میں اردو کا ماحول پیدا کیا جائے۔ ادارے عملی سروے کے ذریعے کنفرم کریں کہ کیا ان کے ذریعے بھیجی گئی امداد اردو کی ترقی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کی جا رہی ہیں یا نہیں۔ کیا واقعی اردو کے لیے کام ہو رہا ہے یا نہیں؟ پچھلے چند سالوں کی پروگریس رپورٹ چیک کی جائے تاکہ حالات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے، اور اگر رپورٹ میں جھول ملے یا کام نہیں ہو رہا تو وہاں پر دی جانے والی امداد فوراً روک دی جائے اور خود ایسی تنظیموں کی تشکیل کریں، یا ایسے ٹرسٹ وغیرہ کو یہ ذمے داری سونپی جائے جو سنجیدگی سے زبانوں کی ترقی، فلاح و بہبود کے کام میں لگی ہوں۔

> **آنے والے وقت میں اردو میرے گھر میں زندہ رہے اس کی تیاری میں ابھی سے یہ کرتی ہوں کہ اسکول میں جانے کے ساتھ ہی میں بچوں کو خواہ ان کا سبجکٹ اردو ہو یا نہ ہو اسکول میں پڑھایا جاتا ہو یا نہ ہو میں خود الف۔ب سے شروعات کر دیتی ہوں۔ انھیں لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھاتی ہوں۔**

سوال: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

جواب: علاقائی زبانوں سے اردو زبان کا رشتہ استوار کر کے اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی اردو کی دلکشی، اس زبان کی حلاوت کے سبب بیشتر لوگ اسے سیکھنا اور بولنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اردو کے لفظوں سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ انھیں بولنے کی کوشش کرتے ہیں یہ لوگ ہر علاقے میں مل جائیں گے۔ جو بڑے پر جوش انداز میں اردو سیکھنے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ میں خود اپنے آس پاس کی کئی عورتوں کو اور کئی ہندی زبان سے تعلق رکھنے والے دوستوں کو اردو لفظوں کے معنی اور ہندی لفظوں کا اردو بدل اور نئے الفاظ بتاتی رہتی ہوں اور وہ بہت خوشی سے انھیں سیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی پہل سے بھی اردو کا فروغ ممکن ہیں۔ کوشش چھوٹی ہی سہی مگر اثر انداز ہے۔

سوال: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: جی الحمدللہ! میرے گھر کا تقریباً ہر فرد اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو تو میں خود اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھاتی ہوں۔ اس بات پر مجھے بہت فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں ان بچوں کے لیے کچھ کر پا رہی ہوں۔

سوال: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: جی! ان شاء اللہ ضرور...... آنے والے وقت میں اردو میرے گھر میں زندہ رہے اس کی تیاری میں ابھی سے یہ کرتی ہوں کہ اسکول میں جانے کے ساتھ ہی میں بچوں کو خواہ ان کا سبجکٹ اردو ہو یا نہ ہو اسکول میں پڑھایا جاتا ہو یا نہ ہو میں خود الف، ب سے شروعات کر دیتی ہوں۔ انھیں لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھاتی ہوں۔

سوال: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

جواب: ہندستان میں غیر سرکاری تنظیموں کی بھرمار ہے لیکن صورت حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کہیں پیسے کی کمی ہے تو کہیں صرف نام و نہاد...... شکر ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا جو پورے ہندستان میں اردو کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ورنہ تو میں اس سوال کے جواب میں بس یہی کہہ سکتی ہوں کہ عمل سے زندگی بنتی ہے..... باتوں سے نہیں۔

سوال: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: یہاں بھی وہی حالات ہیں جو اردو لائبریریوں اور تنظیموں کے ہیں۔

■

Dr. Saleha Siddiqui
267/2B, Ward 24
Mohalla Newada
Allahabad - 211001
Mob.:9899972265

پی جی شعبۂ اردو
ایل این ایم یو دربھنگہ کی پیش رفت

امام اعظم

دربھنگہ کی سرزمین آغاز سے ہی علمی و ادبی اعتبار سے مردم خیز رہی ہے اور علم و ادب کا قافلہ ہمیشہ رواں رہا ہے۔ للت نرائن متھلا یونیورسٹی 5/اگست 1972 میں قائم ہوئی اور 21 فروری 1979 میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا تو بجا طور پر یہ توقع کی گئی کہ یہ شعبہ ادبی ماحول سازی میں اہم کردار ادا کرے گا اور ایسا ہوا بھی۔ شعبے کے قیام کے بعد باضابطہ طور پر کمیشن کے ذریعے اولین صدر پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن 18 ستمبر 1981 میں مقرر ہوئے اور یہ شعبے کے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ ان کی باضابطہ تقرری سے قبل پروفیسر محمد کمال الدین نگراں صدر (14 ستمبر 1979 تا 17 1981) تھے۔ پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ اردو کے پروفیسر تھے لیکن ان کی کارگذاریوں کا دائرہ محض اردو زبان تک محدود نہ تھی۔ وہ پرانی قدروں اور ثقافتوں کے امین تھے۔ متھلا کی اپنی ایک الگ تہذیب اور پہچان ہے۔ پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن اس سرزمین سے جڑے ہوئے تھے۔ اور یہاں کے میتھل برہمن، میتھل کلچر اور اردو داں طبقے کے درمیان جو ہم آہنگی تھی اس سے ان کی خاص دلچسپی تھی۔ دربھنگہ کے گرد و نواح میں جو بزرگانِ دین لیٹے ہوئے ہیں ان سے بھی ان کی دلچسپی تھی اور ان بزرگوں سے عقیدت کے باعث ہر مسلک کے لوگوں سے ان کی گفت و شنید ہوتی تھی۔ جغرافیہ ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا اس لیے قدیم دربھنگہ یا متھلا کے دور دراز علاقوں میں پھیلے مدارس و مکاتب، خانقاہیں اور ادبی انجمنیں ان کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ ان روابط نے شعبۂ اردو کو ہر اعتبار سے مستحکم بنیادیں عطا کیں۔ یہاں کی علمی و ادبی خدمات طلبا و طالبات کے ذریعے اور عوام کے توسط سے پھیلنے لگیں اور شعبۂ اردو ایک فعال مرکز کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ آج شعبے کے فارغین ہندوستان کی سرحدوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ بیرون ملک بھی ادبی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ ملک و بیرون ملک شائع ہونے والے رسالوں اور جریدوں میں اگر دربھنگہ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر بطور خاص کیا جاتا ہے تو اس میں بھی شعبے کی خدمات کا بڑا اہم کردار ہے۔ کیوں کہ جدید نسل کے جو افراد ملکی و غیر ملکی منظر نامہ پر اپنی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب ہیں، ان میں سے بیشتر شعبے کے فارغ التحصیل ہیں۔

شعبے کے دیگر صدور پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن مرحوم (یکم اکتوبر 1988 تا 26 جولائی 1991)، پروفیسر محمد طیب صدیقی (27 جولائی 1991 تا 4 نومبر 1992)، پروفیسر ایس اے یحییٰ (شاکر خلیق) (5 نومبر 1992 تا 2 مئی 1994)، پروفیسر محمد طیب صدیقی (3 مئی 1994 تا 4 جولائی 1995)، پروفیسر ایم کمال الدین (5 جولائی 1995 تا 31 مئی 2003)، پروفیسر محمد طیب صدیقی (یکم جون 2003 تا 30 نومبر 2005)، پروفیسر رئیس انور (یکم دسمبر 2005 تا 30 نومبر 2008)، پروفیسر ایس ایم ظفر الاسلام ظفر حبیب (یکم دسمبر 2008 تا 31/اکتوبر 2009)، ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی مرحوم (انچارج -3/نومبر 2009 تا 20 جون 2010)، پروفیسر جمیلہ خاتون مرحومہ (21 جون 2010 تا 4 جولائی 2013)، پروفیسر محمد قیس مرحوم (5 جولائی 2013 تا 30 جون 2014)، پروفیسر حافظ محمد انیس (انیس صدری، یکم جولائی 2014 تا 30 جون 2017)، ڈاکٹر محمد ظفیر الدین انصاری (3 جولائی 2017 تا 31 جنوری 2019)، ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ (یکم فروری 2019 تا 31 دسمبر 2019) اور پروفیسر آفتاب اشرف (یکم جنوری 2020 تا حال) کے علاوہ اساتذہ کرام میں پروفیسر عبدالمنان طرزی (سبکدوش) اور ڈاکٹر محمد ارشد جمیل (مرحوم) کے علمی و تحقیقی کاموں اور ان کی فکری تربیت کے سبب بھی یہاں بہتر ادبی ماحول بن سکا۔ چند دنوں کے لیے پروفیسر عبدالسلام (شعبۂ اردو، چندودھا کالج، دربھنگہ) اور ڈاکٹر عبدالرؤف مرحوم (صدر، شعبۂ اردو، سمستی پور کالج، سمستی پور) نے بھی شعبے کی زینت بڑھائی۔ ان میں سے اول الذکر سبکدوش ہو گئے اور موخر الذکر واپس سمستی پور کالج چلے گئے۔ ڈاکٹر وصی احمد شمشاد بطور گیسٹ لیکچرار 14 مارچ 2019 سے شعبے میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن نے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے 2020 میں جوائن کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد بحیثیت ایسوی ایٹ پروفیسر 2020 سے اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ شعبۂ اردو کے موجودہ صدر پروفیسر آفتاب اشرف ہیں۔

شعبے میں قائم 'مولانا آزاد چیئر' کے لیے کوششیں بھی پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن کے زمانے میں شروع ہوئیں جس کا قیام ان کے زمانے میں تو نہ ہو سکا لیکن بعد میں پروفیسر عبدالمغنی کی وائس چانسلر شپ میں یہ چیئر بھی قائم ہو گئی جس کے بانی ڈائریکٹر پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن ہوئے۔ پھر پروفیسر مشتاق احمد ڈائریکٹر ہوئے۔ ان کی ڈائریکٹر شپ میں کئی کامیاب سیمینار منعقد ہوئے۔ ان کے بعد پروفیسر رئیس انور کو اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایم ایل ٹھاکر نے جز وقتی نگراں ڈائریکٹر بنایا۔ انھوں نے چیئر کے بنیادی تقاضوں کو انجام دینے میں پوری سرگرمی دکھائی تا کہ آئندہ اس کی معنویت میں اضافہ ہو سکے۔ ان کے زیر نگرانی یو جی سی کے مالی تعاون سے ایک قومی سیمینار '1980 کے بعد بہار میں اردو ناول نگاری' مارچ 2008 میں منعقد کیا گیا۔ تاہم ایک عرصے تک یہ چیئر خالی رہی۔ پھر موجودہ رجسٹرار ڈاکٹر مشتاق احمد کی کوششوں سے 24 نومبر 2020 کو پروفیسر آفتاب اشرف (صدر، شعبۂ اردو) کی صورت میں ایک نیا ڈائریکٹر ملا ہے۔ 2-1 دسمبر 2014 کو شعبۂ ہذا میں دو روزہ قومی سیمینار بعنوان 'اردو میں غیر تخلیقی نثر: پچھلے پچیس سال میں' منعقد ہوا تھا جس سے شعبہ کی فعالیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نومبر 2008 میں پروفیسر رئیس انور کی دورِ صدارت میں شعبے سے مجلّہ 'محاسبہ' جاری ہوا جو ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس کا دوسرا اور اب تک کا آخری شمارہ 2015 میں شائع ہوا۔ 22 مارچ 1997 کو شعبے میں یو جی سی ریفریشر کورس کا آغاز ہوا تھا۔ 2019 میں اس وقت کے صدر، شعبۂ اردو ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ کے زیرِ سرپرستی 'بزم فیض' کا قیام عمل میں آیا جس کے زیرِ اہتمام ایک سیمینار کا انعقاد بھی ہوا جس میں اسکالرس و اساتذہ نے شرکت کی۔ ان ہی کے زیرِ قیادت

پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ نے اپنے قیام کی چالیس سالہ (1979 تا 2019) روداد 'اربعون' کے نام سے شائع کی۔ یکم ستمبر 2020 کو موجودہ صدر، شعبۂ اردو پروفیسر آفتاب اشرف کے زیر نگرانی دو روزہ قومی ویبینار بعنوان 'لطف الرحمٰن : شخصیت اور کارنامے' منعقد کیا گیا۔ اس طرح کے کاموں سے شہر کے ادبی و علمی ماحول کو جلا مل رہی ہے اور نئی نسل کی ذہن سازی ہو رہی ہے۔

اس شعبے میں یو جی سی ریسرچ ایسوسی ایٹ ،نیٹ، جے آر ایف، بیٹ وغیرہ میں کئی اسکالرس نے کامیابی حاصل کی۔ اس شعبے کے پہلے اور آخری یو جی سی ریسرچ ایسوسی ایٹ ڈاکٹر امام اعظم (1991) اور ڈاکٹر عمران احمد مرحوم (1992) ہیں۔ پہلے نیٹ/ جے آر ایف جمال اویسی (1987) ہیں۔ ان کے بعد مہتاب عزیز رزاقی (1988 نیٹ/ جے آر ایف)، افروز عالم (1990 نیٹ/ جے آر ایف)، محمد وسیم (1990 نیٹ/ جے آر ایف)، نسیم احمد (1991 نیٹ/ جے آر ایف)، رابعہ بیگم (1992 نیٹ/ جے آر ایف)، وصیہ عرفانہ (1992 صرف نیٹ)، مشتاق احمد (1993 صرف نیٹ)، مجیر احمد آزاد (1993 صرف نیٹ)، مرتضیٰ علی (1994 صرف نیٹ)، محمد ابوذر (1995 صرف نیٹ)، عمر فاروق اعظم (1994 جے آر ایف)، محمد شہاب الدین (2000 صرف نیٹ)، عبدالودود قاسمی (2001 صرف نیٹ)، آفاق احمد صدیقی (2002 صرف نیٹ)، صفوان صفوی (2005 نیٹ/ جے آر ایف)، نشاط کوثر (2006 صرف نیٹ، 2008 جے آر ایف)، شہباز عالم (2007 صرف نیٹ)، محمد آفتاب عالم (2010 نیٹ/ جے آر ایف)، وصی احمد شمشاد (2011 صرف نیٹ)، رضیہ شجیع (2012 صرف نیٹ)، زیبا پروین (2012 نیٹ/ جے آر ایف)، عبدالمتین قاسمی (2012 صرف نیٹ)، محمد عبداللہ (2012 نیٹ/ جے آر ایف)، محمد شمیم (2012 نیٹ/ جے آر ایف)، صبیحہ پروین (2013 نیٹ/ جے آر ایف)، عبدالرحمٰن ارشد (2013 نیٹ/ جے آر ایف)، عمر فاروق (2014) وغیرہ نے بھی اس امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بیٹ میں کامیاب محمد مبین صدیقی (1996)، محمد خالد (خالد عبادی، 1997) بالترتیب کامیاب ہوئے۔ اس شعبے کے بیشتر فارغین کی اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس شعبۂ اردو سے اب تک جو پی ایچ ڈی/ ڈی لٹ اسکالرس فارغ ہوئے ہیں، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

موضوع	مقالہ نگار	نگراں	سال ایوارڈ
تفہیم اقبال: ایک جائزہ اور تنقید	غلام قدوس فہمی	ڈاکٹر نجم الہدیٰ	1980
نواب سعادت علی خاں: حیات و خدمات	عبدالمنان طرزی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1981
مراقی شاد میں فکری عناصر	اظہار احمد	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1983
سلطان جان: حیات اور شاعری (ڈی لٹ)	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1986
سلام سندیلوی: حیات اور ادبی خدمات	سید حسین احمد	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1986
دربھنگہ میں اردو کی نشو و نما (بیسویں صدی کے آغاز سے 1975 تک)	ظہیر ناشاد دربھنگوی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1987
ساحر لدھیانوی: حیات اور شاعری	سید ضیاء الرحمٰن	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1989
جدید اردو نظم کا آغاز و ارتقاء	رفیع اللہ	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1989
پورنیہ میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (1750 تا 1980)	فاراں شکوہ یزدانی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	1990
مطالعۂ اقبال: تاریخ اسلام کی روشنی میں	محمد رضوان صدیقی	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی	1984
محسن دربھنگوی: حیات اور شاعری	عبدالقیوم ساقی	″ ″	1985
مولانا ریاست علی ندوی: حیات اور کارنامے	محمد عاقف سلفی	″ ″	1986
قاری عبدالمجید مضطر مظفرپوری: حیات اور خدمات	محمد ظفر العلام ظفر	″ ″	1988
بہار میں اردو نثر کا ارتقا (1914-1947)	محمد عبدالرقیب	″ ″	1988
مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ	(سید اعجاز حسن)امام اعظم	″ ″	1989
اردو کی ادبی تنقید اور جدید ذہن	محمد عمیر احمد	″ ″	1989
اردو شاعری میں فطرت نگاری: علامہ اقبال کے خصوصی تناظر میں	محمد فیاض ظفر	″ ″	1990
ڈاکٹر ظفر حمیدی: حیات اور شاعری	سید اسد اللہ	″ ″	1994
شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار اور مؤرخ	محمد جمیل اختر	″ ″	1995
بہار کے طنز و مزاح نگار	نذیر احمد انجم	ڈاکٹر شاکر احمد یحییٰ (شاکر خلیق)	1987
بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقاء	سہیل اختر	″ ″	1988
عبدالخالق خلیق: حیات اور کارنامے	شاہد احمد یحییٰ	″ ″	1998
احتشام حسین بحیثیت نقاد	شائستہ انجم نوری	″ ″	2001
عبدالمغنی کی تنقید کے دائرے	محمد بدرالدین انصاری	″ ″	2010
بہار میں اردو نعت گوئی	محمد نسیم	ڈاکٹر عبدالمنان طرزی	1988
بہار میں اردو افسانہ نگاری (1970-1987)	محمد قیام الدین (قیام نیر)	″ ″	1992
راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں عورت کا تصور	محمد معین الدین	ڈاکٹر محمد کمال الدین	1988
پریم چند کے ناولوں میں قومی یکجہتی کے عناصر	زرافشاں بانو	″ ″	2000
آزادی کے بعد بہار میں اردو غزل	محمد ابوظفر	″ ″	2000
شمس منیری: حیات اور خدمات	محمد امتیاز احمد	″ ″	2006
بہار کے مطبوعہ مقالے: تنقیدی مطالعہ	رستم انصاری	″ ″	2007
عبدالمجید شمس عظیم آبادی: حیات اور کارنامے	جاوید احمد انصاری	″ ″	2008
حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی: حیات و خدمات	محمد رضوان اللہ	″ ″	2013
جمیل مظہری کی نثر نگاری	سید محمد نعمت اللہ	ڈاکٹر رئیس انور	1990
اشک امرتسری: حیات، تجزیہ و تدوین کلام	عبدالغفار انصاری (معصوم شرقی)	″ ″	1997
سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات میں نسوانی کردار	رابعہ بیگم		1998
اردو ناول میں اخلاقیات کی عکاسی	عالمگیر شبنم	″ ″	1999
اقبالیات کی وضاحتی کتابیات	مشتاق احمد	″ ″	1999
اردو ڈرامے: نئے ابعاد	محمد مبین صدیقی	″ ″	2000
قرآن کے اردو تراجم کا ایک جائزہ	محمد انور حسین	″ ″	2001
اردو شاعری پر انگریزی شاعری کے اثرات (صنف و ہیئت کے حوالے سے)	مجتبیٰ احمد	ڈاکٹر رئیس انور/ ڈاکٹر شنکر آنند پالت	2004
اردو ناولوں میں فطرت کی عکاسی (1960 تک)	فردوس فاطمہ	ڈاکٹر رئیس انور	2008
ہندوستان کی جدید اردو تنقید میں نئے رجحانات	(جمال احمد خاں)جمال اویسی	″ ″	2009
اردو افسانوں میں اصلاحی رجحان (1947 تک)	ممتاز فرحت	″ ″	2009
عبدالعلیم آسی: ایک نظر انداز شدہ ادبی شخص	غلام مجتبیٰ رہنما	″ ″	2010
اردو تنقید میں ذاتی تعصب	مسیح الدین احمد (امام اصفیا)	″ ″	2011
پریم چند کے افسانوں میں دیہی ماحول اور زبان کی عکاسی	محمد آفتاب عالم	″ ″	2012
علامہ اقبال کی مختصر نظمیں: تجزیاتی مطالعہ	شفقت پروین	″ ″	2012
بہار میں اردو شاعری: 1857 تک (ڈی لٹ)	ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد	″ ″	2013
دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی اور صحافتی خدمات کے حوالے سے	غلام سرور (سرور کریم)	″ ″	2013
آزادی کے بعد بہار کی تخلیقی اردو نثر: ایک جائزہ (ڈی لٹ)	ڈاکٹر محمد قیام الدین (قیام نیر)	″ ″	2014
عصمت چغتائی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ	وصیہ عرفانہ	″ ″	2017
مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی: حیات و خدمات	بدرالدجیٰ	″ ″	2017
بہار کے مذہبی علما کی نثر نگاری کا جائزہ	رخسانہ اطہر	″ ″	2017

اردو غزل کے ارتقا میں خورشید اکبر کا حصہ	مہتاب عالم خان	// //	2017
پروین شاکر کی غزلیہ انفرادیت	رضیہ تجمع	// //	2019
اردو افسانہ نگاری کے ارتقا میں عبدالصمد کا حصہ	محمد انتشار	// //	2019
بہار میں خود نوشت سوانح عمری	ترنم پروین	// //	2020
پریم چند اور سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ	شباہت پروین	// //	2020
شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری میں کرداروں کی اہمیت	جاوید احمد خاں	// //	2010
آزادی کے بعد متھلا میں اردو افسانہ: ایک مطالعہ	ایم گوہر شگفتہ ہاشمی	// //	2011
سرسید احمد کے تعلیمی، سیاسی اور سماجی نظریات کا تنقیدی مطالعہ	شبلی نعمانی	// //	2013
قرۃ العین حیدر اردو کی ایک منفرد افسانہ نگار	بی بی شہناز بانو	// //	2016
بہار کے اردو ادبی رسائل آزادی کے بعد سے 2000 تک: ایک مطالعہ	عطا حسین انصاری عطا عابدی	// //	2017
منظر شہاب: حیات اور کارنامے	محمد صلاح الدین	ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی	1999
اردو مکتوب نگاری اور مولانا ابوالکلام آزاد	بلقیس بانو لاڈلی	// //	2010
اردو کی رزمیہ شاعری اور حفیظ جالندھری	ناظمہ بے بی	// //	2011
سہیل جامعی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ (متھلانچل میں اردو افسانہ نگاری کی روشنی میں 1960 کے بعد)	ممتاز انور غزالی	// //	2014
اویس احمد دوراں: شخص اور شاعر	فرحت جمال	// //	2014
راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ	اعجاز احمد	// //	2014
لطف الرحمن بحیثیت ناقد	محمد آفتاب عالم	// //	2017
ہندوستانی فلمیں اور اردو زبان و ادب	محمد منور عالم راہی	// //	2017
عبدالمنان طرزی: شعری تخلیقات کی روشنی میں: ایک تجزیہ	ظل اللہ فاتح	// //	2017
اردو صحافت بہار میں 1980-1910	عبدالمتین قاسمی	// //	2017
اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری کی عصری معنویت	خادم حسین	// //	2018
اقبال انصاری کے افسانے میں عورت کا تصور	صغیرہ سلطانہ	// //	2018
اردو زبان و ادب کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار: قدیم ضلع دربھنگہ کے حوالے سے	وصی احمد شمشاد	// //	2018
علیم صبا نویدی کی افسانہ نگاری	شائقہ سلطانہ	// //	2018
سہیل عظیم آبادی اور شین مظفر پوری کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ	محمد مقصود عالم	// //	2019
سید منظر امام: شخصیت اور ادبی کارگزاریاں	معراج الدین خاں (احمد معراج)	// //	2019
شاکر خلیق کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ	محمد اشرف الہدیٰ	// //	2019
نظیر اکبر آبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ	محمد فہیم ربانی	ڈاکٹر برکت علی	2011
بہار کی اہم خواتین افسانہ نگار	رخسانہ جمیل	// //	2011
بہار میں اردو شاعری: 1940 سے 1980 تک (جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی کے خصوصی حوالے سے)	عبدالغفور انصاری	// //	2013
مولانا منت اللہ رحمانی کی علمی و لسانی خدمات	محمد افروز الہدیٰ	// //	2017
علامہ اقبال کی نظموں کے موضوعات و مضامین کا مطالعہ	محمد دلدار حسین	// //	2017
مضامین سرسید کے موضوعات مواد و زبان کا مطالعہ	فرحت بانو	// //	2018
اردو کے ایک اہم تخلیقی نثر نگار شین مظفر پوری	شاداں پروین	// //	2019
اردو میں مقدمہ نگاری	شمس الدین احمد ناصح	ڈاکٹر منصور عمر	1993
حسن امام ورد: حیات اور ادبی خدمات	عبدالمعبود آمر	// //	1998

بہار کے ترقی پسند اردو شعرا کا تنقیدی مطالعہ	نورالحسن	// //	2011
غیاث احمد گدی کے افسانوں میں ساختیاتی تغیرات	محمد حسن امام فاروقی	// //	2011
غضنفر: حیات اور ادبی خدمات	پرویز عالم	// //	2012
اردو ڈرامہ نگاری بہار میں: شین مظفر پوری کے خصوصی حوالے سے	شاہینہ پروین	// //	2014
اردو نثر میں طنز و مزاح نگاری (انجم مانپوری کے خصوصی حوالے سے)	نکہت افشاں خاتون	// //	2006
سہیل عظیم آبادی کے فکشن پر پریم چند کے اثرات	ایس ایم محمود فرید	// //	2008
اوپندر ناتھ اشک کی ادبی خدمات	محمد عمر فاروق	// //	2009
کرشن چندر: بحیثیت فطرت پرست فنکار	محمد حبیب عالم	// //	2013
بہار میں اردو غزل 1980 سے 2005 تک	شرف عالم	// //	2013
قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں نسوانی کردار	رفعت نازنین	// //	2013
جدید اردو افسانہ اور انتظار حسین	محمد ناصر حسین	// //	2014
جدید اردو شاعری اور ناصر کرم پوری کا فن	ثروت پروین	// //	2014
اچاریہ شوکت خلیل بحیثیت فکشن نگار	وکیل احمد	// //	2017
جدید اردو افسانہ اور شفیع جاوید کی افسانہ نگاری	عفت پروین	// //	2018
اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ	محمد مسرور فیضی	// //	2018
جدید اردو غزل اور لطف الرحمن کی غزلیہ شاعری	محمد رحمت اللہ افضل	// //	2019
مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد: شخصیت اور ادبی کارنامے	عبدالودود قاسمی	ڈاکٹر آفتاب اشرف	2005
محمد بشیر فاروقی شاداں: حیات اور کارنامے	مجیر احمد آزاد	// //	2005
اردو زبان و ادب کے ارتقا میں علمائے بہار کی خدمات	محمد کلام	// //	2013
مولانا ابوالکلام آزاد کا نظریۂ تعلیم اور عصری معنویت	احسان عالم	// //	2015
اردو، ہندی اور ہندوستانی کے مستعمل اصطلاحات: نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے حوالے سے	عبدالغنی	// //	2015
لکھنؤ مکتب فکر اور یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری	فرحت صدف	// //	2016
علامہ اقبال کی شاعری میں قرآنی استعارات: ایک مطالعہ	فیروز عالم	// //	2016
ہندوستان میں اردو کی ادبی و لسانی تحریکات: ایک تنقیدی جائزہ	محمد ظفیر الحسن	// //	2016
منظر کاظمی کے افسانوں میں سماجی اور سیاسی مسائل کی پیشکش	اشوک کمار بیٹھا	// //	2017
کلام غالب کی عصری معنویت جدیدیت کے تناظر میں	اقبال اعظم خان	// //	2017
اردو زبان و ادب کے ارتقا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اداریوں کا کردار: 'الہلال' اور 'البلاغ' کے خصوصی حوالے سے	محمد ریاض الدین	// //	2017
اردو کی عشقیہ شاعری اور جوش ملیح آبادی	نوشین بیگم	// //	2018
متھلا میں اردو زبان و ادب کا ارتقا: 1947 تک	گلفشاں اشرفی	// //	2018
سرزمین متھلا کے شعرا و ادبا کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ: 1960 تک	عبدالخالق	// //	2019
پروفیسر غلام قدوس فہمی کی ادبی خدمات	شگفتہ فرحین	// //	2020
شاعر فکر و فن: حضرت مبارک مونگیری	شرف الدین	الیس ایم ظفر الاسلام (ظفر حبیب)	2011
اسرار الرحمن آتش لکھمیاوی: حیات و خدمات	نکہت پروین	// //	2011
ضلع بیگوسرائے میں اردو زبان و ادب کا مطالعہ	محمد فاروق الزماں	// //	2012
مشرقی چمپارن کے مدارس اسلامیہ کی اردو خدمات	حافظ محمد عمران	// //	2012
شاہ نصیر الدین فریاد باروی کی تصنیف سوزن عشق (مسودہ) کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	فضیل احمد	// //	2016
حافظ مکلی پوری اور ان کے چند معاصرین	شبیر اصغر	// //	2016

جدید لب و لہجے کا منفرد غزل گو رفیع الدین راز: حیات اور غزلوں کا مطالعہ	فرحت جہاں	〃 〃	2017
مائل دھرمپوری: حیات اور شاعری	محمد اسلام فیضی	ڈاکٹر حافظ محمد انیس صدری	1999
فکر تونسوی بحیثیت صحافی اور طنز نگار	افتخار زماں	〃 〃	2010
رضا اشک کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	عبدالقادر	〃 〃	2013
محمد عمیر ثاقب: حیات اور شاعری	محمد اصغر علی	〃 〃	2014
مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	راحت حسین	〃 〃	2018
محمد یوسف بحیثیت افسانہ نگار	نوشاد احمد	〃 〃	2018
صبا نقوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	محمد شکیل اختر	〃 〃	2018
محمد عیسیٰ فرتاب: حیات اور کارنامے	فرحت آرا بیگم	ڈاکٹر احمد حسن دانش	1992
مثنوی ہر مزنامہ	محمد ہاشم	〃 〃	1996
حکیم رکن الدین دانا: حیات اور کارنامے	نعمان یزدانی	〃 〃	2000
خدیجہ مستور: حیات اور کارنامے	شیریں امام	ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن	1995
اُردو تنقید: ارتقاء اور جائزے (ڈی لٹ)	(ڈاکٹر سید اعجاز حسن) امام اعظم	〃 〃	2005
قومی یکجہتی کی ترقی میں اُردو شعراء کا کردار (1947-1986)	محمد عباس علی	〃 〃	2007
سور، تلسی، رحیم اور اقبال کے یکساں خیالات کا تقابلی مطالعہ (ڈی۔لٹ)	ڈاکٹر عبدالقیوم ساقی	〃 〃	2010
عطا کاکوی: بحیثیت شاعر، محقق اور نقاد	محمد سجاد خاں	〃 〃	2012
شوکت تھانوی کی ناول نگاری	فیروز احمد	ڈاکٹر محمد بدیع الزماں	1995
سر سید احمد کے فکر و نظر کی نئی توضیحات	امتیاز احمد	〃 〃	2013
اُردو ادب میں دبستان عظیم آباد کی اہمیت و انفرادیت مع تقابلی مطالعہ دبستان دہلی و لکھنؤ کے حوالے سے	محمد افضل حسین	〃 〃	2014
جوگندر پال بحیثیت افسانہ نگار	ایس. ایم نعیم اختر	ڈاکٹر مظفر مہدی	1995
حالی بحیثیت ناقد اور سوانح نگار	نصیر احمد	〃 〃	2000
شمالی بہار میں اُردو مرثیہ نگاری (1947 تک)	شاہینہ پروین	ڈاکٹر سہیل اختر	1995
احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری	ناظمہ بانو	〃 〃	2013
علامہ جمیل مظہری اور کلکتہ کی اُردو صحافت	محمد مظہر عالم	ڈاکٹر سید محمد نعمت اللہ	1996
اُردو غزل کے پچیس سال (1985-1961)	محمد نور حسین	ڈاکٹر ناصر رضا خاں جلالی	1996
جمیل رضوی اور ان کی فارسی شاعری	محمد قاسم	ڈاکٹر سید ولی اللہ سلفی	1997
شاد عظیم آبادی اور ان کی رباعیاں	محمد ذاکر	ڈاکٹر سلطان احمد	2003
لفظیات غزل	نفاست کمالی	〃 〃	2007
مرثیے کا فن اور میر انیس	محمد شوکت علی	〃 〃	2009
نذیر احمد کے ناولوں میں کردار نگاری	نسرین سلطانہ	ڈاکٹر شاہدہ شمیم بانو	1998
مرزا ادیب بحیثیت ڈرامہ نگار	زہرہ شمائل	ڈاکٹر امام اعظم	2005
محمد سالم: فکر و فن کے آئینے میں	شاہینہ پروین (امام)	〃 〃	2007
غالب کی شاعری میں المیہ عناصر	عبدالحق (امام)	〃 〃	2009
اُردو صحافت میں ظرافت اور بذلہ سنجی	محمد نوشاد علی	ڈاکٹر محمد عمر ابدالی	2005
خورشید الاسلام: حیات اور خدمات	محمد نسیم الدین	ڈاکٹر محمد قیس	2005
اُردو تنقید شمالی بہار میں	محمد سہیل	〃 〃	2005
محمد کمال الدین: حیات و خدمات	محمد انیس الرحمٰن خان	ڈاکٹر رضوان صدیقی	2008
عطا کاکوی: حیات اور شاعری	تفسیر اعظم گوہر	〃 〃	2018
سریندر پرکاش بحیثیت افسانہ نگار	نکہت پروین	ڈاکٹر سید احتشام الدین	2008
ڈاکٹر افضال الدین اقبال کی حیات اور نثری خدمات	عبدالرؤف	〃 〃	2014

عزیز برنی صحافتی، ملی اور سماجی کارکردگی کی روشنی میں	مختار احمد فردین	〃 〃	2014
قرۃ العین حیدر کے چار اہم ناول: ایک تنقیدی جائزہ	نصرت بانو عظیم	〃 〃	2020
دیوان خواجہ آصفی کا تنقیدی اڈیشن (فارسی) (تعارف اور نوٹس کے ساتھ)	محمد اعجاز احمد	ڈاکٹر محمد قاسم	2009
جمالیاتی تنقید اور شکیل الرحمٰن کی خدمات	سید محمد اقبال اختر	ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ	2011
قمر اعظم ہاشمی: حیات و خدمات	محمد عرفان	〃 〃	2014
مناظر عاشق ہرگانوی ایک منفرد افسانہ نگار	عذرا مناظ	〃 〃	2019
اقبال انصاری: ایک نمایاں فکشن نگار	مسرت جہاں	〃 〃	2019
سر سید احمد خاں اور جدید نظام تعلیم	فریدہ خاتون	ڈاکٹر افتخار احمد	2013
جدید اُردو افسانہ اور احمد یوسف کی افسانہ نگاری	افشاں جبیں	〃 〃	2013
حفیظ بنارسی: حیات اور خدمات	غلام رسول	〃 〃	2014
پروفیسر عبدالمنان طرزی بحیثیت منظوم سیرت نگار	محمد علی حسن	〃 〃	2020
مشرف عالم ذوقی بحیثیت ناول نگار	محمد امجد حسین	〃 〃	2020
ناز قادری کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ	شمشاد فاطمہ	ڈاکٹر خالد سجاد	2013
دربھنگہ کی علمی و ادبی خدمات: ۱۹۸۵ء تا حال	عبدالحی	〃 〃	2014
بہار میں جدید اُردو افسانے کا تنقیدی جائزہ	شہباز عالم	ڈاکٹر ظفر سعید	2014
فرحت قادری: حیات و ادبی خدمات	نثار احمد صدیقی	ڈاکٹر محمد اسداللہ (اسد ظہیر)	2016
سیدہ نسرین نقاش کی حیات اور شعری خدمات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سعدیہ بانو	ڈاکٹر عبدالرؤف	2017
بہار میں اردو خاکہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ	عروسہ یاسمین زیبا	ڈاکٹر امتیاز احمد	2017
مفتی محمد ظفیر الدین: شخصیت اور خدمات	حافظ نسیم اختر	〃 〃	2019
اردو افسانے میں سماجی اور گھریلو مسائل کی عکاسی: ایک جائزہ	شاکرہ آفرین	〃 〃	2019
بہار کے اردو افسانوں میں سماج کے پسماندہ طبقہ کی عکاسی	طیبہ شاکرہ	〃 〃	2019
عطا عابدی کی ادبی خدمات: ایک مطالعہ	ریحان احمد قادری	ڈاکٹر محمد شمشاد اختر	2019
اردو ادب میں آپ بیتی کی روایات کا تجزیاتی مطالعہ	محمد ارشد حسین	〃 〃	2020
شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی	محمد امان اللہ	ڈاکٹر جمال احمد خاں (وصی)	2018
پروفیسر وہاب اشرفی: مابعد جدید ناقد	زبیدہ ناز	ڈاکٹر سحر افروز	2017
قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کا اسلوبیاتی مطالعہ	عابدہ ناز	〃 〃	2017
پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی	محمد عبداللہ	〃 〃	2018
ڈاکٹر شعیب راہی بحیثیت ترقی پسند شاعر اپنی غزلوں کے آئینے میں	نزہت جبیں	〃 〃	2018
پروفیسر ظفر حبیب کی افسانہ نگاری	رومانہ خاتون	〃 〃	2019
بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں حب الوطنی	عصمت جہاں	ڈاکٹر نذیر احمد انجم	2018
علی میاں کی نگارشات کا تفصیلی مطالعہ	محمد وصی اعظم	〃 〃	2019
قمر اعظم ہاشمی: شخص اور کارنامے	محمد کلیم اشرف	ڈاکٹر اشرف علی	2018
وہاب اشرفی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت	محمد علیم الدین	〃 〃	2019
شاہنامۂ اسلام: تاریخ اسلام کی روشنی میں	محمد احتشام الحق انصاری	ڈاکٹر ظفیر الدین انصاری	2019

یہ پیش رفت اطمینان بخش ہے۔ اسی طرح اردو زبان و ادب کی خدمت، وسعت، گہرائی اور آراستگی کے ساتھ ہو رہی ہے۔

■

Dr. Imam Azam
Regional Director, (MANUU) Kolkata, Regional Centre
1-A/1, Chato Babu Lane, Kolkata - 700014 (WB)
Mob.: 08902496545 / 9431085816, Email.: imamazam96@gmail.com

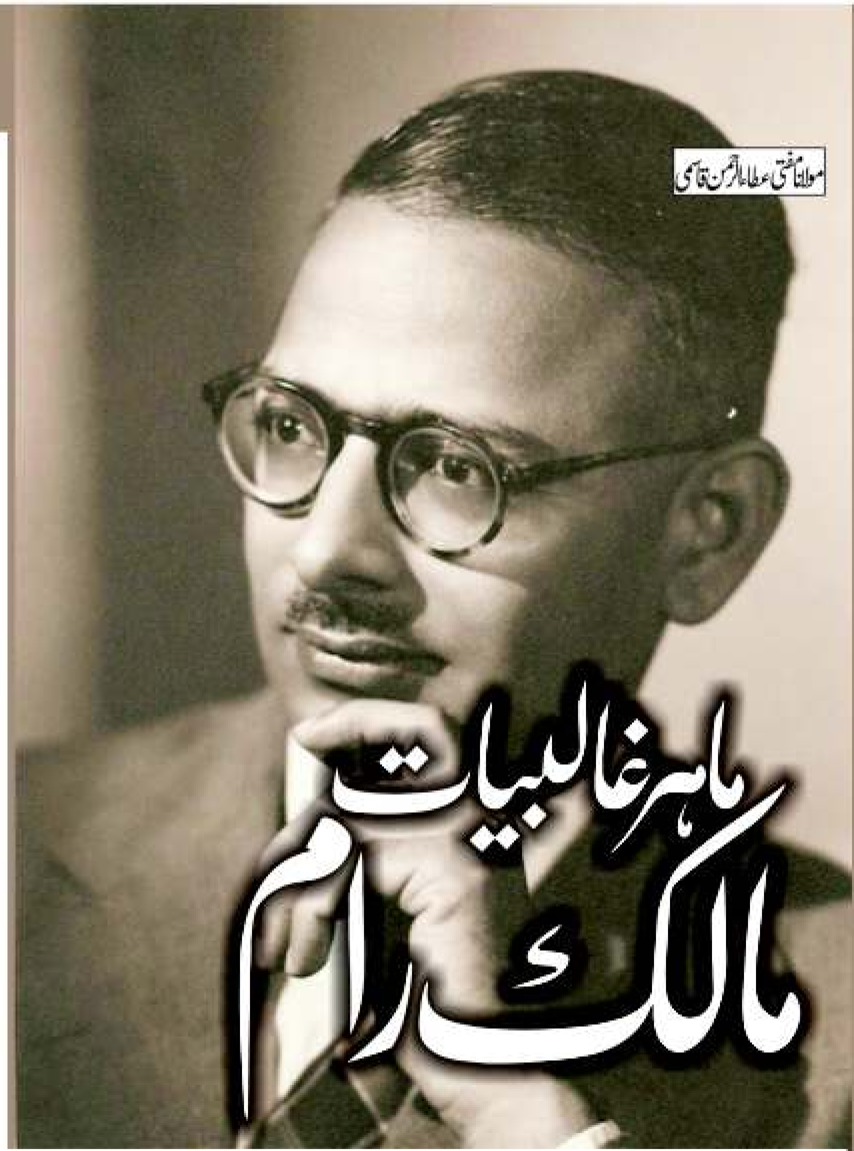

ماہرِ غالبیات مالک رام

مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

اردو زبان و ادب، تاریخ و ثقافت اور تحقیق و تنقید کے میدان کارزار میں ماہر غالبیات مالک رام (22 دسمبر 1906 - 16 اپریل 1993) کا شمار ادبیات و لسانیات اور تحقیقات و تنقیدات کے ماہرین، محققین، باحثین اور ناقدین میں ہوتا ہے، وہ جہاں ماہر غالبیات تھے وہاں ماہر ابوالکلامیات بھی تھے، وہ ایک کثیر التصانیف والتالیفات مصنف و مولف بھی تھے، ان کی تصنیفات و تالیفات میں ذکر غالب، تذکرہ معاصرین، تذکرہ ماہ و سال، عورت اور اسلامی تعلیم اور اسلامیات وغیرہ بہت ہی مشہور و معروف ہیں، وہ اپنی علمی و تحقیقی کتابوں کے حوالے سے برصغیر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں نیک نام و شہرت دوام رکھتے تھے، انھیں کلاسیکی ادب و روایت و علمی و تمدنی آثار و اثاثے کے تحفظ و بقا اور ارتقا کا ہمہ وقت و ہمہ جہت خیال رہتا تھا، انھیں جب کبھی قدرت کی جانب سے موقع نصیب ہوا، انھوں نے عام ادیبوں، فنکاروں اور قلم کاروں کی مروجہ روشوں اور روایتوں کے برعکس و برخلاف ''موقع و محل'' کو غنیمت جانا تھا اور اس نعمت غیر مترقبہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور علمی و ادبی کلاسیکی ذخائر میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور پائیدار و مستحکم اور واضح و محسوس کام سے اپنا نام تاریخ ادبیات و تحقیقات اور مذہبیات میں ثبت کیا۔

مالک رام گجرات (پنجاب) کے ایک غیر مسلم خانوادے کے گل سرسبد تھے، جہاں آپ کے والد اردو فارسی جانتے تھے، آپ کے جوان مرگ بڑے بھائی اردو قصوں، کہانیوں اور اردو شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے، گھر میں اردو و فارسی پڑھنے کا چلن تھا اور وہاں اردو فارسی کی کتابیں بھی وافر مقدار میں موجود تھیں، مالک رام نے پرائمری اسکول گجرات سے میڈل پاس کیا اور وزیرآباد کے ہائی اسکول سے انٹرمیڈیٹ کیا، جہاں کے اسکولوں میں بھی اردو اور فارسی کی تعلیم ہوتی تھی، دس پندرہ سال کی عمر میں ان کی اردو و فارسی کی استعداد ان کی اسکولی تعلیم سے کہیں وسیع تر ہوگئی تھی، ان کی نوعمری میں ان کے آساتذہ ان کی اردو و فارسی دانی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے اور ان کے تابناک و شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کرتے تھے، 1928 میں جب وہ لاہور آئے، جہاں سے بی اے اور تاریخ میں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی، اس وقت لاہور اردو زبان و ادب کا بڑا مرکز تھا، صحافیوں میں ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار، عبدالمجید سالک ایڈیٹر انقلاب، شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان، محمد دین تاثیر اور شاعروں ادیبوں اور خطیبوں میں عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا تاجور نجیب آبادی اور علامہ اقبال موجود تھے، مالک رام کو اہل علم، علما اصحاب ادب و صحافت اور ارباب فکر و دانش سے ملنے ملانے کا شوق تھا، مالک رام ان حضرات سے اپنی ملاقاتوں اور مجلسوں کا بڑا دل چسپ ذکر کیا کرتے تھے اور ان سے علمی استفادے کا بھی اعتراف کیا کرتے تھے۔

مالک رام کو اردو، فارسی، عربی حتی کہ قرآن کریم پڑھنے کا اس قدر شوق تھا، جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے، جس کا ذکر انھوں نے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی سے اپنے ایک انٹرویو میں کیا ہے کہ جب وہ لاہور آئے تو ان کے ذہن میں آیا کہ ہمیں قرآن پڑھنا چاہیے چنانچہ انھوں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ میں قرآن کریم پڑھنا چاہتا ہوں، کسی مولوی صاحب کو تلاش کرو، اتفاق سے سید دلاور شاہ بخاری تیار ہوگئے مگر انھوں نے یہ شرط رکھی کہ نماز فجر سے پہلے آنا ہوگا، مالک رام کہتے ہیں کہ آپ کو تعجب ہوگا کہ میں سردی گرمی میں صبح ہی صبح متواتر دو سال تک ان کی خدمت میں جاتا رہا، حالانکہ ان کا گھر میرے مسکن سے تین کلو کے فاصلے پر تھا، میں نے ان سے قرآن کریم کے 18 پارے پڑھا، اس کے بعد وہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے کہیں چلے گئے اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، پھر میں باقی قرآن کریم کے بارہ پارے خود ہی پڑھ کر قرآن کریم کو مکمل کیا۔

1926 میں وہ لاہور سے دہلی آگئے اور قرول باغ میں مقیم ہو گئے، اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی میں تھی، جس کے ذمے داروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر سید عابد حسین تھے ان سے وہاں ملاقاتیں رہتی تھیں، وہیں اتفاق سے حکیم محمد عرفان ندوی تھے جو ماہ نامہ پیام تعلیم کے ایڈیٹر تھے، ان سے عربی سیکھنی شروع کردی۔ انہی دنوں ان کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ہوتی تھی، مالک رام الہلال اور البلاغ کے مستقل قاری رہ چکے تھے، وہ الہلال و البلاغ کے پرچوں کو بڑے شوق و ذوق سے پڑھتے تھے اور ان کے تمام پرچوں کو بڑی حفاظت سے اپنی ذاتی لائبریری میں رکھے ہوئے تھے، اب ان کا کیا حال ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔

مالک رام کی ذہنی و فکری تعمیر و تشکیل میں بقول ان

کے نیاز فتح پوری ایڈیٹر نگار اور مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر الہلال والبلاغ کا بڑا دخل رہا ہے، مالک رام کہتے تھے کہ میرا سب سے پہلا مضمون نگار میں چھپا تھا، جو مرزا غالب اور ذوق کے متعلق تھا، مالک رام یہ بھی کہتے تھے کہ مجھے اسلامیات کی طرف رجحان ہوا وہ دراصل نیاز فتح پوری کی وجہ سے ہوا کیونکہ نیاز فتح پوری کی ایک عادت تھی کہ وہ ہر مسئلے میں ایک چونکانے والی بات کرتے تھے اور تنازعے کھڑے کر دیتے تھے، اس کی وجہ سے مجھے اسلامی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا، نیاز فتح پوری اور مولانا آزاد کی تحریروں میں جو شگفتگی اور برجستگی تھی، وہ مالک رام کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے، جس کا اعتراف خود مالک رام نے کیا تھا، وہ کہتے تھے کہ میری تحریروں میں جو تھوڑی بہت شگفتگی آئی ہے، وہ دراصل مولانا آزاد اور نیاز فتح پوری کی وجہ سے ہے۔ مگر نیاز فتح پوری کی اسی عادت کی وجہ سے مولانا دریابادی جریدہ نگار کو فتنہ روزگار کہا کرتے تھے اور صدق اور صدق جدید میں دونوں کے درمیان بڑی ادبی معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔

اس کے بعد وہ فارن سروس میں آ گئے اور اسکندریہ مصر چلے گئے، دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے وہاں انھیں دس سال تک سفارت خانہ میں رہنا پڑا، اسکندریہ میں عربی زبان بولی جاتی تھی انھوں نے وہاں عربی زبان کو پڑھنا لکھنا سیکھ لی، اور قرآن کریم کے مطالعے کے ساتھ احادیث نبوی کے مطالعے بھی شروع کر دیا اور وہ کہتے تھے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں احادیث کی موجود تمام متداول کتابوں کو پڑھ لی تھی، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے غیر مسلم بہت مل جائیں گے لیکن احادیث پڑھنے والے غیر مسلم نہیں ملیں گے، خود مسلمانوں میں احادیث پڑھنے کا عام رواج نہیں ہے، چونکہ احادیث کا ذخیرہ بڑا وسیع ہے، جب مالک رام سے پوچھا جاتا تھا کہ آپ کی تصنیفات میں کون سی تصنیف زیادہ پسند ہے تو کہتے تھے کہ میری کتابوں میں دو کتابیں مجھے بہت پسند ہیں، ایک ذکر غالب اور دوسری عورت اور اسلامی تعلیم، ذکر غالب، مرزا غالب کی سوانح عمری ہے۔ دوسری عورت اور اسلامی تعلیم، احادیث کے مطالعے کا نتیجہ ہے، میں برابر سوچتا رہتا ہوں کہ میں نے اس موضوع پر ایسی کتاب کیسے لکھ دی ہے، جس کا عربی ترجمہ اور انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اور بہت ہی مقبول ہے۔

مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں، غالبا 1983-84 کی بات ہے، ایک دفعہ مالک رام مہندیان تشریف لائے، میں ان دنوں جامعہ رحیمیہ مہندیان مرکز شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ میں مدرس تھا، میری کتاب 'چند عظیم شخصیتیں' چھپ چکی تھی، اور غالبا ان کے علم میں آ چکی تھی، تھوڑی دیر وہ مجھ سے گفتگو فرماتے رہے، پھر فرمایا قاسمی صاحب! میں مہندیان قبرستان دیکھنا چاہتا ہوں، میں نے کہا تشریف لائیے، مالک رام ٹیک لگاتے ہوئے اٹھے اور میرے کندھے پر مشفقانہ و محبانہ ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چھڑی کے سہارے گورغریباں کی طرف چل پڑے، میں پہلے انھیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادہ کے چبوترہ کی طرف لے گیا، اور اسی کے بغل میں مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومن بھی آسودہ راحت ہیں، ان کی تربت کی طرف اشارہ کیا، مالک رام میری بات بھی سن رہے تھے اور کوئی چیز ڈھونڈ بھی رہے تھے، مجھ سے کہا کہ آپ اس احاطے سے باہر مغربی جانب قبرستان میں چلیے، میں نے کہا کہ وہاں کی قبریں بے نشان ہو چکی ہیں اور مقبروں کے شکستہ آثار و کھنڈرات ہی برائے نام باقی رہ گئے ہیں، مگر ان کا اصرار تھا، جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ ان شکستہ مقبروں، شکستہ کتبوں، لوحوں اور ٹوٹی ہوئی قبروں کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں، مگر جب انھیں وہ مطلوبہ اور متاع گمشدہ نہ ملی تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ قاسمی صاحب یہاں کبھی مرزا مغل بیگ کی قبر ہوا کرتی تھی، جو مرزا غالب کے عزیز تھے، میں نے 1947 سے قبل اسے دیکھا تھا، غالبا 1947 میں اسے نقصان پہنچا دیا گیا، پھر انھوں نے بڑی حسرت و یاس سے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی، وَ تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

مالک رام عموماً علی گڑھ طرز کی سلی ہوئی نفیس و عمدہ شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس رہتے تھے اور اپنی مجلسی گفتگو میں بسم اللہ، سبحان اللہ، الحمد اللہ اور اللہ کے فضل و کرم وغیرہ الفاظ استعمال کرتے رہتے تھے، اور اس کے سخت عادی تھے، قرآن کریم کی آیتیں اور حدیثیں بھی پڑھا کرتے تھے، قرآن کریم کے اردو کے تراجم پر انھیں بڑی دسترس تھی، وہ ہر آیت کے بارے میں بڑے وثوق و اعتماد سے کہتے تھے کہ اس آیت کا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے یہ ترجمہ کیا ہے، حضرت شیخ الہند یہ کہتے ہیں، مولانا آزاد نے بڑا عمدہ و فصیح ترجمہ کیا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے حضرت تھانویؒ کی اتباع و پیروی میں یہ ترجمہ کر دیا، ڈپٹی نذیر احمد نے اردو محاورہ استعمال کیا ہے، مولانا مودودی نے کچھ اس طرح کیا ہے، جس سے بعض لوگوں کو اعتراض ہو گیا، اور فلاں میں یہ سقم ہے، غرضیکہ تمام متقدمین مفسرین، مترجمین اور معاصر مترجمین و مفسرین کے تراجم و تفاسیر پر نقد و جرح اور تبصرہ و رائے زنی کرتے جاتے تھے۔ مگر ان کا طور طریقہ اور لب و لہجہ

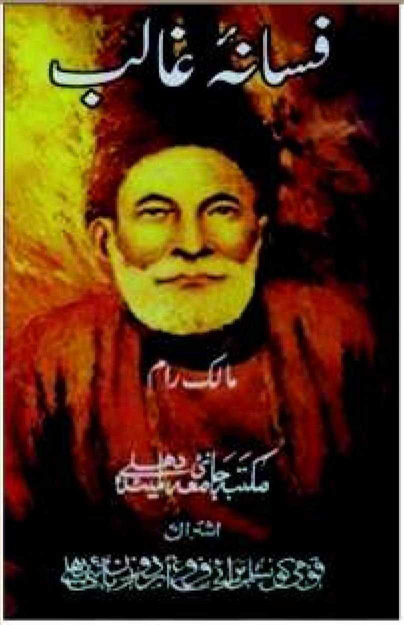

عالمانہ اور بڑا فاضلانہ ہوا کرتا تھا، اگر چہرے پر داڑھی ہوتی تو اجنبی آدمی انھیں کسی مدرسہ کا شیخ الحدیث یا شیخ التفسیر یا کسی ملک کا شیخ الاسلام کہنے پر مجبور ہوتا مگر اللہ کی مشیت اور مرضی!

جن لوگوں کو میرے اس دعوے میں کوئی شک وشبہ ہو تو ان کو ترجمان القرآن، تذکرہ اور خطبات آزاد پر مالک رام کے قلم سحر نگار سے نکلے ہوئے حواشی ہوامش کو پڑھنا چاہیے، وہ یقیناً میرے اس دعوے کی تصدیق کرنے پر مجبور ہوں گے۔

5 فروری 1992 میں میری کتاب الواح الصنادید حصہ دوم کا اجرا ایوان غالب ماتا سندری لین نئی دہلی میں ہوا تھا، جس کی صدارت مشہور مورخ اور مجاہد آزادی ڈاکٹر بی این پانڈے سابق گورنر اڑیسہ نے کی تھی، جس کے مہمانان خصوصی میں سید حامد وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند اور مالک رام صدر انجمن ترقی اردو ہند تھے، مالک رام نے الواح الصنادید کی تصنیف پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ جب کوئی اچھی کتاب چھپتی ہے اور وہ سامنے آتی ہے، تو خیال آتا ہے کہ کاش یہ میری کتاب ہوتی، مالک رام مجھ حقیر فقیر پر بھی بڑی شفقت فرماتے تھے، جب بھی کہیں مل جاتے تھے تو میری حوصلہ افزائی فرماتے تھے، مجھے بارہا ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، وہ انتہائی درجے کے شریف النفس اور وضع دار انسان تھے۔

■

Maulana Mufti Ataur Rahman Qasmi
N-80/C, Abul Fazal Enalave
Jamia Niagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9811740661

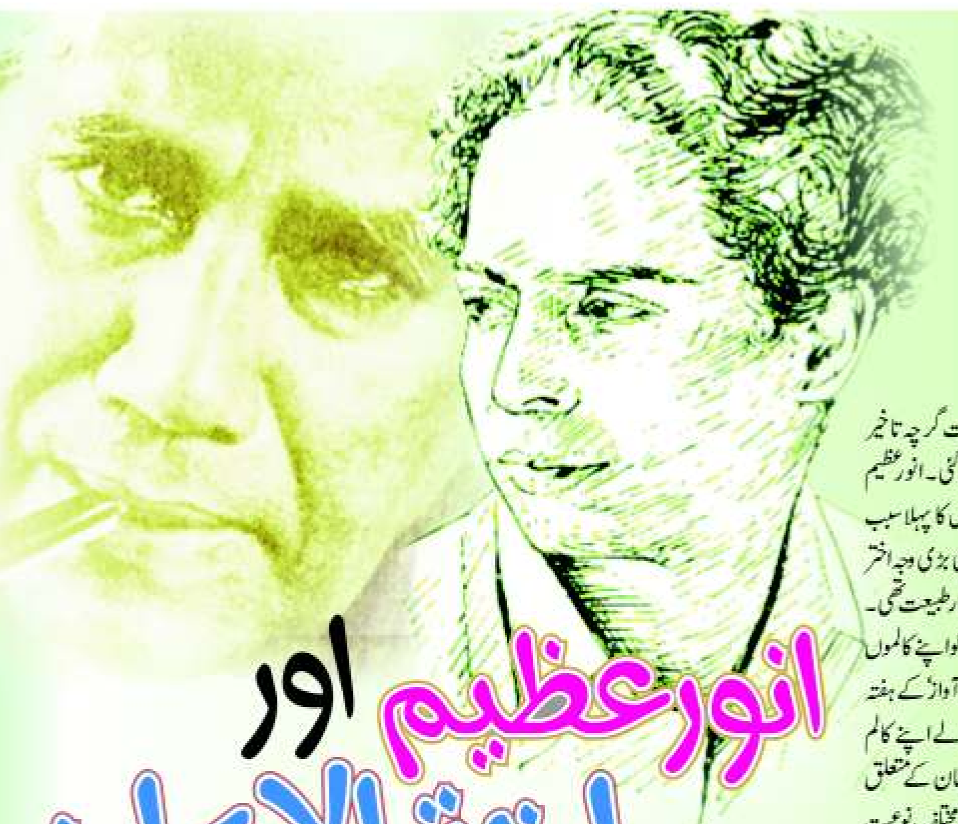

انور عظیم اور اختر الایمان

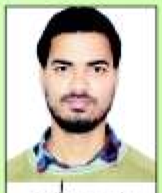

فیضان الحق

اختر الایمان سے انور عظیم کی ملاقات گرچہ تاخیر سے ہوئی، لیکن جلد ہی گہری دوستی میں بدل گئی۔ انور عظیم اختر الایمان سے کئی سطحوں پر متاثر تھے۔ اس کا پہلا سبب اختر الایمان کی دردانگیز شاعری تھی۔ دوسری بڑی وجہ اختر الایمان کی شگفتہ مزاجی، حسن اخلاق اور ملنسار طبیعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انور عظیم نے اس شاعر سوز و درد کو اپنے کالموں میں سب سے زیادہ یاد کیا ہے۔ روزنامہ 'قومی آواز' کے ہفتہ وار ضمیمہ میں 'باتیں' کے تحت لکھے جانے والے اپنے کالم میں انور عظیم نے قریب 13 کالمس اختر الایمان کے متعلق رقم کیے ہیں۔ یہ کالمس مواد کے اعتبار سے مختلف نوعیت کے ہیں، اور مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ انور عظیم نے اختر الایمان کے ساتھ ممبئی کی کئی خوبصورت شامیں گزاری تھیں، اور ان کی کار میں بیٹھ کر سیر و سیاحت کا مزہ لیا تھا۔ اس سیر و سیاحت میں ان کے ساتھ کبھی کرشن چندر ہوتے تو کبھی کوئی اور، اپنے کالموں میں وہ ان ملاقاتوں کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں۔ اختر الایمان پر لکھی گئی ان تحریروں میں عقیدت اور جذباتیت کے ساتھ تنقیدی نظر بھی ہے۔ تحریروں کو پڑھتے ہوئے قاری کا رشتہ شاعر اور کالم نگار سے جڑتا محسوس ہوتا ہے۔ اس مضمون کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ اختر الایمان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہے، دوسرے حصے میں خودنوشت 'اس آباد خرابے میں" کی نثری اور لسانی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور تیسرا حصہ 'شکیل الرحمٰن' کی اختر الایمان شناسی کے جائزے پر مشتمل ہے۔

(1)

اختر الایمان کو انور عظیم نے پہلی بار 1993 کے ایک کالم میں یاد کیا تھا، جس کا عنوان تھا "اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا۔" اس میں انھوں نے ممبئی اور اختر الایمان سے جڑی اپنی یادوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور ان کی شخصیت سے متعلق کئی اہم باتیں لکھی ہیں۔ اختر الایمان کا سراپا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"سامنے وہی شخص ہے، وہی شخص، شخص، شاعر، شوہر، باپ۔ وہی آبنوسی تراش و رنگ، تبسم بدہن، اکیلا شخص، آبنوسی، بال سفید، کرتا سفید، تہمد سفید، اکیلا شاعر، جس کی ہنسی ہمیشہ کی طرح اجلی ہے اور بے ریا۔"

(باتیں، قومی آواز، دہلی، ہفتہ وار ضمیمہ، 12/ستمبر، 1993، ص 1)

ایک خاکہ اور ملاحظہ فرمائیں:

"فکر سے بے نیاز اور ایک ہلکی ٹیڑھی سی مسکراہٹ جو ایک نامکمل بت کے کچے نقوش میں ڈھل گئی ہو، اور جب جلتے جنگل کی تیز ہواؤں نے اپنی ٹھنڈی گرمی سے ان نقوش کو چھوا ہو تو وہ پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہوں، اور آنکھوں سے تھوڑی تک آتشیں لکیریں دوڑ رہی ہوں اور ٹپک رہی ہوں ایک سینے پر جس میں سانس بھی نہ ہو، دھڑکن بھی نہ ہو۔" (ایضاً، 31/مارچ 1996، ص 1)

یہ اس وقت کی بات ہے جب انور عظیم اپنی اہلیہ خدیجہ عظیم کے ساتھ اختر الایمان کے دولت کدے پر حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت اختر الایمان کی طبیعت کافی ناساز رہتی تھی اور وہ کئی امراض میں مبتلا تھے۔ لیکن ان کا چہرہ دوستوں کے سامنے ہمیشہ ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔ انور عظیم کے مطابق کسی بھی بیماری یا پریشانی کا شکوہ اختر الایمان کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی بیماری اور تکلیفوں کا قصہ بھی مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع کا ذکر انور عظیم یوں کرتے ہیں:

"پچھلی بار وہ تازہ تازہ اسپتال سے آئے تھے۔ ٹانگ کی نسوں اور رگوں کے کٹنے چھٹنے اور دل کی جراحی کا ذکر وہ یوں کر رہے تھے، جیسے وہ کسی ٹیلر ماسٹر کی بخیہ گری کا ذکر کر رہے ہوں۔" (ایضاً، 12/ستمبر 1993، ص 1)

انور عظیم نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ "اختر الایمان کے منہ سے میں نے کبھی کسی کی ڈرامائی خود شگفتگی کا جملہ نہیں سنا۔" ان کے مطابق اختر الایمان مہمان نواز اور دوست دار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت تواضع پسند انسان تھے۔ دوستوں کی خاطر داری میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ ملاقات کا ایک قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'اختر الایمان نے کھانا کھانے کے بعد چائے کی پیشکش کی اور کہا:

"نہیں نہیں! چائے میں اپنے ہاتھ سے بناؤں گا۔ گھر میں اس وقت اور کوئی نہیں ہے تو کیا ہوا، میں جو ہوں۔ دیکھو کیسی چائے بناتا ہوں۔" (ایضاً، 12/ستمبر 1993، ص 1)

اس تواضع اور خاکساری کا ذکر کرنے کے بعد انور عظیم نے ایک دلچسپ بات اور لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک بیماری ایسی ہے جو تقریباً ہر متشاعر کو لاحق ہوتی ہے۔ مگر اختر الایمان اپنی بیماری کی حالت میں بھی اس مرض سے دور رہے۔ اور وہ بیماری ہے" دوسروں کو شعر سنانا"۔ اختر الایمان نے کبھی بھی کسی پر اپنے اشعار تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ انور عظیم کے الفاظ ہیں:

"اس منفرد شاعر سے میں نے کبھی نہیں سنا، دیکھو!

سنو! میں کیسے شعر کہتا ہوں'' (ایضاً،12ستمبر 1993،ص 1)

اختر الایمان کے اس رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے انور لکھتے ہیں کہ 'آفاقیت کے ڈھالے ہوئے شعر کے خالق کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی'۔ اس جملے سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انور عظیم، اختر الایمان کی شاعری کو، آفاقی اقدار کی حامل شاعری سمجھتے تھے۔ انھوں نے اختر الایمان کی شخصیت کے ساتھ ان کی شاعری کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انور عظیم اختر الایمان کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''اختر الایمان تاریخ و دانش، جذبات و تجربات کا شاعر ہے۔ چھوٹے چھوٹے مشاہدوں، دکھوں، آرزوؤں اور صدف نشین تہہ داریوں کا شاعر، جس طرح اقبال حرکت وعمل اور تغیر کا شاعر تھا، مگر پر شکوہ۔ اسی طرح اختر الایمان رزم و بزم، لطیف احساس غم اور 'سوکھی ببول' اور ویران مکانوں کا شاعر ہے۔'' (ایضاً،31 مارچ 1996،ص 1)

ایک شاعر کے متعلق انور عظیم کے یہ خیالات کسی باریک بیں نقاد کے خیالات سے کمتر معلوم نہیں ہوتے۔ حالانکہ انھوں نے کبھی بھی اپنی نقادی کا دعوی نہیں کیا۔ لیکن شاعری کے متعلق ان کے خیالات گہری تفہیم، بالغ شعور اور باریک نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک ایسی نظر جو ایماندار قاری اور باشعور ادیب کے پاس ہوتی ہے۔ اسی باریک بینی کا نتیجہ ہے کہ انور عظیم اختر الایمان کی شاعری میں تجربات و جذبات کا بہاؤ اور 'تاریخی شعور' دریافت کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اختر الایمان چھوٹے چھوٹے مشاہدوں کو بڑے فن پارے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری تہہ داریوں اور آرزوؤں کی شاعری ہے۔ یہاں تک کہ وہ اختر الایمان کی شاعری کا مطالعہ کرتے کرتے اقبال کو یاد کرنے لگتے ہیں، اور دونوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ایک قسم کی ہم آہنگی کی دریافت کرتے ہیں۔ یہ ہم آہنگی اپنے آپ میں مختلف ہونے کے باوجود، تاثر کے اعتبار سے یکساں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی حرکت وعمل اور پر شکوہ انداز والی شاعری جس طرح زود اثر ثابت ہوتی ہے اسی طرح اختر الایمان کے کلام کی لطافت، حساسیت اور ایک ہلکی سی اداس و مایوس فضا دلوں کو گرما دیتی ہے۔ انور عظیم اپنے خیالات کو مزید واضح کرتے ہوئے فن مصوری کی طرف رخ کرتے ہیں، اور اختر الایمان کے کلام کے متعلق وہاں سے مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اکثر مجھے اختر الایمان کے اشعار پڑھتے ہوئے 'وان گاگ' کی پینٹنگ یا کینوس کا خیال آتا ہے۔'' الفاظ اسی مصور کے رنگ اور برش ہیں اور 'سوکھی سی ببول' وہاں دور 'ویران مکانوں سے پرے' جہاں جھلکتا ہوا گول سا چاند ابھر رہا ہے، بے نور شعاعوں کے سمٹنے کے لیے۔''

(ایضاً،31 مارچ 1996،ص 1)

Vincent Van Gogh نیدرلینڈ کا رہنے والا ایک عظیم مصور تھا۔ جس نے اپنی فن کاری سے مغربی آرٹ پر گہرا اثر ڈالا تھا، اور پھر اپنی خود آگہی یا خود فراموشی کے سبب محض 37 سال کی عمر میں خودکشی کر لی تھی۔ انور عظیم کو اسی کی تصویروں کا خیال کیوں آیا؟ اگر اس بات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سے قربت اور ایک دبا دبا سا درد دونوں فن کاروں (وان گاگ اور اختر الایمان) کے یہاں یکساں طور پر موجود ہے۔ وان گاگ کی پینٹنگ کو دیکھنے اور اختر الایمان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے دل پر قریب ایک سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس طرح انور عظیم نے ایک ادبی متن کی تفہیم کو دوسرے فنون لطیفہ سے ملا دیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اپنی بات کہنے میں وہ نہ صرف کامیاب نظر آتے ہیں بلکہ رسمی اور پیشہ ور نقادوں سے کئی گنا آگے بھی ہیں۔ یہ ایک فنی تخلیق کو دوسری فنی تخلیق کے ساتھ ملا کر دیکھنے کا طریقہ ہے کیونکہ کہیں نہ کہیں تمام فنون لطیفہ کی دھارائیں آرٹ کے ایک ہی سمندر میں گرتی نظر آتی ہیں۔

انور عظیم کے نزدیک اختر الایمان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ان کی 'ارضیت' تھی۔ وہ کبھی اپنے کلام میں خدائی دعویٰ کرتے نظر نہیں آتے۔ ان کے کلام میں یہ خوبی ان کی شخصیت سے ہی آئی تھی، جس میں ایک کرب بھی ہے اور عام انسانوں کا درد بھی۔ انور عظیم لکھتے ہیں:

''اختر الایمان ایک انسان بھی ہے، کرۂ ارض کے باشندوں میں ایک باشندہ، سب کے ساتھ سب سے الگ، اور احساس و اظہار کا ایک انفرادی سلسلہ، اور نچوڑ و تو ایک بوند، خون کی، جو اوہام کی ریت میں جذب ہو گئی۔ بس اتنی سی ہے ایک زندگی اور پہچان ایک تخلیق کار کی؟ الجھے ہوئے گرہوں سے آراستہ، خارزار میں، اختر الایمان ان سوالوں کا جواب دیتا ہے اور یوں:

''میں پیمبر نہیں/ دیوتا بھی نہیں/ دوسروں کے لیے جان دیتے ہیں وہ/ سولی پاتے ہیں وہ/ نامرادی کی راہوں سے جاتے ہیں وہ/ میں تو پروردہ ایسی تہذیب کا/ جس میں کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ/ شرپسندوں کی آماجگہ/ امن کی قمریاں جس میں کرتب دکھانے میں/ مصروف ہیں/ میں ربڑ کا بنا ایسا بوا ہوں جو/ دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا ہے سب/ پیٹ میں جس کے سب زہر ہی زہر ہے/ پیٹ میرا کبھی گر دباؤ گے تم/ جس قدر زہر ہے/ سب الٹ دوں گا تم سب کے چہروں پہ میں!

(ایضاً،7 اپریل 1996،ص 1)

اختر الایمان کی یہ نظم نہ صرف ان کی ذات کا بہترین تعارف پیش کرتی ہے، بلکہ شاعر کے اندرون میں بھرا کرب بھی دکھاتی ہے۔ انور عظیم لکھتے ہیں ''اختر الایمان کی شاعری انسان کی روح کا کرب ہے، شاعر خود مجسم کرب ہے''۔ اختر الایمان کے کلام میں جسم ہی نہیں بلکہ روح بھی زخمی نظر آتی ہے۔ اسی زخم کا خون ہے جو ان کے کلام میں ایک رقت بن کر دوڑ رہا ہے۔ اس کرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انور عظیم لکھتے ہیں:

''اختر الایمان ایک ایسے شاعر ہیں جن کی تمام تر موشگافیاں بے ساختہ معلوم ہوتی ہیں۔ شاعر کچھ جھیل رہا ہے، شائد لمحہ لمحہ جینے کا کرب، جس پر اس کی بصیرت کا کوئی اختیار نہیں۔'' (ایضاً،24 اپریل 1994،ص 1)

انور عظیم نے اختر الایمان کی شاعری میں 'کربلا' کے استعارے کو ایک نئی معنویت کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک کربلا ایک ایسا استعارہ ہے جو تاریخ کے جنگلوں سے چھن کر ہم تک پہنچا ہے۔ اور یہ کربلا ہمارے جذبوں، آخرت کے تصورات اور رزم خواہی کی شہادت کا نام ہے۔ ان کا سوال ہے:

''کیا ہم اس استعارے کو اختر الایمان کے کلام میں دریافت کر سکتے ہیں؟'' (ایضاً،17 اپریل 1994،ص 1)

یہ سوال اٹھانے کے بعد انھوں نے اختر الایمان کی نظم 'کربلا' بھی پیش کی ہے، جس میں کربلا کے استعارے کو نظم کے پورے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم کا آخری حصہ ''تمام نالہ و شیون تھا، تشنگی تھی وہاں/ جہاں سے گزرے ہیں یہ دشت کربلا تو نہیں؟'' نظم میں کربلا کی استعاراتی معنویت پیدا کر دیتا ہے۔

(2)

انور عظیم کے نزدیک اختر الایمان کی شخصیت صرف شاعری تک ہی قابل احترام نہیں تھی، بلکہ انھوں نے اختر الایمان کے نثر کی جادوگری کو بھی محسوس کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 1996 میں اردو اکادمی، دہلی نے 'اس آباد خرابے میں' کے عنوان سے اختر الایمان کی خودنوشت کتابی شکل میں شائع کی، تو وہ ایک بار پھر اختر الایمان کے لیے تڑپ اٹھے۔ انھوں نے پہلے تو اردو اکادمی، دہلی کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا:

''یہ دیکھ کر دل کتنا اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اردو اکادمی، دہلی کبھی کبھی ایسا کام کر دکھاتی ہے جو اس کے

اچھے اچھے کاموں سے اچھا ہوتا ہے۔''

(ایضاً، 9/ مارچ 1997، ص 1)

اس بار کا اچھا کام اختر الایمان کی خودنوشت کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ کتاب کے موضوعات اور مشمولات کے متعلق انور عظیم لکھتے ہیں:

''اختر الایمان کے 'اس آباد خرابے میں' کیا نہیں ہے؟ کیوں، اس میں دل کا میل نہیں ہے، انسان دشمنی نہیں ہے، مغالطہ نہیں ہے، حقارت نہیں ہے، دوزخ نہیں ہے، نفرت نہیں ہے، بے دردی نہیں ہے، خارج از بدن شہوت واتبلا نہیں ہے؟'' (ایضاً، 9/ مارچ 1997، ص 1)

انور عظیم کے یہ تاثرات بظاہر شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان الفاظ کی کوکھ میں حقائق کی کتنی روحیں پوشیدہ ہیں اس کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو۔ یہ باتیں تو کتاب کے مباحث کے متعلق تھیں، لیکن انور عظیم کے نزدیک اس خودنوشت کی بنیادی خوبی کچھ اور ہے۔ ان کے مطابق یہ کتاب لسانی ارتقا اور سلیس نثر کے اعتبار سے ایک منفرد تخلیق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس آباد خرابے میں'' نثر کی کتاب ہے، جو غالب سے لے کر عہد فراق میں اختر الایمان تک، اردو زبان و ادب کی ایک شاندار روایت کی توثیق کرتی ہے اور اس روایت کو ایک تازہ جلا بخشتی ہے۔''

(ایضاً، 9/ مارچ 1997، ص 1)

اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے قبل بھی اردو ادب میں نثر کے بہترین نمونے سامنے آچکے تھے، لیکن ان سب کے باوجود کتاب کے متعلق انور عظیم کی یہ رائے قابل غور ہے۔ غالب نے جس سلیس نثر کی اردو ادب میں بنیاد ڈالی تھی، وہ کئی مراحل سے دوچار ہوئی، لیکن اس کے باوجود اگر اختر الایمان جیسا شخص بیسویں صدی کی آٹھویں، نویں دہائی میں ایسی سلیس نثر لکھ رہا ہو جو بیک وقت عہد غالب کی بھی یاد دلائے اور اپنے زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کرے، تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اسے سلیس نثری روایت کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔ انور عظیم نے اختر الایمان کی نثر کو غالب کی نثری روایت سے جوڑنے کے باوجود اس کی انفرادیت کا پہلو ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اختر الایمان کی اپنی زبان غالب کی نثری روایت میں ڈھلی ہوئی، مگر آج کے ٹھیٹھ لب و لہجے کی زبان ہے۔ جو زبان سے ٹپکے اور آنکھوں سے بھی۔''

(ایضاً، 16/ مارچ 1997، ص 1)

انور عظیم کے خیالات سے ثابت ہوتا ہے کہ ''اس آباد خرابے میں'' کی صنفی حیثیت مسلّم ہونے کے ساتھ، لسانی اہمیت بھی ہے۔ کیوں کہ میر جیسا شاعر اگر اپنی شاعری کو 'آپ بیتی' سے 'جگ بیتی' بنا دیتا ہے، تو انور عظیم کے مطابق اختر الایمان اپنی نثر کے ذریعے 'دل بیتی' کو 'جگ بیتی' بنا دیتے ہیں۔

(3)

انور عظیم کی نظر میں اختر الایمان کی حیثیت 'تشنگی کے ایک دہکتے ہوئے انگارے' کی تھی، جو کبھی بجھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اختر الایمان کا ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ یہاں 'اختر الایمان تنقید' کے حوالے سے ان کے خیالات ملاحظہ کیجیے۔ جب اختر الایمان کی جمالیات کا احاطہ کرتی ہوئی 'شکیل الرحمٰن' کی تازہ تصنیف 'اختر الایمان: جمالیاتی لیجنڈ 1997 میں' اردو مرکز، عظیم آباد' سے چھپ کر منظر عام پر آئی، تو انور عظیم نے انہیں ایک بار پھر اپنے کالم کا موضوع بنایا۔ کتاب سے دلچسپی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان کے پسندیدہ شاعر کو مختلف زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انور عظیم نے اس کتاب کے حوالے سے 'شکیل الرحمٰن کی اختر الایمان شناسی' کا دو کالموں میں جائزہ لیا۔ کتاب کی پہلی خوبی جو انور عظیم نے یہ محسوس کی، وہ یہ کہ:

''مصنف نے، جو تنقیدی نظر رکھتا ہے اور اپنے خیالات کے اظہار میں معتبر ہے، اپنے نقطۂ نظر سے شاعر کو دیکھا ہے۔'' (ایضاً، 29/ جون 1997، ص 1)

اس ایک جملے سے کئی باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ شکیل الرحمٰن کے اندر تنقیدی نظر موجود ہے۔ دوم یہ کہ ان کے تنقیدی افکار کی اہمیت ہے۔ اور سوم یہ کہ انھوں نے اختر الایمان کا مطالعہ اپنے نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ انہیں خوبیوں کی وجہ سے انور عظیم کو شکیل الرحمٰن کی 'اختر الایمان شناسی' کا طریقۂ کار پسند آیا۔ انور عظیم لکھتے ہیں:

''شکیل الرحمٰن نے اختر الایمان کا زہر خند پالیا ہے، ان کی شاعری کی کہکشاں بھی۔''

(ایضاً، 22/ جون 1997، ص 1)

انور عظیم کا یہ اعتراف گویا ایک ادیب کا دوسرے ادیب کی بصیرت کا اعتراف ہے۔ اختر الایمان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انور عظیم نے کہا تھا کہ ان کی شاعری میں 'روح کا کرب' موجود ہے۔ یہاں وہی کرب 'زہر خند' بن گیا ہے، اور اس 'زہر خند' تک شکیل الرحمٰن کی رسائی ہوگئی ہے۔ شکیل الرحمٰن، اختر الایمان کی شاعری میں کئی خوبیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی لیے انور عظیم لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں اختر الایمان کو سمجھنے کے لیے شکیل الرحمٰن کا نقطہ نظر بہت کام آسکتا ہے۔''

(ایضاً، 22/ جون 1997، ص 1)

شکیل الرحمٰن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے اختر الایمان کے چند اشعار اور ان کے متعلق شکیل الرحمٰن کے خیالات ملاحظہ کیجیے۔

میرے دامن پہ کئی اشک ہیں اب تک تازہ
میرے شانوں پہ وہی جنبش سر ہے اب بھی
میرے ہاتھوں کو ہے احساس انھیں ہاتھوں کا
میری نظروں میں وہی دیدۂ تر ہے اب بھی
آج آہٹ بھی نہیں   کوئی اشارہ بھی نہیں
کسی ڈھلکے ہوئے آنچل کا سہارا بھی نہیں

ان اشعار کے متعلق شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''ماضی اور یادوں کے تعلق سے یہ شعری تجربے ماضی کی جمالیات کے عمدہ تجربے ہیں۔ حسرت اور غم، انبساط اور چھتوں کے ملے جلے جذبات متاثر کرتے ہیں۔ اختر الایمان نے ماضی کی یادوں میں ڈوبنے کے باوجود اور ماضی کی تلخیوں اور بدلتے لمحوں کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کے حسن و جمال، زندگی کے تسلسل اور ارتقا کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ تلاش جمال ہے۔''

(ایضاً، 22/ جون 1997، ص 1)

شکیل الرحمٰن کی یہی وہ جمالیاتی نظر ہے جو انور عظیم کو متاثر کرتی ہے۔ انور عظیم کے مطابق یہی تنقیدی رویہ ایک بڑے فن کار کی تفہیم کا مناسب زاویہ ہے اور اسے سچا خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ انور عظیم کو یقین تھا کہ اختر الایمان احساسات و جذبات کی جمالیات کا شاعر ہے، اور شکیل الرحمٰن نے اپنی کتاب کے ذریعے ان کے اس یقین پر مہر ثبت کردی۔

انور عظیم صحیح معنوں میں اس شاعر کے قدرداں تھے، اور اسے پرکھنے کا ان کا اپنا زاویہ نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اختر الایمان کی شخصیت، شاعری، سوانح، نثر اور تنقید کا ایک بھی گوشہ انور عظیم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے اپنی تاثراتی و تنقیدی تحریروں کے ذریعے اختر الایمان کی مکمل بازیافت کی ہے۔ اردو ادب میں نہ ایسے شاعر کو بھلایا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اس کے قدرشناس کو۔

■

Faizanul Haque
Research Scholar, Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:8800297878

مسرت

معاصر ہندی شاعری اور 'نشنک' کا شعری مخاطبہ

ہندی شاعری کا باقاعدہ آغاز بھارتیندو ہرش چندر سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا زمانہ (1850-1900) تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھیں جدید ہندی شاعری کا 'بھیشم پتامہ' بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں شاعروں نے سماجی مسائل اور حب الوطنی جیسے موضوعات پر مبنی شاعری کی۔ بھارتیندو ہرش چندر، پرتاپ نارائن مشر، بدری نارائن چودھری 'پریم گھن'، رادھا چرن گوسوامی، امبیکا دت ویاس اس دور کے اہم شاعر ہیں۔

بھارتیندو ہرش چندر کے بعد پنڈت مہاویر پرساد دویدی کا دور آتا ہے۔ ان کا دور (1900-1920) تک مانا جاتا ہے۔ اس دور کے شاعروں نے موضوعات سے زیادہ زبان پر توجہ صرف کی اور ایسی نظمیں پیش کیں جو ان کی حب الوطنی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایودھیا سنگھ اپادھیائے 'ہری اودھ'، رام چرت اپادھیائے، جگن ناتھ داس 'رتنا کر'، گیا پرساد شکل 'سنیہی'، شری دھر پاٹھک، رام نریش ترپاٹھی، میتھلی شرن گپت، لوچن پرساد پانڈے اور سیارام شرن گپت کے نام نامی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کو دویدی دور سے موسوم کیا گیا ہے۔

رومانی دور میں بھی بہت سے شاعروں نے شاعری کے ذریعے اپنی پہچان بنائی اور ہندی شاعری میں اپنے نقوش چھوڑے۔ اس دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ قواعد کی پابندی کو لازمی خیال کیا گیا۔ رومانی دور کے شاعروں نے جذباتی شاعری پر اپنی توجہ صرف کی۔ اس دور کے اہم شاعروں میں جے شنکر پرساد، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، سمترا نندن پنت اور مہادیوی ورما کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ رومانیت کا دور (1920-1936) تک سمجھا جاتا ہے۔

پوسٹ کولونیل دور 1936-1943 تک مانا جاتا ہے۔ اس دور میں ہندی شاعری پر نئی آئیڈیولوجی اور تحریکات کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ ماکھن لال چترویدی، بال کرشن شرما نوین، سبھدرا کماری چوہان، رام دھاری سنگھ 'دنکر' ہری ونش رائے 'بچن'، بھگوتی چرن ورما، نریندر شرما، رامیشور شکل 'انچل'، شومنگل سنگھ 'سمن'، ناگارجن، کیدار ناتھ اگروال، ترلوچن اور رانگے راگھو اس دور میں اہم سمجھے جاتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے دور کی شاعری 1936 کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے شاعروں نے مارکسی نظریے کی حمایت کی۔ ترقی پسند شاعروں میں ناگارجن، کیدار ناتھ اگروال اور ترلوچن اہمیت کے حامل ہیں۔

(1943-1960) کے دور کی شاعری میں نئے نئے تجربات کیے گئے۔ اس دور کے شاعروں میں اگیے، گرجا کمار ماتھر، پربھاکر ماچوے، بھارت بھوشن اگروال، مکتی بودھ،، شمشیر بہادر سنگھ، دھرم ویر بھارتی، نریش مہتا، رگھو ویر سہائے، جگدیش گپت، سرویشور دیال سکسینہ، کنور نارائن اور کیدار ناتھ سنگھ نے شاعری میں اہم رول ادا کیا۔

تمام تجربات کو اپناتے ہوئے ہندی کویتا نے کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کیا۔ اس دور کے شاعروں نے ہندی ادب میں نئی شاعری سے عوام کو روبرو کرایا۔

جدید دور میں ہندی شاعری اپنا سفر کامیابی سے طے کر رہی ہے۔ جدید ذہن اور جدید لب ولہجے کے شاعروں کے نام بھی ہندی ادب کے حوالے سے سامنے آئے ہیں جو اپنی سنجیدہ شاعری کے ذریعے قارئین کی توجہ اپنی طرف راغب کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جدید شاعروں میں موضوعات کا تنوع بھی دکھائی دیتا ہے۔ سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی موضوعات پر جدید شعرا کے یہاں نظمیں ملتی ہیں۔

جدید دور میں ہندی شاعری اپنا سفر کامیابی سے طے کر رہی ہے۔ جدید ذہن اور جدید لب ولہجے کے شاعروں کے نام بھی ہندی ادب کے حوالے سے سامنے آئے ہیں جو اپنی سنجیدہ شاعری کے ذریعے قارئین کی توجہ اپنی طرف راغب کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جدید شاعروں میں موضوعات کا تنوع بھی دکھائی دیتا ہے۔ سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی موضوعات پر جدید شعرا کے یہاں نظمیں ملتی ہیں۔

جدید شاعروں میں ارون کمل، ونود بھاردواج، دیوی پرساد مشر، ول کمار، گگن گل، کاتیائن، کمار انج، رمیش پوکھریال 'نشنک' نچے چترویدی، بدری نارائن، لالٹو، موہن رانا، راکیش رینو وغیرہ نمایاں نام ہیں۔ ان تمام شاعروں کے یہاں نیا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے۔

جدید شاعروں کے یہاں نئے اسالیب، نیا ڈکشن

اور نئی اصطلاحات پر بہت زور ہے۔ نئی علامت اور نئے پیکروں کو بھی شاعری میں برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہونے والے واقعات ان شاعروں کی نظموں کے اہم موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری ذاتی تجربات و حادثات پر مبنی ہے لیکن اس میں ذاتی تجربات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل پر بھی غور وفکر ہے۔ دیہی اور شہری زندگی کا نقشہ بھی فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔

ارون کمار کی نظموں میں نیاپن دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں نئے ماحول اور نئے مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ثبوت (1981)، نئے علاقے میں (1996)، پتّی میں سنسار (2004) ان کے شعری مجموعے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ایجاز واختصار سے کام لیتے ہیں۔ مثال دیکھیں۔

میں جب لوٹا تو دیکھا
پوٹلی میں بندھے ہوئے چنے نے
پھینکے ہیں انکور
دو دنوں کے بعد لوٹا ہوں واپس
عجیب مہک ہے کمرے میں
کتابوں کپڑوں اور بے جان ہوا کی

(پھیلتی ہوئی مہک (زرخیز زمین): خورشید اکرم، جدید ہندی شاعری، تخلیق کار پبلشرز، ص:93)

ونود بھاردواج کا شمار بھی جدید شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ واقعات کو نظم کا پیرایہ عطا کرتے ہیں۔ 'بارش' ان کی اہم نظم ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ 'ہوا' نظم کے ذریعے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا تعلق صحافت سے ہے۔ ونود بھاردواج کی 'ہوا' نظم کا یہ بند دیکھیں۔

شیرے کی مہک میں ڈوبا
ایک گاؤں
مل کا منیجر خوش ہے کہ چینی کے بوروں پر
سر رکھ کر وہ اونگھ سکتا ہے
کام پر جانے کو بھاگتے
پھٹیل کارڈوں کو پنچنگ مشین میں پھنساتے لوگ
مل کے اس شور میں بھول جاتے ہیں
رسوئی گھر میں آنے والی ڈھیروں شکایتیں کہ برتنوں
پر جمنے والی دھول
ان کا رنگ بدلتی ہے
شیرے کی مہک میں ڈوبے
گاؤں کے لوگ سونگھ نہیں پاتے
مل منیجر کے خیال میں
یہی بہت ہے کہ وہ سن لیتے ہیں (ہوا)

(خورشید اکرم، جدید ہندی شاعری، تخلیق کار پبلشرز، ص:101)

دیوی پرساد مشر کا شمار بھی جدید ہندی شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندی ادب کو کئی خوبصورت نظمیں عطا کیں۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادب سے ان کو خاص لگاؤ ہے ساتھ ہی صحافت سے بھی ان کی وابستگی ہے۔ ان کی نظم 'کویتا' ملاحظہ کریں۔

ایک معمولی کویتا لکھنے کا
مزا ہی کچھ اور ہے ایک ایسی کویتا
جو انگوٹھے کے بارے میں ہو یا
اچانک شروع ہو گئی شام کے بارے میں
یا کسی اسٹیشن کے بارے میں جس سے
ہو کر آپ کبھی گزرتے تھے یا
ایک ایسے بڑے سے گیٹ کے لوہے کے بارے میں
جس کو چھو کر یہ لگتا تھا کہ
جیون میں نہیں بچی کوملتا (کویتا)

ول کمار بھی جدید ہندی شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی

زبان میں سادگی ہے۔ سادگی سے اپنی بات کہتے ہیں۔ 'سپنے میں ایک عورت سے بات چیت' پر بھارت بھوشن اگروال انعام سے نوازے جا چکے ہیں۔ ان کی اہم نظم 'سپنے میں ایک عورت سے بات چیت' ہے۔ ملاحظہ کریں۔

پہلے دروازہ کھٹکھٹایا اس عورت نے
سپنے میں
سپنے میں
کمرے میں گھستے ہوئے بولی کیسے ہیں میرے بچے
اب تو ہو گئے ہوں گے کافی بڑے
شادی کے لائق
اسکول کالج جاتے ہیں کہ نہیں؟
میں اس عورت سے کیا کہوں
کیسے کہوں
کہ اس کی منجھلی لڑکی بھاگ گئی ڈرائیور کے ساتھ
کیسے کہوں
کہ ان کے نام کٹ گئے
اور پتا نے گنوا دیے
جوئے اور شراب میں تمھارے زیورات
سپنے میں اس عورت کو میں نے کہا
تم بیٹھو تو سہی
کیسی ہو تم کچھ سناؤ
سپنے میں وہ عورت بولی بیٹھنا کیا؟
تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی چلتی ہوں
تم بے حد چپ ہو
کچھ بتاتے نہیں؟
تمھاری میز پر کیسے ہیں یہ بکھرے ہوئے کاغذ
بکسے میں کیا رکھا ہے تم نے
کمرے میں کچھ عجیب سی گندھ ہے
اچھا تمھاری نوکری کا کیا ہوا (سپنے میں ایک عورت
سے بات چیت)

(خورشید اکرم، جدید ہندی شاعری، تخلیق کار پبلشرز، ص:124)

گگن گل کا شمار بھی جدید ہندی شاعروں کی صف میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں گہرا تانیثی شعور نظر آتا ہے اور اپنے تانیثی لب ولہجے کی وجہ سے معروف ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی نظم 'ایک دن لوٹے گی لڑکی' پر بھارت بھوشن اگروال انعام بھی ملا۔ فی الحال وہ صحافت سے وابستہ ہیں۔ ان کی یہ نظم ملاحظہ کریں۔

وہ اسے پاپ کی طرح چاہے گی
وہ اسے پنیہ کی طرح چاہے گی
کسی انجان جگہ کے

انجان کمرے میں
وہ کرے گی اس سے پیار اپنے خیال میں
کہ جیسے نیند میں چلتے چلتے
پہنچ گئی ہو وہاں
بے وجہ، بنا بلائے (وہ اپنے بدن میں لوٹ آئے گی)

کمار امیج نئی نسل کی نمائندگی کرنے والے شاعر ہیں۔ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔'یہ صرف کواڑ نہیں ہیں' ان کی مشہور و معروف نظم ہے۔اس نظم کے لیے ان کو بھارت بھوشن اگروال انعام سے نوازا گیا۔نظم 'ایک استری پر کیجیے وشواس' ملاحظہ کریں۔

جب ڈہہ رہی ہوں آستھائیں
جب بھٹک رہے ہوں راستہ
تو اس سنسار میں ایک استری پر کیجیے وشواس
وہ بتائے گی سب سے چھپا کر رکھا گیا انوبھو
اپنے اندھیروں میں سے نکال کر دے گی وہی ایک قندیل
(ایک استری پر کیجیے وشواس)

نیچے چترویدی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ان کی نظموں میں طنز اور ظرافت موجود ہے۔ان کی نظموں کی اہم خوبی یہ

ہے کہ وہ طویل بیانیہ پر مبنی ہوتی ہیں۔دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔'پتنگ' نظم پر بھارت بھوشن اگروال بھی ملا۔

تین ترچھی پٹیوں والی پتنگ
مئی کی شام کے آکاش میں
اوپر جامنی
بیچ میں بسنتی
اور نیچے آسمان کی بسیط نیلاہٹوں میں
جادوئی فیروزہ
خلا میں زاویے کو بدلتی
ہوا کے ہنڈولے
اور برنولی کی تھیورم پر سوار
ہچکولے کھاکے ناؤ سی اترتی ہے لمحہ موجود میں
جیسے اترتا ہوا آکاش دیپ
افق کی کومل اور اندھیری ریکھاؤں میں (پتنگ)
(خورشید اکرم، جدید ہندی شاعری، تخلیق کار پبلشرز، ص:118)

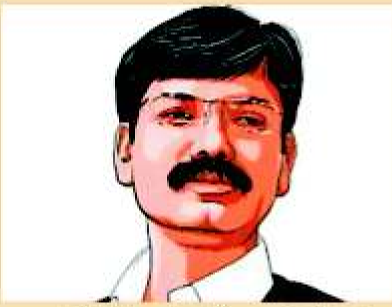

بدری نارائن کے یہاں بھی نیا لب ولہجہ نظر آتا ہے۔وہ اپنی نظموں میں اختصار اور تجربے سے کام لیتے ہیں۔'پریم پتر' ان کا شعری مجموعہ ہے۔درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔اپنی شاعری کے لیے بھارت بھوشن اگروال انعام سے نوازے جا چکے ہیں۔'پریم پتر' نظم دیکھیں۔

پریت آئے گا
کتابوں سے نکال لے جائے گا پریم پتر
گدھ اسے پہاڑ پر نوچ نوچ کھائے گا
چور آئے گا تو پریم پتر ہی چرائے گا
جواری پریم پتر ہی داؤ لگائے گا
رشی آئیں گے تو دان میں مانگیں گے پریم پتر
بارش آئے گی تو پریم پتر بہت گلائے گی
آگ آئے گی تو جلائے گی پریم پتر
بندشیں پریم پتر پر ہی لگائی جائیں گی
سانپ آئے گا تو ڈسے گا پریم پتر
جھینگر آئیں گے تو چاٹیں گے پریم پتر
کیڑے پریم پتر ہی کاٹیں گے
قیامت میں ساتوں رشی مچھلی
اور منوسب وید بچائیں گے
کوئی نہیں بچائے گا پریم پتر
کوئی روم بچائے گا کوئی مدینہ
کوئی چاندی بچائے گا کوئی سونا
میں نپٹ اکیلا کیسے بچاؤں گا تمھارا پریم پتر (پریم پتر)
(خورشید اکرم، جدید ہندی شاعری، تخلیق کار پبلشرز، ص:129)

ان کے علاوہ راکیش رینو بھی ہندی شاعری کے حوالے سے نمایاں نام ہے۔'روزنامچہ' اور 'اسی سے بچا جیون' ان کے شعری مجموعے ہیں۔موہن رانا بھی ہندی شاعری کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔

ان تمام شاعروں کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ان کی نظمیں اہم موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ہندی شاعری سے محبت کرنے والی نئی نسل میں ان کی نظمیں کافی پسند کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' بھی ایسے شاعر ہیں جو 'نشنک' ہندی ادب میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔انھوں نے مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں کامیاب نظر آتے ہیں۔شاعری، افسانہ، ناول، سفرنامہ وغیرہ میں انھوں نے اپنی تخلیقیت کے جوہر دکھائے ہیں۔

ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' کا شعری مجموعہ 'بھول پاتا نہیں' اس معنی میں اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں انسانی دکھ درد کے ساتھ ساتھ عام انسان کی محرومیوں اور ناکامیوں کو خوبصورت شعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔اپنی شاعری کے ذریعے انھوں نے عالمی مسائل کے ساتھ ساتھ معمولات زندگی میں پیش آنے والے ہر چھوٹے بڑے واقعات کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔وہ ادب کو انسانی فلاح و بہبود کے میڈیم کے طور پر منتخب کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ادب عام آدمی کے دکھ درد کو بیان کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔سیدھے اور عام فہم الفاظ میں ان کی نظم کو پڑھتے ہوئے ہم نئی کیفیت اور نئے احساس سے روبرو ہوتے ہیں۔نظم دیکھیں۔

میں نے ویدنا کو اپنی
گیتوں میں گنگنایا
اس کے سروں کو اپنی
آواز سے بنایا
رم جھم یہ ساون ہے
میرے پاس میرا من ہے
انمول یہ رتن ہے

ان کی شاعری میں عصری دور کی سفاک حقیقتوں کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اپنی نظموں میں انھوں نے بدلتے عہد اور وقت کا المیہ بیان کیا ہے۔ان کی شاعری میں احساس اور جذبات کی شدت نظر آتی ہے۔اقدار کی شکست کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے المیوں کی نشان دہی بھی ہوئی ہے جو ان کے شعری ذوق کو جلا بخشتی ہیں۔وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کو بھی پیش کرتے ہیں اور اپنے مقصد حیات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

'نشنک' جی کی زندگی بھی بہت سے نشیب و فراز سے گزری ہے لیکن وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کی نظمیں نئے سیاق اور نئے معنی اخذ کرتی ہیں۔ان کی

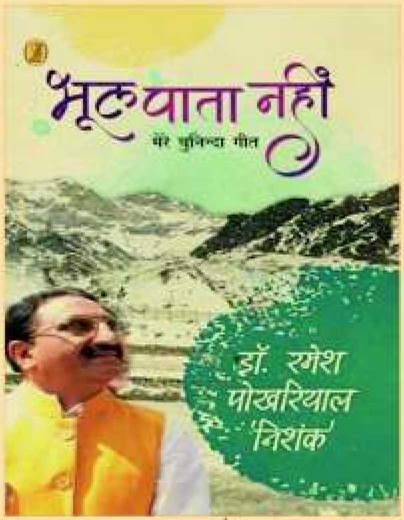

شاعری کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری کو کوئی مشکل نہیں پیش آتی۔ ان کا ماننا ہے کہ نئی توانائی اور طاقت زندگی کے تلخ تجربات سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

ابھی بھی ہے جنگ جاری
ویدنا سوئی نہیں ہے
منجتا ہوگی دھرا پر
سمویدنا کھوئی نہیں ہے
کیا ہے بلیدان جیون
نربلتا ڈھوئی نہیں ہے

ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' جی کی شاعری ہم عصر مسائل کے ارد گرد گھومتی ہے۔ ان کے خیالات اور موضوعات تخیلاتی نہیں ہیں بلکہ عام انسان کی زندگی کے بہت قریب ہیں۔ ان کے خیالات میں ندرت ہے۔ شاعری کا ذوق ان کے اندر فطری طور پر موجود ہے۔ وہ زندگی کے بہت سے تلخ تجربات سے گزرے ہیں اسی وجہ سے ان کی شاعری میں لہجے کی تلخی موجود ہے۔ انھوں نے عوام کو اپنے ملک کے تئیں ہمیشہ پیار اور محبت سے رہنے کی تلقین کی ہے۔ وہ دنیا کے ہر شخص کو محبت اور پریم کے دھاگے میں باندھنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور محبت واخوت پر زور دیتے ہیں۔

'نشنک' جی عملی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری حقیقی تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے۔ شاعر نے جگہ جگہ استعارات وتشبیہات سے کام لے کر اپنی نظموں میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کا شعری مجموعہ 'بھول پاتا نہیں' معیاری اور معتبر شاعری کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ تاریک گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تمام شاعری انسانی دکھ درد کی شاعری ہے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح نشنک جی نے بھی اپنے اردگرد کے ماحول سے اثر قبول کیا ہے لیکن پھر بھی ان کی نظمیں قنوطیت میں ڈوبی ہوئی نہیں ہیں بلکہ مثبت طرز فکر اپنانے پر زور دیتی ہیں۔

ان کی نظموں میں ذہنی کرب بھی نمایاں ہوا ہے۔ سماجی رشتوں کا انہدام، انسان سے محبت ایسے موضوعات ہیں جو ان کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ انسانی رشتوں میں تصادم اور ذہنی انتشار سے آج ہر انسان دوچار ہے۔ انھوں نے اس طرف بھی قاری کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے

تیرے لیے میں نے
نج کو مٹایا
تیرے لیے نج کو،
دردوں میں پایا
پھر بھی تو میں، ہرشن مسکرایا
بہت سمجھایا تجھے، بہت سمجھایا
پر کیا کروں، تو سمجھ نہ پایا

زبان پر ان کو مکمل دسترس حاصل ہے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے عالمی سطح پر ہونے والے مسائل کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ ذاتی تجربات ومشاہدات واحساسات سے انھوں نے اپنی نظموں میں نیاپن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے حادثات، انسان کے دکھ اور بے بسی اور لاچاری کو شاعر نے بڑی فنکاری کے ساتھ اپنی شاعری میں ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں یہ پیغام دیا ہے کہ وہی انسان زندگی میں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے جو اپنی محنت کے ذریعے زندگی کے تمام میدانوں کو سر کرتا ہے اور اپنی منزل مقصود حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' جی نے اپنی شاعری میں عام انسان کے دکھ درد کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مسائل تخیلاتی دنیا سے بالکل الگ ہیں۔ انسان کے دکھ درد اور ان کی تکلیف کا بیان ان کی نظموں میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ انھیں انسان کے دکھ درد اور ان کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اسی لیے وہ ان سے نظریں نہیں چرا پاتے۔ انھیں جو بھی مسائل نظر آتے ہیں ان کا بیان وہ اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ وہ معاشرے میں پھیلی بے راہ روی کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

'نشنک' جی نے انسانوں کے بیچ بڑھتی نفرت، ایک دوسرے کے تئیں بے رخی کا رویہ اور انسانیت کا خون جیسے موضوعات پر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ موجودہ وقت میں ہر انسان میں ایک بے چینی کی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ زمانہ کی بے راہ روی اور ذہنی کشیدگی سے بھی وہ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔

لکشیہ اس کا کیا بہت، گنتویہ اس کا ہے کہاں
آج ڈھونڈ و دیکھ کو یہ بھٹکتا کیوں ہے جہاں

ان کی ملک سے محبت اور سرشاری کا جذبہ بھی بہت واضح ہے۔ وہ وطن پر مر مٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھائی چارگی کا پیغام بھی دیا گیا ہے۔

ہر قدم اتہاس سورنم
ہم اسے گلنے نہ دیں گے
ہم سویم جل جائیں گے پر
دیش ہم جلنے نہ دیں گے

انھوں نے اپنی شاعری میں نوجوانوں سے بھی خطاب کیا ہے۔ وہ ان میں جوش، ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری صرف اظہار ذات نہیں ہے بلکہ اس سے معاشرے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ مسائل کا حل بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ ہندوستان کے عوام کو محبت واتحاد سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور ایسی دنیا کی تعمیر پر زور دیتے ہیں جہاں ہر مذہب وملت کے لوگ آپسی رواداری اور بھائی چارگی کے ساتھ رہتے ہوں۔ مثلاً

نفرت پھیلی قدم قدم پر اس کو آج مٹاؤ،
پریم کا دیپ جلاؤ، جگ میں پریم کا دیپ جلاؤ

نشنک جی پریم اور شانتی کی طرف عوام کا ذہن راغب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ محبت اور یقین کے ساتھ ساتھ ملک کے عوام کو بھائی چارگی اور اتحاد کے ساتھ رہنے پر زور دیتے ہیں۔ نفرت اور بغض کو مٹا کر شانتی اور پریم کی بات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا کی ترقی کا راز سکھ اور شانتی اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ سب کو ساتھ لے کر چلنے میں ہے۔

بانٹا ہے کچھ لوگوں نے، دیش کو ذاتی بھاشا میں،
اندھکار میں بھٹکے پھرتے، صبح صبح کی آشا میں
بھٹکے کبھی نہ کوئی جگ میں، ایسی راہ بناؤ،
پریم کا دیپ جلاؤ، جگ میں پریم کا دیپ جلاؤ

'نشنک' جی نے اپنے تجربات وحوادث کو شاعری کی شکل عطا کی ہے۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی المیے کے ساتھ عوامی دکھ درد کی ترجمان بھی ہے۔

ان کی نظموں کے مطالعے کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شاعری اہمیت کی حامل ہے اور قارئین کے لیے سوچ کے نئے در وا کرنے میں بھی کامیاب ہے۔ ادب کے طالب علم کو ان کی شاعری سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کو پڑھ کر ایک نئے عزم اور حوصلے کی تحریک ملتی ہے۔

■

Musarrat
New Delhi-110025

فیضان حسن ضیائی

عصری حسیت اور ساتویں دہائی کی اہم ہندی کہانیاں

ساتویں دہائی کا عرصہ ہندی افسانوی ادب کا سنہرا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف سماجی مسائل کی حکایت تھی تو دوسری جانب انسان کی ذات کا کرب بھی سمویا جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے افسانے کا موضوع ترقی پسندی کی خارجیت سے باہر نکل کر داخلیت کا متقاضی ہو رہا تھا۔ اردو میں جہاں جدیدیت کے رجحان نے افسانے کے ٹرینڈ میں تبدیلی پیدا کی تو وہیں ہندی میں نئی کہانی آندولن کے زیر اثر نئی تہذیب کے نئے تقاضوں کو جدید زاویہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اس عہد میں تبدیلی کا رجحان بھی بڑھا اور تجربات بھی کیے گئے۔ رسم و رواج میں تبدیلی، انسان کے فطری تقاضوں مثلاً جنسی آسودگی، محبت کا نیا مفہوم جس میں سڑکوں ہوٹلوں اور پارکوں کو بھی جگہ ملی۔ اعلی سوسائٹی کی چمک دمک اور روشن خیالی کے نام پر مرد و عورت کے رشتوں کی نئی معنویت بھی ابھر کر سامنے آئی۔ لہٰذا نئی کہانی آندولن کے زیر اثر لکھنے والے مصنفین نے زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے موضوعات، نقطۂ نظر، فلسفہ حیات، ہیئت اور اسلوب میں تبدیلی کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے معروف فکشن نگار کملیشور کے احساسات بھی ملاحظہ کیجیے:

''صدیوں جھوٹی بنی رہنے کے بعد اب کہانی سچی ہو گئی ہے۔ صدیوں کے اس پاپ سے نجات پانے کے لیے کہانی کو خود اپنے آپ سے اور اپنے چاروں طرف کے ماحول سے زبردست جہاد کرنا پڑا ہے۔ وقت اور بنی نوع انسان کے تفکرات کو اپنے دائرہ میں سمیٹ کر کہانی نے ایک انتہائی زور دار اور موثر ادبی صنف کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ رفتہ رفتہ کہانی نے سبھی انسانی فکروں کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیا جو دور حاضر کے اہم مسائل ہیں اور جو ہر ذی ہوش انسان کو ذہنی اور روحانی طور پر پریشان کرتے ہیں۔'' (ہندی کہانی کا سفر: رسالہ معلم اردو، لکھنؤ، ہندی کہانی نمبر، نومبر 1984، ص 6)

یہ مشینی دور تھا جس میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ انسان کی وقعت کم ہو رہی ہے بلکہ انسان اپنی شناخت کھوتا جا رہا ہے اور اس احساس نے انسان کو تنہائی کے کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس عہد کی ایک بڑی تبدیلی یہ بھی ہے کہ عورتیں گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل کر خود کفیل ہو رہی تھیں۔ تعلیم نے خواتین کو اپنے بارے میں سوچنے اور اپنے وجود کا احساس کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ماحولیاتی، نظریاتی اور موضوعاتی صورت حال کی تبدیل ہوتی ہوئی فضا میں کئی کہنہ مشق اور جدید افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے پرانے اصولوں، پرانی اخلاقیات، پرانے موضوعات اور نظریات سے انحراف کو اپنا امتیاز جانا۔ بھیرو پرساد گپت کے زیر ادارت شائع ہونے والا ماہنامہ 'کہانی' نے اس نئی فکر کے لیے ایک مثبت فضا قائم کی۔ اس دہائی کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے ڈاکٹر نامور سنگھ کی یہ رائے بھی اہم ہے:

''ساتویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے کہانی کی روایات سے حاصل شدہ سچائیوں کو متروک قرار دیا اور اوسط آدمی کی عام زندگی پر مطلق احساس، اجنبیت و جلا وطنی، انسانیت سے بعید سلوک اور خوف و ہراس کی عمیق ترین گہرائیوں میں جھانکنے کا جتن کیا جن سے اب تک آنکھ چرائی جاتی تھی۔'' (ہندی افسانے: ڈاکٹر نامور سنگھ، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، 1971، ص 316)

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں کئی رجحانات پیدا ہوئے۔ ان کے نام تو مختلف تھے لیکن یہ رجحانات فکری اور نظریاتی اعتبار سے بے حد قریب تھے۔ اس لیے کہانی ہو یا سماتنر کہانی، یا نئی کہانی اپنی مقصدیت اور منہاج کے اعتبار سے ان میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ بقول طارق چھتاری:

''نئی کہانی کے علاوہ 'اکہانی'، 'سچیتن کہانی' اور سماتنر

کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں مگر موضوعات، اسلوب اور زبان و بیان کے لحاظ سے یہ سارے رجحانات 'نئی کہانی' سے مختلف نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً تحریک کے نام بدلتے رہے تھے۔ تحیتن کہانی کے زیر اثر جو لوگ کہانیاں لکھ رہے تھے ان کا اسٹائل، موضوع، زبان، پس منظر غرضیکہ کچھ بھی نئی کہانی سے مختلف نہیں تھا۔''

(جدید افسانہ: اردو ہندی، طارق چھتاری، ص 166، براؤن بک پبلی کیشن، نئی دہلی 2015)

اس دہائی میں اپنی شناخت مستحکم کرنے والوں میں راجندر یادو، کملیشور، موہن راکیش، نرمل ورما، بھیشم ساہنی، گیان رنجن، منو بھنڈاری، دودھ ناتھ سنگھ، بلونت سنگھ، وکاشی ناتھ سنگھ وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں میں چند ایسے افسانہ نگار اور ان کے افسانوں کا ذکر رہا ہوں جو اس دہائی میں خصوصیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔

راجندر یادو: ممتاز فکشن نگار، صحافی، دانشور، ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور نئی ہندی کہانی کے بنیاد گزار راجندر یادو کا شمار ہندی ادب کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندی ساہتیہ کو ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف افسانے لکھے بلکہ افسانہ نگاری کی نئی نسل کی تربیت بھی کی۔ ان کا ادبی سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ ان کے کارنامے کسی ایک صنف ادب تک محدود نہیں بلکہ علم وفن کے دیگر شعبوں میں بھی موصوف کی گراں قدر خدمات موجود ہیں۔ ہندی افسانوں میں ان کے مجموعے کھیل کھلونے (1953)، جہاں لکشمی قید ہے (1957)، ابھیمنیو کی آتم ہتیا (1959)، چھوٹے چھوٹے تاج محل (1961)، کنارے سے کنارے تک (1962)، ٹوٹنا (1966) وغیرہ اہم یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر کہانیوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں جو مختلف نمائندہ کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ راجندر یادو کی کہانیاں زندگی کے لمحات، واقعات اور تاثرات کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ کہانی کے فن پر انھیں بے پناہ قدرت ہے اور قاری کو ہم خیال بنانے کا گر بھی انھیں خوب آتا ہے۔ عام طور پر ان کے کردار سماج کے ٹوٹے اور تھکے ہارے لوگ ہیں جو زندگی کے مختلف شیڈس میں نظر آتے ہیں۔

کملیشور: ساتویں دہائی میں اپنی شناخت مستحکم کرنے والوں میں کملیشور ایک معتبر نام ہے۔ مختلف الجہات خوبیوں کے مالک، ٹیلی ویژن آرٹسٹ، ساریکا جیسے معیاری رسالے کے مدیر اور معرکۃ الآرا ناول کے خالق ہونے کے ساتھ نئی ہندی کہانی کے ایک اہم ستون ہیں۔ جنھوں نے فکری سطح پر اہم موضوعات کی طرف توجہ کی ہے۔ ماحول اور زمانے کی بدلتی ذہنیت، اخلاقی اور جذباتی قدروں کی پامالی اور شہری زندگی کے بنیادی مسائل کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ ان کی پہلی کہانی 'کامریڈ' ایدہ سے شائع ہونے والا رسالہ 'اپسرا' میں (1950) شائع ہوئی تھی۔ کہانیاں لکھنے کا ابتدائی احساس کملیشور یوں بیان کرتے ہیں:

''جب سے اپنے چاروں طرف کی دنیا کو دیکھنا شروع کیا تو پایا کہ کہیں کچھ بدل نہیں رہا تھا اس لیے مجھے بدلنا پڑا۔ مجھے میرے چاروں طرف کی سچائیوں نے بدل دیا۔ دسواں پاس کرتے کرتے انقلابی سماجی پارٹی کے رابطے میں آیا۔ مارکسزم کی فعال پاٹھ شالا میں شامل ہوا اور 'جن کرانتی' میں شہیدوں کی سوانح حیات پر چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے شروع کیے۔''

(فرقہ وارانہ اور اردو ہندی افسانے محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1999، ص 255)

کملیشور کے تخلیقی کارناموں کی بڑائی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی قدر شناسی مختلف مکتبہ خیال کے اہل ذوق نے کی ہے۔ بلاشبہ انھوں نے ہندی کہانی کو ایک نئی سمت دے کر اپنی انفرادیت کا اعتراف کروایا ہے۔ کرشن چندر کی یہ رائے بھی ملاحظہ کیجیے:

''جدید ہندی افسانے میں کملیشور نے بہت نمایاں رول ادا کیا ہے۔ وہ اسے گھر کی چہار دیواری سے نکال کر کھیت، چوپال، سڑک اور فٹ پاتھ پر لے آیا ہے... مشکل لہجے میں بات کرنا آسان ہے لیکن آسان لہجے میں پیچیدہ اور مشکل بات کرنا بہت مشکل ہے۔ کملیشور نے اپنی حسی قوت سے اس مسئلے کو بخوبی حل کرلیا ہے۔'' (ایضاً)

کرشن چندر کے اس تاثراتی اقتباس کی روشنی میں کملیشور کی کہانی 'کھوئی ہوئی دشائیں' پر نظر ڈالتے ہیں۔ کملیشور نے اس کہانی میں شہر کی مصروف ترین زندگی میں ایک فرد کی ذہنی کشمکش کو قارئین کے حوالے کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار چندر ایک ایسا نوجوان ہے جو الہ آباد جیسے چھوٹے شہر سے ملک کی راجدھانی دہلی آتا ہے۔ شہری زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی دنیا میں مگن ہے ایسے میں شناسا چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں جہاں وہ خود اپنی ذات کی تلاش میں بے سمتی کا سفر کرتا نظر آتا ہے۔ جہاں دماغ اور پیٹ کا ساتھ بھی ایسا ہو گیا ہے کہ سوچنے پر بھی بھوک لگتی ہے۔

''اور کبھی چندر کو لگا کہ ایک عرصہ ہو گیا، ایک زمانہ گزر گیا، وہ خود سے بھی نہیں مل پایا... یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر تیرا حال کیا ہے اور تجھے کیا چاہیے، نہ جانے کیوں من خود سے ملنے میں گھبراتا ہے۔ رہ رہ کر کتراتا ہے۔

(کھوئی ہوئی دشائیں: کملیشور۔ ایک دنیا سامانتر، مرتب راجندر یادو، 1993، ص 142)

کہانی میں چندر کی محبوبہ اندرا اس کے لاشعور میں بسی رہتی ہے وہ اندرا جس سے چندر کو قلبی لگاؤ تھا۔ جس سے آنکھیں ملائے اسے سکون میسر نہیں ہوتا لیکن اسے اپنی معاشی تنگی کا بخوبی اندازہ تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اندرا اس کی شریک حیات بننے کے بعد پتھروں پر چلے اور کانٹوں بھری زندگی کا سامنا کرے اس لیے نرملا اس کی زندگی میں شریک حیات بن کر آتی ہے گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں چندر کو ذہنی تناؤ میں مبتلا کر دیتی ہیں وہ نرملا میں اندرا کا عکس دیکھنا چاہتا ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ملتی اور وہ ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔

موہن راکیش: (1925 تا 1972) موہن راکیش بھی نئی ہندی کہانی کے اہم ستون ہیں۔ ان کا ادبی سفر نہ صرف افسانوی ادب تک محدود رہا بلکہ ناول، تنقید، اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت ادبی حلقوں میں محفوظ رہی ہے۔ موہن راکیش کے یہاں موضوعات کی مختلف جہتیں نظر آتی ہیں۔ فرد معاشرہ اور وقت کے نشیب وفراز کے پیچیدہ مسائل نے راکیش کو فکری سطح پر اپنی گرفت میں رکھا ہے۔ ان کی کہانیوں میں فرسودہ اور غیر حقیقی رسم ورواج کا اختلاف نمایاں نظر آتا ہے۔ موہن راکیش لکھتے ہیں۔

''میرے لیے تجربے کا سیدھا راستہ میری سچائیوں سے ہے اور سچائی ہی میرا زمانہ ہے اور ماحول۔ آدمی سے خاندان خاندان سے قوم اور قوم سے انسانی معاشرے کا پورا دائرہ۔ میں ان میں سے کسی ایک سے کٹ کر باقی سے منسلک نہیں رہ سکتا۔ اپنے پاس کے ماحول سے آنکھ ہٹا کر دور کی فضاؤں میں جی نہیں سکتا۔''

(بحوالہ فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے، محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1999، ص 248)

راکیش کے خیال میں عصری مسائل ومعاملات پر توجہ مرکوز رکھنا اہم فریضہ ہے گزرے ہوئے زمانے پر آنسو بہانا بے سود ہے۔ درج بالا اقتباس کی روشنی میں ان کی کہانی 'ایک اور زندگی' پر نظر ڈالتے ہیں۔ کہانی ایک اور زندگی دو بیویوں کے درمیان ایک شخص کی بے مزہ زندگی کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو اجاگر کیا گیا ہے۔ معاشرے میں پنپنے والے جدید ذہن نے میاں بیوی کے درمیان روایتی زندگی گزارنے کے عمل کو جس طرح مسمار کیا ہے اور جو خوفناک نتائج دن بہ دن ہمارے سامنے آرہے ہیں اس کی تصویر یہاں دکھائی دیتی ہے۔ اس کہانی میں وینا

پرکاش کی پہلی بیوی کی شکل میں سامنے آتی ہے جس سے ایک بیٹا بھی ہے۔ وینا ایک تعلیم یافتہ، خود دار، ماڈرن اور اپنی شخصیت سے پر اعتماد لڑکی ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی وینا پرکاش سے مضبوط ہے۔ وہیں پرکاش بھی اپنی شخصیت کے سلسلے میں بیدار ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے مسائل بھی پہاڑ بن جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بالآخر الگ الگ زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ اس درمیان ایک بچے کی ولادت ہوتی ہے جسے خود وینا ایک آکسمک گھٹنا تسلیم کرتی ہے۔

نرمل ورما: ساتویں دہائی کا ایک اہم ترین نام نرمل ورما بھی ہے۔ نرمل ورما نے اپنے عہد کو جس طرح سمجھا اور سمجھ کر جس طرح اپنی کہانیوں میں برتا ہے وہ ان کی انفرادیت کا ایک اہم باب ہے۔ شہری زندگی، پہاڑ، جنگل، سفر اور پردیس کے پس منظر میں ان کی کہانیوں نے تنہائی، رشتے، ناطے اور ذات کی تہہ داریوں کا بہت قریب سے مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی کہانیاں عصری زندگی کی پیچیدگیوں کی آگہی اور بصیرت میں قاری کو شریک کر لیتی ہیں ڈاکٹر نامور سنگھ، کتے کی موت، مایا درپن اور لندن کی ایک رات کے پس منظر میں انھیں پرگتی شیل کہانی کار تسلیم کرتے ہیں۔ وہیں ان کی مشہور زمانہ کہانی 'پرندے' کو نئی کہانی کا نقطہ آغاز بھی بتاتے ہیں۔ آیئے اس کہانی پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ کہانی 'پرندے'' آزادی کے بعد ایک مخصوص طبقے میں پنپنے والی نفسیاتی اور ذہنی کشمکش کا کامیاب اظہار ہے۔ اس کا مرکزی کردار لتیکا ہے جو اسکول کی ٹیچر بھی ہے اور وارڈن بھی۔ یہاں آنے کے بعد اس کی زندگی ایک محدود دائرے میں سمٹ گئی ہے۔ جس کی وجہ میجر گریش نیگی سے اس کی ملاقات ہے۔ ڈاکٹر مکر جی نے ایک تقریب میں لتیکا کو گریش نیگی سے متعارف کرایا تھا۔ اس ملاقات کا اثر لتیکا پر یوں ہوتا ہے کہ گریش نیگی کو وہ اپنے مستقبل کا حصہ تصور کرنے لگتی ہے۔ لیکن میجر نیگی اس اسکول کے علاقے سے کشمیر گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ یہی وہ کرب ہے جو لتیکا کے لیے تنہائی کا سبب بن جاتا ہے اور وہ سردیوں کی طویل چھٹیاں بھی ہاسٹل میں گزار دیتی ہے کہ شاید میجر نیگی لوٹ آئیں۔ گویا محبت میں اس ناکامی کے باوجود وہ اپنی خوبصورت یادوں کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتی ہے اور اسی کے سہارے اپنی زندگی کا سفر بھی طے کرنا چاہتی ہے۔ بقول کہانی کار:

''لتیکا کو لگا جو وہ یاد کرنا چاہتی ہے وہی بھولنا بھی چاہتی ہے۔ لیکن جب وہ سچ مچ بھولنے لگتی ہے تب اسے خوف آتا ہے جیسے کوئی چیز اس ہاتھوں سے چھین لے جا رہا ہے۔ ایسا کچھ جو سدا کے لیے کھو جائے گا۔ من میں جب کبھی وہ اپنے کسی کھلونے کو کھو دیا کرتی تھی تو وہ گم سم سی ہو کر سوچا کرتی تھی کہ کہاں رکھ دیا میں نے؟ جب بہت دوڑ دھوپ کرنے پر کھلونا مل جاتا تو وہ بہانا کرتی کہ ابھی اسے کھوج رہی ہے۔

جس جگہ پر کھلونا رکھا ہوتا جان بوجھ کر اسے چھوڑ کر گھر کے دوسرے کونوں میں اسے تلاش کرتی ہے۔ تب کھوئی ہوئی چیز یاد رہتی، اس لیے بھولنے کا خوف نہیں رہتا تھا۔ آج وہ بچپن کے اس کھیل کا بہانہ کیوں نہیں کر پاتی۔ بہانہ شاید کرتی ہے۔ اسے یاد کرنے کا بہانہ جو اسے بھولتا جا رہا ہے... دن مہینے بیت جاتے ہیں اور وہ الجھی رہتی ہے، انجانے میں گریش کا چہرہ دھندلا پڑ جاتا ہے۔ یاد وہ کرتی ہے لیکن جیسے کسی پرانی تصویر کے دھول بھرے شیشے کو صاف کر رہی ہے اب ویسا درد نہیں ہوتا صرف اس درد کو یاد کرتی ہے جو پہلے کبھی ہوتا تھا تب اسے اپنے اوپر شرمندگی ہوتی ہے۔ وہ پھر جان بوجھ کر اس زخم کو کریدتی ہے جو بھرتا جا رہا ہے، خود بخود اس کی کوششوں کے باوجود بھرتا جا رہا ہے۔''

(پرندے: نرمل ورما، بحوالہ ایک دنیا سماناتر: راجندر یادو، ص 186)

لتیکا کی دلچسپی کسی دوسری جانب نہیں ہوتی لیکن ہیوبرٹ دل ہی دل میں اس کے لیے جذبہ ہمدردی اور الفت کا اظہار بھی ایک خط میں کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مکھر جی بھی لتیکا میں لاشعوری طور پر دلچسپی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

'' مس لتیکا میں کبھی کبھی سوچتا ہوں، کسی چیز کو نہ جاننا اگر غلط ہے تو جان بوجھ کر نہ بھول پانا ہمیشہ جونک کی طرح چپٹے رہنا یہ بھی غلط ہے۔ برما سے آتے وقت جب میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، اس وقت مجھے اپنی زندگی بے کاری لگنے لگی تھی۔ آج اس حادثے کو عرصہ گزر گیا اور جیسا آپ دیکھتی ہیں، میں جی رہا ہوں۔ امید ہے کہ عرصہ دراز تک یوں ہی جیتا رہوں گا۔ زندگی کافی دلچسپ لگتی ہے۔ اور اگر عمر کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید میں دوسری شادی کرنے میں بالکل نہ ہچکچاتا۔''

(پرندے: نرمل ورما، ایک دنیا سماناتر، راجندر یادو، نئی دہلی، 1993، ص 191)

میجر، ہیوبرٹ، ڈاکٹر مکھر جی اور تمام لوگ اپنے دل کے نہاں خانے میں لتیکا کے لیے جذبہ محبت تو رکھتے ہیں لیکن محبت کی حقیقی تعریف پر کھرا نہیں اترتے۔ یہ بھی موسمی پرندے ثابت ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ اپنے اپنے سفر پر رواں دواں نظر آتے ہیں ہیں۔ بقول طارق چھتاری:

''اس کہانی کا عنوان بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ آج کا انسان ان پرندوں کی مانند ہے جو ہر موسم سرما میں انجان میدانوں کی جانب سفر کرتے ہیں، راہ کی کسی پہاڑی پر لمحے بھر کے لیے رکتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جن کی زندگی کا سفر ایک محدود دائرے میں (ذات کے دائرے میں) چکر کاٹتا رہتا ہے۔ بے مقصد اور اپنے اپنے درد کو دل میں چھپائے...!

(جدید افسانہ: اردو ہندی، طارق چھتاری، ص 166)

یہ ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو محبت میں ملے زخم کو اپنے دل میں ہمیشہ تازہ رکھنا چاہتی ہے۔ وہ مختلف پروگراموں میں شامل ہوتی ہے۔ زندگی کے معمولات طے ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کے اندر کا کرب ہمیشہ تازہ رہتا ہے اور جب کبھی یہ زخم مندمل ہوتا ہے وہ اسے کرید کر تازہ کر دیتی ہے۔ کہانی کار نے اسے ایک لڑکی نہیں بلکہ ادھیڑ عمر کی عورت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ محبت کی راہ میں ایک زخم خوردہ دل کی حسیت کو کہانی کار نے ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

منو بھنڈاری: ہندی افسانوی ادب میں خواتین افسانہ نگاروں کے درمیان منو بھنڈاری ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ اکیلی، ایک پلیٹ سیلاب، یہی سچ ہے، تیسی کے گھر انسان، نکتی اور سیانی بوا ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے طرز معاشرے، توہم پرستی، کھوکھلے رسم و رواج اور ان پر غیر ضروری پابندیوں کے خلاف آوازیں بلند کی ہیں۔ معاشرے کے بنیادی مسائل (خاص کر عورتوں کے حوالے سے) کا مشاہدہ کرنے کے بعد عورتوں کی اپنی ضرورتیں، ان کے مساویانہ حقوق، نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل وغیرہ کو نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ آیئے کہانی 'یہی سچ ہے' پر نظر ڈالتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر جدید عہد میں عورتوں کی طرز زندگی نے جسمانی اور روحانی طور پر جو آزادانہ روی اختیار کی ہے اس کی تصویر کہانی ''یہی سچ ہے'' میں نمایاں ہے۔ اس کہانی میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکی کا ایک آزادانہ کردار ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ بیک وقت دو لڑکوں سے عشق کرتی ہے۔ اور دونوں کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اسے سکون بخشتے ہیں جب وہ کانپور میں رہتی ہے تو نشے میں ہی اسے زندگی کے ہر رنگ نظر آتے ہیں اور جب کلکتہ کا سفر کرتی ہے تو قدیم ہم جماعت نشیتھ میں کشش محسوس کرنے لگتی ہے۔

کہانی میں دیپا کا کردار عصری مسائل کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ آج کے عہد میں ہمارے اردگرد کئی ایسے معاملات پیش آتے ہیں جب ایک لڑکی دو لڑکوں سے وابستہ پائی جاتی ہے۔ یہ مسائل خون خرابے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ ایک انوکھا کردار ہے جو لڑکی کی نفسیات پر غور کرنے کو مجبور کرتا ہے۔ اس میں ایک جانب آج کے دور میں ایک لڑکی کی آزاد خیالی اور خودمختاری کی بات پوشیدہ ہے تو دوسری جانب وہ جس کے قریب ہوتی ہے اسی میں کشش محسوس کرنے لگتی ہے۔ اس کہانی میں دیپا کا کردار عشق کی ایک ایسی حقیقت لے کر ابھرتا ہے جو حالات کے تابع ہے۔ طارق چھتاری کے مطابق:

''منو بھنڈاری نے یہ کہانی لکھ کر ثابت کر دیا کہ عشق کی Reality وہ نہیں ہے جو اب تک ہندی کہانی میں پیش کی جاتی تھی بلکہ یہ ہے جو اس کہانی کی دیپا کے ساتھ گزری ہے۔'

کچھ اس طرح کا خیال میرا اسکری کا بھی ہے۔

''کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں عورت ایک مختلف روپ لیے، ایک آزاد شخصیت لیے سامنے آتی ہے، عورت کا یہ روپ ہندی کے لیے ایک دم نیا ہے۔'' (جدید افسانہ: اردو ہندی، طارق چھتاری، ص 166)

گیان رنجن: گیان رنجن بھی اس عہد سے تعلق رکھنے والے ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں واقعات اور کردار عام زندگی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی مختلف جہات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے اپنے دور میں عصری حسیت اور خود آگہی کے حامل رہے ہیں۔ میرے پیش نظر ان کی کہانی 'فینس کے ادھر اور ادھر' ہے فینس ایک ٹوٹی ہوئی دیوار ہے جو دو تہذیبوں کی علامت ہے۔ یعنی ایک وہ تہذیب جو پرانی قدروں کی حامل ہے اور دوسری وہ جو نئی قدروں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانی دراصل بدلتے سماجی سروکار کی کہانی ہے۔ جس میں پرانے پڑوسی کھرجی کے تبادلے کے بعد نئے پڑوسی قیام پذیر ہیں جن کا ایک مختصر کنبہ ہے۔ جب سے نئے پڑوسی آئے ہیں وہ لوگ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں اپنے ہمسایہ اور آس پاس کے لوگوں سے ان کا کوئی میل جول نہیں رہتا ہے۔ دوسری جانب دیوار کے اس پار کی دنیا اس کی خیر و خبر رکھنا چاہتی ہے۔ ان کے بارے میں مسلسل گفتگو کرتی ہے اور دلچسپی لیتی ہے۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ان سے رابطہ کیسے قائم ہو۔ لیکن دوسری جانب کے لوگ اپنے ہمسایہ کی

ساتویں دھائی میں خصوصیت سے یاد رکھے جانے والے ان مذکورہ کہانی کاروں کے علاوہ بھی کئی اہم کہانیاں اور نام ہیں جنھوں نے ساٹھ کے بعد اپنا مقام بنایا اور ہندی کہانی کو ہیئت، اسلوب، موضوعات اور فن کی سطح پر اعتبار بخشا ہے۔ جن میں رویندر کالیہ، کاشی ناتھ سنگھ، شری کا نت ورما، مہرالنسا پرویز دودھ ناتھ سنگھ، ناصرہ شرما، عبد ل بسم اللہ، بلونت سنگھ وغیرہ کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے۔ جن کے یہاں انسان کی داخلی کیفیات بھی ہیں، سماجی حقیقت نگاری بھی اور اپنے عہد کا گہرا سیاسی و سماجی شعور بھی۔

فکروں سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور اپنے ہمسایہ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ موجودہ معاشرے میں ایک دوسرے سے لاتعلقی اور نئی پرانی قدروں کے بکھراؤ کو کہانی کار یوں بیان کرتا ہے۔

''... بڑے شہروں میں ایک دوسرے سے بے تعلق اور اپنی ذات میں محصور رہنے کی جو خاصیت پائی جاتی ہے غالباً ہمارے یہ پڑوسی اسی خاصیت اور فطرت کے حامل ہیں۔ یہ شہر اور یہ محلہ دونوں پر سکون ہیں۔ یہاں لوگ آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور نسبتاً لاابالی سے چہل قدمی کرتے ہیں کیونکہ یہاں کی زندگی میں کوئی ہلچل نہیں ہے۔ اسی لیے ہمیں اپنے پڑوسی عجیب لگتے ہیں۔ میں باہر نکلتا ہوں وہ لوگ صبح کی چائے پی رہے ہوتے ہیں۔ میاں بیوی کے علاوہ ایک لڑکی بھی ہے جو غالباً ان کی بیٹی ہے۔ یہی تین فرد ہمیشہ نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں شاید چوتھا کوئی نہیں ہے۔ لڑکی اگرچہ خوبصورت تو نہیں لیکن سلیقہ شعار معلوم ہوتی ہے۔ ڈھنگ سے میک اپ کرے تو شاید خوبصورت بھی نظر آئے، میں دیکھتا ہوں کہ وہ اکثر ہنستی رہتی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی ہنستے رہتے ہیں۔ وہ سب ہمیشہ خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ وہ کس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور وہ کیوں ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں؟ کیا ہر وقت ہنستے رہنے کے لیے ان کی زندگی میں ان گنت خوشگوار واقعات ہیں؟ کیا وہ زندگی کے پر پیچ اور حقیقی مسائل سے غافل ہیں؟ مجھے حیرت ہوتی ہے اور میں اپنے گھر کے افراد کا ان لوگوں سے موازنہ کرنے لگتا ہوں۔ (فینس کے ادھر اور ادھر، گیان رنجن، بحوالہ ہندی افسانے، ص 213-14)

کہانی کا 'میں' دل ہی دل میں اس لڑکی سے عشق کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کی شادی کہیں اور ہو جاتی ہے۔ دودھ والے سے شادی ہونے کی خبر تو مل گئی لیکن والدین سے جدائی کی اس گھڑی میں اس کی آنکھوں میں ایک بوند آنسو نہ تھے۔ یہ حیرت ناک منظر دیکھ کر ماں کی کربناک آواز دیکھیے۔

''پیٹ کاٹ کر جنھیں پالو پوسو ان کی آنکھوں میں ایک بوند آنسو بھی نہیں۔

جدید عہد کے اس المیے کو کیا کہیے؟ بہت پہلے اقبال نے مشینوں کی حکومت کو دل کے لیے موت قرار دیا تھا آج جنریشن گیپ اس طرح حاوی ہے کہ پڑوسی کی شادی محبتیں اور رسمیں بھی جنریشن گیپ کی نذر ہو گئیں۔ چاچی کہنے لگے۔

''قدیم زمانے میں لڑکیاں رخصتی کے وقت بے تحاشا رویا کرتی تھیں... چاچی کو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ آج ویسا نہیں ہے۔۔ پرانا زمانہ رخصت ہو رہا ہے

اور آدمی کا دل مشین ہو گیا ہے۔

اس صورت حال سے تشویشناک حد تک دادی متاثر ہوئیں وہ زیر لب بڑبڑا رہی ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شادی بیاہ ایسے بھی ہوتا ہے۔ ان کا لہجہ تلخ ہو اٹھا۔

''... پھر ایسے موقع پر پڑوسی کو نہ پوچھنا، واہ رے انسانیت! رام رام۔ (ایضاً، ص 217)

پروفیسر لطف الرحمٰن نے بجا لکھا ہے۔

اتنا چپ چاپ تعلق پہ زوال آیا تھا
دل ہی رویا ہے نہ چہرے پہ ملال آیا تھا

ساتویں دہائی میں خصوصیت سے یاد رکھے جانے والے ان مذکورہ کہانی کاروں کے علاوہ بھی کئی اہم کہانیاں اور نام ہیں جنھوں نے ساٹھ کے بعد اپنا مقام بنایا اور ہندی کہانی کو ہیئت، اسلوب، موضوعات اور فن کی سطح پر اعتبار بخشا ہے۔ جن میں رویندر کالیہ، کاشی ناتھ سنگھ، شری کانت ورما، مہرالنسا پرویز دودھ ناتھ سنگھ، ناصرہ شرما، عبدل بسم اللہ، بلونت سنگھ وغیرہ کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے۔ جن کے یہاں انسان کی داخلی کیفیات بھی ہیں، سماجی حقیقت نگاری بھی اور اپنے عہد کا گہرا سیاسی و سماجی شعور بھی۔

■

Dr.Faizan Hasan Zeyai
S/O Late Dr Mozaffar Hasan Aali
MOH - Baradari, PO+PS Sasaram
Distt.: Rohtas - 821115 (Bihar)
E-mai . faizanzeyai.ssm@gmail.com
Mob 7631887356/ 7903399020

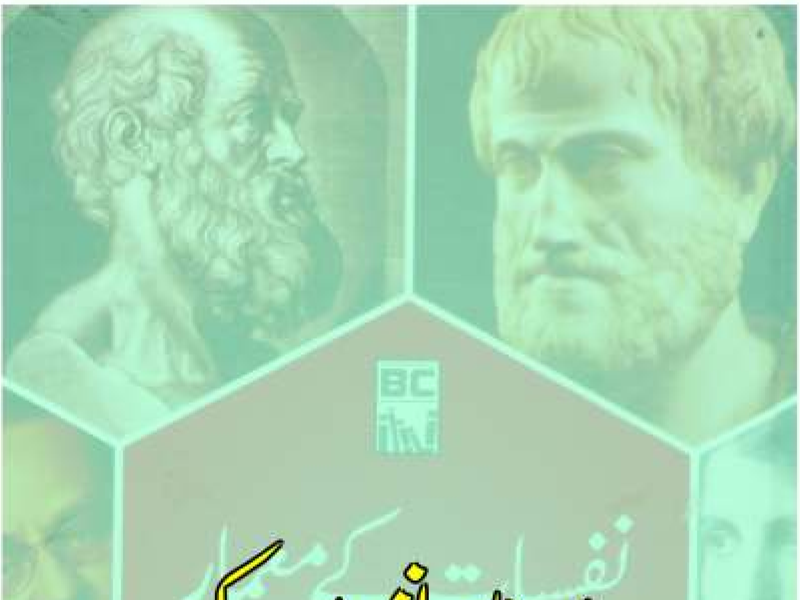

اردو میں نفسیات کی ترویج واشاعت میں سید اقبال امروہوی کی خدمات

غلام نبی مومن

قدیم زمانے میں علم نفسیات، فلسفے کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا۔انیسویں صدی میں نفسیات پر اتنا کام ہوا کہ اس نے ایک علاحدہ علم کی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ علم انسانی شخصیت، کردار، ذہن اور باطنی زندگی سے بحث کرتا ہے اس لیے اس علم سے واقفیت لازمی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اردو میں نفسیات کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا۔ تحقیق کے مطابق نفسیات پر پہلی کتاب انعام علی کی 'علم النفس' ہے جو 1885 میں شائع ہوئی تھی اور کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے غالباً 1916 میں 'فلسفۂ جذبات' اور 'ہم آپ' لکھی۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد، دکن) کے دارالترجمہ نے نفسیات کی تقریباً دو درجن انگریزی کی کتابوں کے ترجمے کروائے، مثلاً احسان احمد نے ولیم جیمس کی کتاب Principles of Psychology کا ترجمہ 'اصول نفسیات' کے نام سے تین جلدوں میں کیا۔ اگرچہ یہ کتابیں درسی نوعیت کی تھیں لیکن ان کتابوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مترجمین نے نفسیات کی انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات وضع کرلیے جن میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے نفسیات کے اصول ونظریات سے اردوداں طبقہ بھی فیضیاب ہوا۔

اردو میں نفسیات پر شائع ہونے والے بیشتر مضامین اور کتابوں کا تعلق تنقید، تعلیم اور بچوں کی نشوونما سے ہے۔ ان سے طلبہ، اساتذہ اور ادبا تو مستفیض ہوتے ہیں لیکن عام افراد فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ مشہور ادیب ابن فرید نے نفسیاتی تنقید کے علاوہ انسانوں کے نفسیاتی مسائل مثلاً ذہنی الجھن، ازدواجی زندگی کے مسائل وغیرہ پر بھی چند مضامین تحریر کیے ہیں لیکن موصوف بنیادی طور پر نقاد تھے۔

نفسیات کو اردو میں عام کرنے کے لیے جس شخص نے مسلسل مضامین اور کتابیں تصنیف کیں، ان کا نام ہے سید اقبال امروہوی۔ وہ 21/اپریل 1938 کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی عبدالغفار 1945 میں ممبئی آگئے تھے۔ اقبال امروہوی نے ممبئی کے احمد سیلر ہائی اسکول سے 1957 میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور معاشی مجبوری کے سبب ممبئی کارپوریشن کے محکمہ تعلیم کے انتظامی شعبے میں ملازمت اختیار کرلی۔ دوران ملازمت پونہ یونیورسٹی سے 1971 میں انھوں نے بی۔اے کی سند حاصل کی اور 1994 میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

اقبال امروہوی نے اپنا ادبی سفر بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے سے شروع کیا۔ خوش قسمتی سے ان کی رہائش مکتبہ جامعہ کی دکان کے اوپر تھی۔ اس زمانے میں شاہد علی خان مکتبہ کے انچارج تھے۔ ان کی وساطت سے اقبال امروہوی کی کہانیاں 'پیام تعلیم' میں چھپنے لگیں۔ غیر ملکی کہانیوں کے ترجمے پر مشتمل ان کی کتاب 'تین کوڑیاں' بھی مکتبہ جامعہ سے 1964 میں شائع ہوئی۔

اقبال امروہوی کو نفسیات کے مضمون سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ پاکستان میں نفسیات پر چھپی ہوئی کتابیں مکتبہ سے خرید کرلے جایا کرتے تھے۔ ایک بار مکتبہ میں موصوف کی ملاقات ظ۔انصاری سے ہوگئی۔ ظ۔انصاری نے موصوف کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انھیں نفسیاتی موضوعات پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی۔ موصوف نے ایک مضمون لکھا جسے ظ۔ انصاری نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ 'دورِ حیات' میں شائع کیا۔ اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی مضامین تحریر کیے جو ماہنامہ 'سریتا' (دہلی)، 'آجکل' (دہلی) اور 'شاعر' (ممبئی) میں شائع ہوتے رہے۔ چند مضامین ماہنامہ 'نفسیات' (کراچی) میں شائع ہونے کے سبب وہ پاکستان میں بھی معروف ہوگئے۔ موصوف آخری دم تک نفسیات کی ترویج واشاعت میں مشغول رہے اور نفسیاتی الجھنوں سے پریشان افراد ان کے مشوروں سے مستفیض ہوتے رہے۔

کسی بھی علم پر دسترس حاصل کرنے کے لیے اس علم کی اصطلاحات کی تفہیم ضروری ہوتی ہے۔ اقبال امروہوی کو انگریزی میں Dictionary of Psychology دیکھ کر خیال آیا کہ اردو میں علم نفسیات کو عام فہم بنانے کے لیے اس طرز کی کتاب لکھی جائے تاکہ نفسیات کی کتابیں اور رسائل پڑھنے والے اس فرہنگ کی مدد سے ان کتابوں کے مشمولات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ چونکہ یہ وقت طلب تحقیقی کام تھا اس لیے موصوف نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اس جانب توجہ کی۔ ان کی کئی برسوں کی محنت کے بعد 'اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم' 2001 میں منظرِ عام پر آئی۔

اقبال امروہوی نے انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات کا تعین کرنے کے لیے جامعہ عثمانیہ کی نفسیات کی درسی کتب کو کھنگالا، ترقی اردو بیورو (دہلی) کی شائع کردہ 'فرہنگِ اصطلاحات (فلسفہ، نفسیات، تعلیم)' اور پاکستان سے چھپی ہوئی نفسیات کی درسی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ کسی اصطلاح کی تشریح میں بعض مصنفین میں اختلاف پایا تو اس تشریح کو قبول کیا جو انگریزی کی تشریح سے میل کھاتی تھی۔ مذکورہ کتاب کے آخر میں انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو مترادفات کی فہرست دی گئی ہے۔ اس بنا پر اس کتاب سے وہ طلبہ بھی مستفید ہو سکتے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے لیکن وہ انگریزی ذریعۂ تعلیم سے نفسیات کا مضمون پڑھ رہے ہیں۔ یہ کتاب ان افراد کے لیے بھی مفید ہے جو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ عام فہم زبان میں اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔ اصطلاحات کو حروفِ تہجی کی ترتیب میں پیش کیا گیا ہے۔ کوئی فرد محض انگریزی اصطلاح سے واقف ہو تو وہ کتاب کے آخری حصے میں اس کا اردو مترادف تلاش کر کے اس کی تشریح آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

یہ کتاب پاکستان میں 'نفسیات کا انسائیکلوپیڈیا' کے نام سے شائع ہوئی ہے جو وہاں کی جامعات کے طلبہ اور اساتذہ میں کافی مقبول ہے۔

اقبال امروہوی کے نو نفسیاتی مضامین کا پہلا مجموعہ 'جدید نفسیات' کے نام سے 2003 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے پہلے مضمون کا عنوان ہی 'جدید نفسیات' ہے۔ اس مضمون میں نفسیات کی تعریف، مفہوم، آغاز و ارتقا کی مختصر تاریخ، نفسیاتی مطالعے کے مختلف موضوعات، مطالعے کے مختلف طریقوں اور نفسیات کی مختلف شاخوں جیسے تعلیمی نفسیات، بچوں کی نفسیات، سماجی نفسیات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے مضمون میں ایک پیچیدہ موضوع 'شعور و لاشعور' سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں پہلے 'ذہن' کے معنی و مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ذہن ہی وہ بنیاد ہے جس کے تحت نفس، شعور، لاشعور وغیرہ موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں۔ یہ مضمون اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ نفسیات کی تقریباً ہر کتاب میں مذکورہ موضوعات سے بحث کی جاتی ہے۔ مصنف نے ان تصورات کی وضاحت کر کے انسانوں کے نفسیاتی مسائل کو سمجھنا سہل بنا دیا ہے۔ اگلے مضمون میں جدید نفسیات کے بانی سگمنڈ فرائڈ کی شخصیت اور نظریات کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ موجودہ دور میں 'ذہانت' پر بڑے زور شور سے بحث جاری ہے۔ اس موضوع پر کتاب میں ایک مضمون شامل ہے جس میں ذہانت کی مختلف تعریفوں کو بیان کرنے کے بعد اس کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا گیا:

''ایک ذہین آدمی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ صحیح فیصلے پر جلد پہنچ جاتا ہے جس کو مسائل حل کرنے کی قابلیت بھی کہا جاتا ہے۔'' (ص 59)

مضمون میں ذہانت کی آزمائش کے مختلف طریقوں اور انسانوں میں ذہانت کی کمی بیشی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یورپ کے کئی ماہرین نے جڑواں بچوں کا خصوصی مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ذہانت کا دار و مدار ماحول کے عناصر پر کم اور پیدائشی عوامل پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ایک موروثی خصوصیت ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ذہین شخص کی اولاد بھی ذہین ہی ہوگی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ معمولی ذہین افراد کی اولاد صرف ذہین ہی نہیں فطین بھی پیدا ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے ذہانت کے سلسلے میں

اقبال امروہوی نے اپنا ادبی سفر بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے سے شروع کیا۔ خوش قسمتی سے ان کی رہائش مکتبہ جامعہ کی دکان کے اوپر تھی۔ اس زمانے میں شاہد علی خاں مکتبہ کے انچارج تھے۔ ان کی وساطت سے اقبال امروہوی کی کہانیاں 'پیام تعلیم' میں چھپنے لگیں۔ غیر ملکی کہانیوں کے ترجمے پر مشتمل ان کی کتاب 'تین کوڑیاں' بھی مکتبہ جامعہ سے 1964 میں شائع ہوئی۔

بچوں پر جو تجربات کیے اس کے نتیجے میں طلبہ کی ذہانت کی جانچ کے لیے معیاری آزمائشیں تیار کی گئیں۔ ان آزمائشوں کی مدد سے بچوں کی ذہنی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ذہنی عمر کے تعین کے بعد ہی مقیاسِ ذہانت (قدرِ ذہانت) کا تصور سامنے آیا جسے انگریزی میں Intelligence Quotient کہتے ہیں۔ راقم کے خیال میں اردو میں .I.Q کے لیے مصنف کی تجویز کردہ اصطلاح 'قدرِ ذہانت' زیادہ موزوں ہے۔ یہ مضمون اساتذہ کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

کتاب کے دیگر مضامین کے عنوانات ہیں: شخصیت، خوابوں کی حقیقت، نفسیاتی الجھاؤ، نفسیاتی امراض، سائنس سے پرے۔ ان تمام عنوانات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سارے مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتے اور مواد کے لحاظ سے انتہائی کارآمد ہیں۔ یہ کتاب یقیناً ان لوگوں کے لیے انتہائی سودمند ہے جو نفسیات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

اقبال امروہوی کے 23 مضامین پر مشتمل دوسرا مجموعہ 'روزمرہ کی نفسیات' کے نام سے 2006 میں منظرِ عام پر آیا۔ کتاب کا انتساب 'ان بدنصیب لوگوں کے نام جو زندگی کو بوجھ سمجھ کر ڈھو رہے ہیں' واقعتاً کتاب میں شامل مضامین کے موضوعات کا اشاریہ ہے۔ کتاب کے پہلے مضمون 'روزمرہ کی نفسیات' میں مختلف مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے کہ علم نفسیات انسانی کردار کی سائنس ہے۔ روزمرہ زندگی میں ہم سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں انھیں جاننے کے لیے نفسیات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ نفسیات ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتی ہے جو اس کی افادیت کی دلیل ہے۔ اسی حقیقت کو مصنف نے اگلے تمام مضامین میں واضح کیا ہے۔ مثلاً مضمون 'ازدواجی زندگی' میں بتایا گیا ہے کہ شادی کا فیصلہ کرنے سے قبل لڑکے اور لڑکی کے لیے بعض عناصر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد مصنف نے کامیاب ازدواجی زندگی کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ موصوف کی رائے میں بہت کم لوگ مکمل کامیاب ازدواجی زندگی گزارتے ہیں۔ عموماً لوگ جو روایتی طرز کی ازدواجی زندگی جیتے ہیں، اسے ہی مصنف نے کامیاب ازدواجی زندگی قرار دیا ہے۔ مصنف نے کامیاب ازدواجی زندگی کی کئی شرطیں بیان کی ہیں، جیسے شوہر اور بیوی میں ہم خیالی ہو، نظریات میں ہم آہنگی ہو، مزاج میں یکسانیت ہو اور دونوں ہر حال میں ایک دوسرے کا سہارا بن کر جینے کے لیے تیار ہوں۔ مصنف نے ناکام ازدواجی زندگی کی وجوہات کا ذکر بھی کیا ہے، جیسے غیر موزوں جوڑے، ایک دوسرے کی مرضی

کے خلاف شادی، جذباتی ہم آہنگی کا فقدان، دونوں کی عمر، تعلیم یا معاشی حالات میں غیر معمولی تفاوت وغیرہ۔ مصنف نے میاں بیوی میں علیحدگی سے بچنے کا نسخہ بھی بتایا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں: ''اس کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں اپنا احتساب کریں اور سوچیں کہ جھگڑے کو کس طرح ٹالا جا سکتا ہے۔ اپنے اوپر پوری طرح ضبط اور برداشت کے رجحان کو حاوی کرلیں اور درگزر کرنے کی عادت ڈالیں۔ اگر ایک فریق خاموشی اختیار کرلے اور برداشت سے کام لے، بات کو درگزر کردے تو معاملہ بگڑنے سے بچ سکتا ہے۔ جو لوگ عام طور پر ٹوک جھونک کرتے رہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اس نسخے کو آزما کر دیکھیں اور بات کو رفع دفع کرنے کی عادت ڈالیں، کیونکہ دوسرا فریق کتنا بھی نادان ہو، وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' (ص 51)

مضمون کے آخر میں چند ایسی ہدایات تحریر کی گئی ہیں جو ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ غرضیکہ مصنف نے ازدواجی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ یہ مضمون نہ صرف ان نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ بن گیا جن کی شادی ہونے والی ہے بلکہ ان افراد کے لیے بھی سودمند ہے جو شادی شدہ ہیں اور ازدواجی زندگی کے مسائل سے دوچار ہیں۔

شادی کے بعد کا مرحلہ بچے کی پیدائش ہے۔ غالباً اسی بنا پر اگلا مضمون 'بچوں کی پرورش' سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں سب سے پہلے بچوں کی نشوونما کے مختلف مراحل کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ بچوں کی غذا، لباس اور جسمانی نشوونما کے بارے میں معلومات دینے کے بعد عہد طفلی میں بچوں کی نفسیاتی اور جذباتی نشوونما کے سلسلے میں چند اہم نکات کی وضاحت کی گئی ہے۔ والدین کو خاص طور پر ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

بچوں کی پرورش کے بعد مصنف نے 'عالمِ پیری' سے بحث کی ہے۔ ملک میں معمر افراد کے موجودہ مسائل کے ساتھ ساتھ ودھوا آشرموں میں بیواؤں کی دکھ بھری زندگی کو بیان کیا ہے۔ دو نسلوں کے درمیان ہونے والے تصادم پر غور و فکر کر کے مصنف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''عدم سازگاری ہی تمام مسائل کی جڑ ہے۔ معمر لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد ان کے نقشِ قدم پر چلے جبکہ اولاد چاہتی ہے کہ وہ اپنا راستہ خود بنائے اور اپنی عمر کے تقاضوں کے مطابق دنیا میں اپنی زندگی گزارے۔'' (ص 103) مصنف نے نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں بزرگوں کو چند بیش قیمت اور قابلِ عمل مشورے دیے ہیں۔

کتاب کے دیگر مضامین کا تعلق بھی انسانی زندگی کے مختلف مسائل اور مشاغل سے ہے۔ مثلاً مریضوں کی نفسیات، غصہ پر قابو رکھیے، ڈپریشن، اقدام خودکشی، کند ذہن بچوں کے مسائل وغیرہ۔ مصنف نے ان مضامین میں نہ صرف ان مسائل کو اجاگر کیا ہے بلکہ ان کے نفسیاتی حل بھی پیش کیے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ آگہی ہوتی ہے کہ نفسیات انسان کی پہلی سانس سے لے کر دمِ آخر تک ہر قدم پر اور ہر فعل میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

مذکورہ بالا کتاب کی اشاعت کے فوری بعد اقبال امروہوی نے اپنے مضامین کا تیسرا مجموعہ 'نفسیاتِ نمو' کے نام سے مرتب کر لیا تھا لیکن افسوس کہ دورانِ سفر وہ مسودہ کھو گیا۔ مسودے کی گمشدگی سے یقیناً مصنف کی محنت ضائع ہو گئی لیکن اس سے اردو دنیا کا بھی نقصان ہوا۔

اقبال امروہوی اس حادثے سے دلبرداشتہ نہیں ہوئے اور ایک نئی کتاب کی تیاری میں جٹ گئے۔ موصوف کی زندگی نفسیات کے مطالعے میں گزری تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ نفسیات کی خدمات انجام دینے والے محض چند دانشوروں کے تذکرے اردو میں پائے جاتے ہیں جبکہ اور بھی ایسی کئی شخصیات ہیں جنھوں نے نفسیات کو عروج پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے انھوں نے اردو داں طبقے کو ان دانشوروں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے روشناس کرانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ 2010 میں 'نفسیات کے معمار' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے موصوف نے انگریزی کتابوں اور انٹرنیٹ کی مدد لی اور صرف 25 ایسے دانشوروں کے تذکرے شامل کیے جن کے حالاتِ زندگی، شخصیت، نظریات اور کارناموں کے بارے میں بہتر مواد حاصل ہوا تھا۔ ان میں ارسطو، ڈیکارٹ، جان لاک، ولیم جیمس، فرائڈ، جان ڈیوی، ایڈلر، کانٹ جیسے مشہور و معروف فلسفی اور ماہرین نفسیات شامل ہیں۔

مذکورہ کتاب یقیناً اردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جو نفسیات کے ان طلبہ کے لیے انتہائی کارآمد ہے جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ یونیورسٹیوں میں نفسیات کے مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بقول شمیم حنفی، ''مجھے یقین ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرنے والے طلبہ کے ساتھ ساتھ اردو کے عام قاری بھی جو نفسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کتاب کے مطالعے سے فائدہ اٹھائیں گے اور علمی حلقوں میں سید اقبال امروہوی صاحب کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔'' (تعارف از

شمیم حنفی، نفسیات کے معمار، ص 18)۔ یہ کتاب بھی پاکستان میں 2018 میں شائع ہو چکی ہے۔

مذکورہ بالا چاروں کتابوں کے مشمولات کی روشنی میں بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو میں علم النفس کی ترویج و اشاعت میں سید اقبال امروہوی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان کتابوں کے اسلوب، زبان و بیان اور مواد سے نہ صرف طلبہ اور اساتذہ بلکہ عام قارئین بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان کتابوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ مصنف نے علمی مسائل کو بھی انتہائی سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ اصطلاحات کا استعمال کم سے کم کیا گیا ہے اور حسب موقع اصطلاحات کی تشریح بھی کر دی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی کتابیں نفسیات کے مفہوم، مبادیات اور اصولوں کو سمجھنے میں زبردست رہنمائی کرتی ہیں۔ افسوس، اقبال امروہوی کے اس قابلِ قدر کارنامے کی ویسی پذیرائی نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں۔ اردو کے بڑے ادیبوں کا بھی المیہ ہے۔

کتابیات

نفسیاتی تنقید: ڈاکٹر سلیم اختر
تین کوڑیاں: سید اقبال امروہوی
اصطلاحاتِ نفسیات: سید اقبال امروہوی
جدید نفسیات: سید اقبال امروہوی
روز مرہ کی نفسیات: سید اقبال امروہوی
نفسیات کے معمار: سید اقبال امروہوی

■

Momin Ghulam Nabi,
Room No. 2, Chaudhari Chawl
Chaudhari Mohalla,
Kalyan.421301
Dist. Thane (Maharashtra)
Mobile:09321259451

خصوصی گفتگو

زاہد مختار سے گفتگو

توصیف مجید

توصیف مجید: زاہد مختار صاحب اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں۔؟

زاھد مختار: زندگی اللہ نے بخشی۔ ہم اب تک بس اسے گزار رہے ہیں۔ کبھی بلندیاں سر کرنے کی سعی کی کبھی پستیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا اور ہم شکر ہر حال میں کر رہے ہیں کہ ہم ایک خالق کے تابع ہیں وہ جو اپنی قدرت و حکمت سے ہمارے لیے اچھا سمجھتا ہے وہی ہماری زندگی میں سامنے آتا ہے۔ ویسے بھی اگر غور کیا جائے تو میری زندگی کچھ الگ سی، ہٹ کر کسی مخصوص ڈگر پر نہیں چل رہی ہے۔ عام انسان ہوں۔ محبتوں کا امین بھی ہوں اور محبتوں کا طالب بھی۔

ت م: کیا آپ کا شجرہ نسب اردو کے کسی ادیب یا شاعر سے جا ملتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ادب سے اس قدر دلچسپی آپ کو ورثے سے ملی یا... محنت شاقہ کا نتیجہ۔؟

ز م: جو کچھ بھی ملا ہے اللہ کا کرم ہے والدین کی دعائیں ہیں۔ ظاہراً میں کسی شاعر یا مصنف کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا ہوں لیکن ڈی این اے کے مطابق کہیں عرب کے صحراؤں سے ہوتے ہوئے سیکڑوں سال پہلے ہمارے اجداد اس جنت نما وادی میں وارد ہوئے ہیں۔ کیسے، کب اور کن حالات میں کہنا مشکل ہے۔ ادب و علم سے رُجحان بچپن سے تھا۔ والد صاحب ایک عالمِ دین تھے گھر میں علمی کتابیں موجود تھیں شغف بڑھتا گیا اور اللہ نے اس راہ پہ ڈال دیا۔ ماں کی بے پناہ دعائیں ساتھ رہیں اور ہم چلتے رہے۔ منزل اللہ ہی کے ہاتھ۔

ت م: آپ کے باپ، دادا، پردادا کا کوئی خاص واقعہ نیک خیالی، انسان دوستی، تعلیم و تربیت کے حوالے سے بیان فرمائیں؟

ز م: دادا جان وغیرہ کو تو نہیں جانتا لیکن سنا ہے ہمارے دادا احمد جو بڑے ہی نازک مزاج اور شریف النفس آدمی تھے۔ پشمینہ کی تجارت کے حوالے سے پورے برصغیر ہند پاک میں گھوما کرتے تھے۔ والد صاحب عالم دین۔ والدہ صبر و محبت کی ایک پیکر تھی۔ ورثے میں یہی سب کچھ تو ملا ہے بس خود ہی خود تلاش کرنا ہنوز باقی ہے۔

ت م: والدین حضرات نے آپ کی پرورش و پرداخت کس انداز سے کی۔ اپنے والدین کے بارے میں ہمیں بتائیں۔؟ نوازش ہوگی۔

ز م: والد صاحب نے جہاں ہمیں ابتدائی آسائشوں اور بعد ازاں کچھ مدت کی تنگ دستی کے دوران تعلیم و تربیت دی ہے اُس میں ہماری والدہ کا بھی زبردست ہاتھ رہا ہے۔ والد صاحب میرے شغف کو دیکھ کر اکثر کہا کرتے تھے کہ جس دن پوری دنیا میں ایک بھی شخص میرے ادب سے محظوظ ہوگا یا مستفید ہوگا وہ میری کامیابی کا لمحہ گردانا جائے گا۔

ت م: زاہد مختار کو مختار خاص بنانے میں کس نے نمایاں رول ادا کیا؟ آپ کو ادب کا شوق کیسے ہوا۔؟

ز م: وہ لمحہ آج بھی نظروں کے سامنے محو رقصاں ہے۔ چھٹی جماعت جب ہمیں چھٹی کا دودھ بھی یاد نہیں رہا تھا ہم نے پہلی نظم لکھی۔ مختار احمد زاہد مختار بہت دیر بعد بنا لیکن مختار کے اندر کوئی الگ سا حساس شخص بچپن میں ہی سامنے آنے کے پر تولنے لگا تھا۔ بعد میں ثقافتی اداروں۔ کچھ نامور قلمکاروں اور نشریاتی اداروں نے اس شخص کو اور بھی سامنے آنے کی ترغیب دی اور یوں شوق دھیرے دھیرے جنون کی سرحدوں کو چھونے لگا۔ اب قلم کاغذ یا ماؤس اور کی بورڈ ہی ہمارا اثاثہ ہے، پیشہ ہے۔ شوق ہے، جنون ہے۔

ت م: بچپن میں مطالعے کے شوق سے متعلق کوئی دلچسپ سا واقعہ۔؟

ز م: بچپن حسین رہا ہے۔ خوبصورت رہا ہے۔ کبھی کبھی پینٹنگ کیا کرتے تھے اور اپنے اساتذہ اور دوستوں کے آڑھے ترچھے خاکے بنایا کرتے تھے۔ مطالعہ گھر میں موجود والد صاحب کی دینی کتب سے ہوا اور پھر اس میں ادبی رسائل اور تصانیف کا اضافہ ہوتا رہا۔ اپنے علاقے کی پبلک لائبریری سے ہم ڈھیر ساری ناولز اور کہانی کی کتابیں لا کر رات دیر گئے تک پڑھا کرتے تھے۔ آج بھی کچھ ناولوں کا عکس ذہن پہ منعکس ہے۔ جس میں گردش آفاق کی سات آٹھ جلدیں ابھی بھی زیر بصارت آتی ہیں۔

ت م: بچپن، لڑکپن میں اردو کے کسی مشہور و معروف ادیب و شاعر سے کسی تقریب میں ملنے کا مواقع فراہم ہوا کیا۔؟

ز م: بچپن میں ہم نے آل احمد سرور صاحب، پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کے علاوہ اپنے علاقے کے کئی معتبر ادبا کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کی۔ بعد میں زبیر رضوی، کمال احمد صدیقی، ناہیدہ تاج قریشی، مظہر امام جیسی شخصیات کے ساتھ ریڈیو اور ٹی وی میں کام کرنے کا موقع ملا۔

ت م: کس قسم کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔؟

ز م: دینی اور علمی جن میں خالص لیکن دلچسپ ادب بھی شامل ہے۔ دلچسپ ادب سے میری مراد ہے کہ زاویے نئے ہوں، دائرے نئے ہوں۔ مصنف نے اپنے آپ کو یا دوسرے قلمکاروں کو دُہرانے کی سعی نہ کی ہو۔

ت م: آپ کی پہلی تخلیق کب اور کون سے رسالے میں شائع ہوئی۔؟

زم: پہلی تخلیق آفتاب میں ایک افسانہ بے نام کے عنوان سے 1973 میں شائع ہوا ہے اور پہلا افسانہ تخلیق کے گھاؤ شیرازہ (کلچرل اکادمی) رسالہ میں 1976 میں شائع ہوا ہے۔

ت م: اردو میں آپ کی محبوب صنف سخن کون سی رہی ہے اور کیوں۔؟

ز م: دونوں، چاہے وہ شاعری ہو یا افسانہ... دراصل مجھے افسانوں کی ادا سے پیار ہے اور مجھے شاعری کی زُلفوں سے چھیڑ خوانی کرنے میں بھی ایک سرور ملتا ہے۔ میں ایک تصویر کی طرح ہر رنگ میں خود بھی رنگ جانا چاہتا ہوں اور مجھے ساز و سنگیت سے بھی دیوانگی کی حد تک اُنس ہے... لیکن... مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ افسانہ نگار ہوں، نہ ڈرامہ نویس، نہ شاعر ہوں اور نہ ساز اور آواز کی دنیا کا کوئی ستارہ... میں ایک مسافر ہوں۔ ایک ایسی شاہراہ کا جس میں مجھے افسانے، گیت، غزلیں، ڈرامے سر راہ مل جاتے ہیں سنگ میل کی طرح جو ہر گام پہ قدموں سے لپٹ جاتے ہیں اور ذہن و دل کو گزری مسافت اور آنے والی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں۔

میں اپنی ہی دُھن میں چلا جا رہا ہوں۔ میں ان راہوں پر اکیلا نہیں۔ بہت بھیڑ ہے ان راہوں پر، کچھ زادراہ لیے چل رہے ہیں اور کچھ اپنی خالی جیب میں بار بار اپنے ہاتھ ڈبو کر کسی 'گوہر' کی تلاش لاحاصل کر رہے ہیں۔ میں اللہ کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے اس راہ پر چلنے سے پہلے اپنے عالم و فاضل والد صاحب کی شفقت عطا کی۔ اُس کے بعد کئی بالواسطہ اور بلاواسطہ محترم رہبروں کی رہبری عطا فرمائی۔

اب یہ نقادوں کے ساتھ ساتھ قارئین کرام کی چشم بینا ہے کہ۔

نکتوں کو وہ عطا کریں خاکہ کوئی حسین

ت م: اس صنف کے علاوہ کسی اور اصناف ادب پر آپ نے طبع آزمائی کی ہوگی۔ وہ کون کون سی...؟

ز م: کبھی طنز و مزاح سے بھی قلم کا دل بہلاتا ہوں۔ تنقید میرا موضوع نہیں رہا ہے لیکن ایک رسالے کے مدیر ہونے کے ناطے کبھی کبھار بہت ساری موصول تصانیف میں کچھ چیدہ چیدہ کتابوں پر تبصرے بھی لکھتا ہوں جن میں کچھ تبصرے میری کتاب 'تحریریں' اور رسالہ 'لفظ لفظ' میں بھی شامل ہیں

ت م: زاہد مختار صاحب آپ نے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ آپ فکشن نگار کہلانا پسند کریں گے یا شاعر۔؟

ز م: خود کو ایک ادنیٰ شاعر کہلانا ہی پسند کرتا ہوں کیونکہ شعر کے دو مصرعے اب پلک جھپکتے ہی آناً فاناً الیکٹرانک دنیا میں سوشل نیٹ ورک کے ذریعے ساری دنیا میں اپنا خیال اور موضوع، پیغام اور احساس لے کر پہنچ جاتے ہیں جبکہ افسانوں، کہانیوں اور مضامین پڑھنے کے لیے ایک فرصت چاہیے جو آج کے دور میں شاید ہی کسی کے پاس ہو اُن محب ادب نوازوں کو چھوڑ کر جن سے اب بھی ادبی دنیا قائم ہے۔

ت م: شاعری میں آپ کس شاعر کو پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔؟

ز م: غالب، اقبال، اور کشمیری میں شیخ العالمؒ، لل دید، رسل میر، آزاد۔

ت م: فکشن میں آپ کو سب سے زیادہ متاثر کس تخلیق کار نے کیا ہے۔؟

ز م: سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی نے

ت م: 'سورج کا پہلا اندھیرا'، 'لمحے کا سفر' اور 'پل صراط' وغیرہ جیسے افسانوں میں کشمیر کا درد و غم، کشمیر کے حالات و واقعات کی سسکتی آہیں سنائی دیتی ہیں۔ کیا کشمیر کے افسانہ نگاروں کو اپنے افسانوں کا پلاٹ اپنے ہی قرب و جوار کے معاشرے سے لینا چاہیے۔ یا اپنے ہی خیالوں میں بسی دنیا کو آباد کرنا چاہیے۔؟

ز م: نہیں۔ خیالوں کی دنیا انسان کو غافل کر دیتی ہے۔ خواب دیکھنا اچھا ہے لیکن خوابوں میں رہنا اچھا نہیں۔ ادیب وہی جنوین ہے جو اپنے ماحول کا ترجمان ہو اپنے اردگرد ہو رہے حالات چاہے وہ منفی ہوں، ظلم و ستم سے بھرے ہوں یا دل آویز ہوں اُن کا ترجمان بنتا ہے۔ وہ قلمکار ہی کیا جسے اپنا ماحول جھنجھوڑ کے نہ رکھ دے وہ بھی کشمیر جیسا ماحول۔

ت م: فکشن سے متعلق آپ تنقید سے مطمئن ہیں۔؟

ز م: ایک انگریزی قلمکار کا یہ ماننا ہے کہ تنقید کو تخلیق سے کمتر مانتا ہے وہ اس بات کا قائل ہے کہ ''تنقیدی قوت، تخلیقی قوت کے مقابلے میں کم تر درجے کی چیز ہے اور وہ قوت جو دوسرے کے کاموں پر تنقید لکھنے میں صرف کی جائے اگر تخلیقی کاموں پر لگائی جائے تو زیادہ مفید ہے''

ہم اس بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں اور اختلاف بھی کیونکہ نشتر زنی سے ہی تو تخلیقی اجسام کی جراحی ممکن ہے جو ہر حال میں تخلیق اور تخلیق کار کے لیے سودمند

میں اپنی ہی دُھن میں چلا جا رہا ہوں۔ میں ان راہوں پر اکیلا نہیں۔ بہت بھیڑ ہے ان راہوں پر۔ کچھ زادراہ لیے چل رہے ہیں اور کچھ اپنی خالی جیب میں بار بار اپنے ہاتھ ڈبو کر کسی 'گوہر' کی تلاش لاحاصل کر رہے ہیں۔ میں اللہ کا شکر گذار ہوں کہ اُس نے مجھے اس راہ پر چلنے سے پہلے اپنے عالم وفاضل والد صاحب کی شفقت عطا کی۔ اُس کے بعد کئی بالواسطہ اور بلاواسطہ محترم رہبروں کی رہبری عطا فرمائی۔

ثابت ہوتی ہے۔ مجھے بہت سارے نقاد کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا ہے لیکن جتنا مشتے از خروارے سامنے آیا ہے اُن میں مجھے کبھی مرحوم آل احمد سرور کو پڑھنے کا بھی بہت پہلے موقع ملا۔ مجھے پروفیسر حامدی صاحب کی اکتشافی تنقید بھی کچھ الگ سی لگی۔ جس کے ساتھ اتفاق و اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہم آل احمد سرور کی ان باتوں کو بھی زیر نظر رکھیں تو بہت سارے نقادوں کی تحریروں کا جائزہ لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، تجزیہ ہے، تنقید قدریں متعین کرتی ہے۔ ادب اور زندگی کو ایک پیانہ عطا کرتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے، ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست اور بلند معیار قائم کرتی ہے، تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی بصیرت کی طرف اشارہ کرتی ہے، تنقید بُت شکنی بھی کرتی ہے اور بُت گری بھی، تنقید کے بغیر ادب میں موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں چلتا'

ت م: آپ کے خیال میں فکشن کی تنقید کس معیار کی ہونی چاہیے۔ کس طرح ایک فکشن نگار کو پرکھنا چاہیے۔؟

ز م: تنقید معیار کی بلندیاں چھو لے تو اثر رکھتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ نقاد تخلیقی پرتوں کو کھولنے کے بجائے ایک وعظ خوان بن کر اپنی ہی تحریر سے ہدایتی اصول وضع نہ کرے اور تنقید اس حد تک بھی گہرائیوں میں نہ ڈوب جائے کہ وہ تحقیق کے زمرے میں آجائے۔ تنقید کی وضع کردہ کسوٹی پہ جب ایک تخلیق کا جسم تشخیص کے لیے زیر جراحی لایا جاتا ہے تو نقاد جراح کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس تخلیق کی استعاراتی، تشبیہاتی اور علامتی پرتیں کھول کر ان میں کسی بھی خامی کو دور کرنے کی کوشش کرے نہ کہ پہلے سے ہی طے شدہ مدح سرائی یا تنقید برائے تنقید کر کے تخلیق کو مبالغہ آرائی کا شو پیس بنا دے یا اُسے سرے سے ہی خارج از ادب کر دے۔ مزید برآں یہ بھی اہم ہے کہ نقاد تخلیق کار اور قاری پر اپنی دھونس جمانے کے لیے ایسی زبان استعمال نہ کرے کہ تنقید کی پرتوں کو کھولنے کے لیے کسی ادبی کتاب سے کوئی کھل جا سم سم والا جملہ تلاش کرنا پڑے تب جا کے نقاد صاحب کے خزانے کا در کھلے۔

ت م: آپ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانے سے کیا۔ لیکن آج کل آپ مشاعروں سے زبردست دلچسپی دکھا رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔؟

ز م: وہ اس لیے کہ افسانوں کی محفلیں اب بہت کم سجتی ہیں۔ مشاعروں کی بہار ہے اور ہم ٹھہرے شاعری کی گلستان کے ایک پرستار۔ پہنچ جاتے ہیں کچھ بہاریں لوٹنے اگر باغباں بُلائے تو!

ت م: شاعری میں آپ کا پسندیدہ موضوع.. اور آپ کے نزدیک عشق کا تصور کیا ہے۔؟

ز م: میرے موضوعات ابتدا میں عشق و محبت ہی رہے ہیں لیکن 80 کے بعد میرا ذہن یکسر بدل کر عصری آگہی کی جانب مرکوز ہوا۔ بے بس قوم کو تڑپتے سسکتے دیکھ کر کہنا ہی پڑا۔

تر ہے دامن سحر خونی شفق کیسے کہوں
مل کے دنیا میں رہو مشکل حروف کشمیر

ت م: آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ اور پہلا شعری مجموعہ... آپ کی اب تک کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں۔؟

ز م: میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'جہلم کا تیسرا کنارہ' 2004 میں چھپ چکا ہے۔ 2008 میں دوسرا مجموعہ افسانہ 'تحریریں' جبکہ اس سال دوسرا مجموعہ افسانہ 'سورج کا پہلا اندھیرا' شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں میرے چار شعری مجموعے ابتدا (1984) سلگتے چنار (2009) اجنبی شہر کے اجنبی راستے (طویل نظم) 2011 تشنگی (2016) جبکہ کشمیری میں میرے دو مجموعے تین بر بلم (2014)، ضرب قلم (2013) شائع ہو چکے ہیں۔

> **تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، تجزیہ ہے، تنقید قدریں متعین کرتی ہے۔ ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ عطا کرتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے، ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست اور بلند معیار قائم کرتی ہے، تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی بصیرت کی طرف اشارہ کرتی ہے، تنقید بُت شکنی بھی کرتی ہے اور بُت گری بھی، تنقید کے بغیر ادب میں موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں چلتا۔**

ت م: آپ برسوں سے ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام Good Morning Show کے نام سے Host کر رہے ہیں، اس پروگرام میں وقتاً فوقتاً بہت سے ادیب و شاعر شامل ہوتے رہے اس لحاظ سے کشمیر کے پورے ادبی منظرنامے سے متعلق آپ یقیناً جانکاری رکھتے ہوں گے۔ کشمیر میں اردو زبان کی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔؟

ز م: اس پروگرام کے ذریعے مجھے آج تک سیکڑوں لوگوں سے ملنے اور اُن کے تجربات سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے حالانہ اسی پروگرام میں مجھے جہاں کئی اعلیٰ منصب داروں سے ملنے کا موقع ملا وہیں کئی مقتدر ادبا، شعرا اور محققین سے ملنے کا بھی موقع نصیب ہوا۔ جہاں تک اردو زبان کی موجودہ صورت حال کا تعلق ہے تو حالت کچھ ابتر نہیں ہے۔ سلوگن ازم ایک طرف لوگ بشمول ادبا و ادب نواز اس زبان سے بہت پیار کرتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے اسے تعصبی نشتروں سے بچایا جائے۔

ت م: آپ کو اب تک کتنے ایوارڈ مل چکے ہیں اور نہیں تو کیوں۔؟

ز م: ایوارڈ اللہ کے کرم سے بہت ملے ہیں۔ جن میں علی گڑھ کی ایک شاندار تقریب میں مجھے ادبی صحافت کے حوالے سے 'سفیر اردو 2010' سے بھی نوازا گیا۔ اس کے لیے اردو اکادمی کا عمر مجید یادگاری ایوارڈ۔ مہجور اونڈیشن اور ادبی سنگم کا شمس الرزاز ایوارڈ دیگر اسناد کے علاوہ میرے لیے باعث افتخار ہے۔

ت م: آپ کی ادارت میں ایک موقر ادبی رسالہ 'لفظ لفظ' نکلتا ہے۔ جو اردو کی ترویج و اشاعت میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ آپ کس قسم کے فن پارے کو شامل کر لیتے ہیں۔ اور کن قلم کاروں کی تخلیقات کو اپنے جریدے کی زینت بناتے ہیں۔؟

ز م: میں اس ماہنامہ ادبی سیریز کو اپنا جنون سمجھتا ہوں جس میں یقیناً اردو ادب کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ میں اس میں ہر دور کے ادب کی شمولیت کا خواہاں ہوں۔ میں اسے ماضی کے حسن سے، حال کی نزاکت اور مستقبل کی گلکاری سے سجانا چاہتا ہوں تبھی تو اس کے صفحہ اول پر یہ جملہ درج کیا ہے۔ 'کشمیر کی وادیوں کا حسین ادبی گلدستہ' اس ماہنامے میں برگزیدہ، کہنہ مشق اور نوجوان و نوآموز ادبا و شعرا کا استقبال ہے۔

ت م: آخر میں زاہد صاحب آپ سے ایک سوال یہ کہ آپ اردو کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے نام آپ کا کیا پیغام ہے۔؟

ز م: میں اردو سے پیار کرتا تھا، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا اور اس پیار میں مجھے حد سے گزر جانے کا جی کرتا ہے۔ اللہ توفیق دے تو۔

پیغام بس اتنا کہ جونیئر قلمکاروں کی قدر کریں، خود ساختہ متشاعروں اور فیس بکی ادیبوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں شاید تبھی ہم ادب کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں زیادہ حد آداب، تشکر...

■

Dr. Tawsef Ahmad Lone
C/L Lecturer Govt. Degree College
Bijbenara - 192125 (J&K)
Mob.: 7006402616

ذکریٰ خاتون

مئوناتھ بھنجن کا شعری منظرنامہ

مئوناتھ بھنجن مشرقی اتر پردیش کا ایک علمی، ادبی اور صنعتی شہر ہے۔ پارچہ بافی اس شہر کی اہم ترین صنعت ہے۔ یہ اعظم گڑھ کے پورب اور غازی پور کے اُتر میں تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ٹونس ندی کے کنارے واقع ہے۔ یہاں مدارس اور درس گاہوں کا جال بچھا ہوا ہے، اسی لیے اسے عالموں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا ڈاکٹر محمد مصطفیٰ مصری، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا سلطان احمد، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا عزیزالرحمٰن اعظمی اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی جیسی علمی شخصیات کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ ان میں سے اکثر نے علمِ حدیث پر ایسے محققانہ کارنامے انجام دیے ہیں کہ عالمِ اسلام ان کی علمی بصیرت اور دقیق نظری کا قائل ہوگیا ہے۔ ملک کی آزادی میں بھی شہر مئو ناتھ بھنجن کا حصہ رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جلسے جلوس، کانفرنسیں اور مشاعروں کا اہتمام بھی ہوتا رہا۔ سجاد ظہیر اور دیگر ادیبوں و شاعروں کی آمد نے اس شہر کی ادبی فضا کو رونق اور جلا بخشی ہے۔ اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے متعدد انجمنیں ('بزمِ ادب'، 'شانِ ادب' اور 'بزمِ تعمیر اردو') بھی قائم کی گئیں ان میں 'بزمِ ادب' کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ بزمی بنارسی، بشر شدر اعظمی، عبدالرشید انجم، فیض الحسن فیض، فضا ابن فیضی اور اثر انصاری وغیرہ کی کوششوں نے 'بزمِ ادب' کو مئو ناتھ بھنجن کی ایک فعال اور سرگرم انجمن بنادیا۔ اسی کے زیر اہتمام 'دانش کدہ اردو لائبریری' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ لائبریری نہ صرف تسکینِ ذوق اور مطالعۂ کتب و رسائل کا سبب بنی بلکہ ترقی کے اس قدر منازل طے کیے کہ بہت جلد ایک علمی، ادبی اور ثقافتی پروگراموں کا مرکز بھی بن گئی۔ اسے پروان چڑھانے والوں میں منور علی، مولوی عبدالباقی، ڈاکٹر انیس ادیب، مولوی عطاء الرحمٰن، کامریڈ امتیاز، ضیاء العبید، حاجی مختار علی، مشتاق احمد کار، عبدالحکیم گرہست، حاجی فخرالدین اور ماسٹر نثار احمد وغیرہ پیش پیش تھے۔

مئو ناتھ بھنجن کے شعری منظر نامے کو پیش کرنے کے لیے پہلے ان شعرا کو زیر بحث لایا جائے گا جو آزادی سے قبل کے ہیں اور بعد کا حصہ ان شعرا پر مشتمل ہوگا جن کی آمد آزادی کے بعد کی ہے۔ مئو ناتھ بھنجن کے ابتدائی دور کے شعرا میں محمد عبداللہ شائق (پیدائش 1892) فیض الحسن فیض (1896-1973)، صفا انصاری (1898-1975)، عبدالرحمٰن اچرم (1903-1963)، حبیب اللہ نیر اعظمی (پیدائش 1906) اور رام کمار سنگھ فہیم (پیدائش 1909) وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شعرا نے مئو ناتھ بھنجن میں ادبی و شعری فضا قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ محمد عبداللہ شائق مدرسہ دارالحدیث مئو کے بانی ہیں، درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ اردو فارسی اور عربی زبان و ادب پر اچھی دسترس تھی۔ طبیعت بڑی موزوں پائی تھی۔ شعر و سخن کا ذوق زمانۂ طالب علمی سے تھا، لہٰذا شاعری میں شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ فیض الحسن فیض کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم مئو سے ہوئی اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ اردو فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ شاعری میں وسیم خیر آبادی اور پھر نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ماہر عروض تھے اور اصغر گونڈوی سے عقیدت رکھتے تھے۔ نظم، غزل، رباعی، قصیدہ اور قطعہ میں طبع آزمائی کے باوجود کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوسکا۔ زبان و بیان میں شائستگی اور گداختگی ہے اور فکر و فن گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔

جلوۂ حسنِ رخِ یار ہے چلمن کے قریب
روشن اک آگ سی ہے وادیِ ایمن کے قریب
پھونک دے گی اسے خود آہِ جگر سوز مری
کوندتی پھرتی ہے کیوں برق نشیمن کے قریب

محمد مصطفیٰ صفا انصاری مولانا سلطان احمد (بانی مدرسہ دارالعلوم مئو) کے صاحبزادے تھے۔ شاعری کا ستھرا ذوق تھا۔ بچپن میں ہی اپنے چچا شیخ حسام الدین کے یہاں پونے (مہاراشٹر) چلے گئے اور وہیں پر تعلیم پائی۔ شاعری میں سلیم پونوی کے شاگرد تھے۔ پونے اور بمبئی میں شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع میسر آئے اور وہیں سے شعری موشگافیوں کی استعداد بہم پہنچائی۔ سیاست سے خاص لگاؤ تھا اسی لیے ان کے کلام میں سیاسی رنگ نمایاں ہے۔ عبدالرحمٰن اچرم کو محمد یوسف رسا اور محمد عبداللہ شائق سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ طنز و مزاح کے شاعر تھے لہٰذا ہزل گوئی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ بڑے ذہین اور شوخ طبیعت کے مالک تھے۔ محمد حبیب اللہ نیر اعظمی مولانا ضمیر قدوسی کے شاگرد تھے۔ شعری بزم 'شان ادب' کے صدر بھی رہے۔ بقول اثر انصاری: ''بھی شہزادۂ تجارت تھے، آج تاجدار غزل ہیں، بڑا نکھرا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ زبان میں پاکیزگی، بیان میں شوخی، فکر و فن میں پختگی ہے۔ جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی ہیں۔''[1]

رام کمار سنگھ فہیم بسمل الہ آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کے

والد شری مہیش نرائن اردو فارسی کے عالم تھے۔فہیم الہ آباد یونیوسٹی میں زیر تعلیم رہے، زمانۂ طالب علمی میں فراق گورکھپوری کی صحبتوں نے ان کی شعری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔غزل اور نظم میں عمدہ کلام کہتے ہیں۔ان کے کلام میں غالب کا عکس نمایاں ہے۔

لبوں سے آہ نکلے اشک آنکھوں سے رواں کیوں ہو
محبت ضبط کی خوگر ہے راز دل عیاں کیوں ہو
الگ ہے آسماں اس کا اندازِ ستم گاری
زمین کوئے قاتل ہم سوادِ آسماں کیوں ہو
فہیم خوش بیاں بھی شیفتہ ہے طرزِ غالب کا
جہانِ شعر میں غالب سا کوئی نکتہ داں کیوں ہو

آزادی اور تقسیم ہند کے دور میں مئو ناتھ بھنجن کے جن شعرا نے شہرت ومقبولیت حاصل کی، ان میں فضا ابن فیضی (1922-2008) اور اثر انصاری (1923-2007) خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے علاوہ ضیا انصاری، ظہیر الحق نشاط سیمابی،عبدالرشید انجم اور مشتاق احمد شوق وغیرہ کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔فضا ابن فیضی اردو شاعری کا ایک معروف اور معتبر نام ہے۔انھیں فیض الحسن فیض سے شرف تلمذ حاصل تھا۔غزل اور نظم کہنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے، رباعی گوئی میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ان کے کلام میں صوت ولفظ کے نازک رشتے گویا اس طرح مربوط ہیں کہ اردو شاعری کی کلاسیکی روایات، نئے شعری رجحانات اور نئے طرز احساسات کا پتہ دیتے ہیں۔لہٰذا ان کے کلام میں تہہ داری پیدا ہوگئی ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے متعدد شعری مجموعے 'سفینۂ زرگل' (1973)، 'شعلۂ نیم سوز' (1978)، 'دریچۂ سیم سمن' (1989)، 'سر شاخ طوبیٰ' (1990)، 'پس دیوار حرف' (1991)، 'سبزۂ معنی بیگانہ' (1994) وغیرہ شائع ہوکر ادبی حلقوں میں نہ صرف مقبول ہوئے ہیں بلکہ ان کے اعتراف ہنر کا سبب بھی بنے ہیں۔ان پر کئی تحقیقی کام بھی ہوئے ہیں۔ڈاکٹر شفیع احمد نے بنارس ہندو یونیورسٹی (یوپی) اور ڈاکٹر حدیث انصاری نے دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور (ایم پی) سے ان کی شاعری اور شخصیت پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔فضا ابن فیضی کی زبان دانی کے حوالے سے پروفیسر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

''انھیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے،اس کے تخلیقی استعمال کے فن سے وہ بہ خوبی واقف ہیں،اسی لیے روایت کا شکار نہیں ہوتے۔ دوسرے الفاظ میں وہ صوت اور لفظ کے نازک رشتوں کے محرم راز ہیں حرف ومعنی کے چھپے ہوئے روابط پر ان کی گہری نظر ہے اور ان کا ذہن 'کمپیوٹرائی' سرعت کے ساتھ مانوس کو نامانوس سے ہمدگر کردیتا ہے۔بعض اوقات اور بعض حضرات کو ممکن ہے، یہ روابط میکانیکی نظر آئیں لیکن تھوڑے سے غور وفکر کے بعد ان کی تہہ داری پر قاری چونک پڑتا ہے۔''[2]

ہر چند کہ فضا ابن فیضی کو زبان پر دسترس اور عبور حاصل ہے اوران کے یہاں نئی ترکیبیں، خوبصورت بندشیں اور دل آویز تشبیہیں ان کی شاعری کو اعتبار بخشتی ہیں لیکن فارسی اور عربی الفاظ وتراکیب کے مشکل اور بھرپور استعمال نے ان کے کلام کو عام قاری سے دور کردیا ہے۔ اثر انصاری مئو ناتھ بھنجن کے ایک اہم اور قابل ذکر شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے کلام میں شاعری کی قدیم فنی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید عصری تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔اگرچہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں تاہم انھوں نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور نثر میں بھی اپنے فن کے عمدہ جوہر پیش کیے ہیں۔ان کے شعری مجموعے 'کم وکیف' (1974ء)، 'افکار پریشاں' (1980)، 'زبان غزل' (1987)، 'آئینہ در آئینہ' (1990) 'پیراہن گل' (1996) اور 'نوائے سروش' (2001) وغیرہ ادبی حلقوں سے داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔اثر انصاری پر کئی تحقیقی کام بھی ہوئے ہیں۔ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے 'اثر انصاری حیات اور خدمات' پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کرکے ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسٹی جونپور (اتر پردیش) میں جمع کیا تھا جس پر یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی اور ڈاکٹر محمد زبیر نے ''اثر انصاری شخصیت اور شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی ممبئی سے ایم فل کی سند حاصل کی ہے۔علاوہ ازیں متعدد دانشوروں اور اہل قلم نے اثر انصاری پر اپنی تحریریں پیش کرکے ان کی شعری اور ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اپنے تجربات اور دیدہ وری سے نئے مسائل ومعاملات کو کلاسیکی رنگ وآہنگ کے ساتھ اس فن کاری سے پیش کرتے ہیں کہ کہیں بھی ہندوستانی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب مجروح نہیں ہوتی اور نہ ہی غزل کا بانکپن اپنی شعری روایتوں سے پامال ہوتا نظر آتا ہے۔

اب تو اپنے بھی نہیں پوچھتے اپنوں کا مزاج
آج کل شہر کا ماحول ہے یکسر بدلا
اپنی غزلوں کو نیا انداز دینے کے لیے
میں روایت کی حسیں قدریں مٹا سکتا نہیں

ضیاء الرحمٰن ضیا انصاری (وفات 1973) حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں تھے۔اردو فارسی کی تعلیم مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے حاصل کی تھی۔شاعری کا شوق عین جوانی میں پیدا ہوا۔زبان وبیان میں شائستگی اور سادگی ہے، طرزِ ادا میں جدت اور فکر وخیال میں شوخی ہے۔غربت اور تنگ دستی کا مارا یہ البیلا شاعر بہت جلد اس دار فانی سے کوچ کرگیا۔ظہیر الحق نشاط سیمابی (پیدائش 1911) سیماب اکبرآبادی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ بچپن میں ہی سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔بڑے نفاست پسند اور پرگو شاعر تھے۔غزل اور نظم ان کے پسندیدہ اصناف ہیں۔اردو فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ مظہر العلوم بنارس سے حاصل کی۔تعلیمی سلسلے کے بعد مئو ناتھ بھنجن کے متعدد اداروں، دارالعلوم، شاہی کٹرہ اور مسلم انٹر کالج میں بحیثیت استاد اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔عبدالرشید انجم (1969-1907) عبداللہ شائق کے شاگرد تھے،اردو فارسی اور عربی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔لکھنؤ تکمیل الطب کالج سے حکمت کی سند حاصل کی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حکمت وفلسفہ کے مضامین درآئے ہیں۔زبان وبیان کا اچھا درک رکھتے تھے۔زبان میں دل کشی اور فکر وفن میں بلند پروازی پائی جاتی ہے۔غزلوں کو ترنم سے پڑھنے کا نرالا اور انوکھا انداز رکھتے تھے۔محمد عبداللہ وہبی رحمانی (1990-1934) مولانا محمد شبلی شیدا خیرآبادی کے شاگرد تھے۔اردو فارسی کی تعلیم مدرسہ فیض عام مئو سے حاصل کی۔ بے تکلف اور پرگو ہونے کے باوجود خودداری اور خود اعتمادی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔آزادروی اور لذت کوشی نے سفرِ زندگی کو بے سمت اور بے سہارا کردیا۔ اس دورِ تغیر میں بھی ان کی زندگی میں کوئی بدلاو نہیں آیا۔

کسی کے قتل پہ کیوں لوگ دل گرفتہ ہیں
یہ روز روز کی باتیں ہیں واردات نہیں
نظامِ گردشِ دوراں بدل گیا لیکن
تیرے مزاج میں وہبی کوئی تغیرات نہیں

وہبی رحمانی کے شاگرد اظہر سلیم نے ان کے کلام کو مرتب کرکے 'جذب وجنوں' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔مشتاق احمد شوق (1923-2010) تلمیذ محمد عبداللہ شائق،مدرسہ فیض عام مئو کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ دارالحدیث میں فارسی کے استاد تھے۔شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی میں ہی پیدا ہوگیا تھا۔فارسی میں غزلیں،نظمیں اور قصائد کہتے تھے۔کلام میں صوفیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔انوار احمد محشر (پیدائش 1928) فضا ابن فیضی کے شاگرد تھے۔اردو فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد حافظ عبدالشکور سے حاصل کی تھی۔تعلیم کے بعد اردو

صحافت سے وابستہ ہوئے، آگے چل کر پرنٹنگ پریس بھی قائم کیا۔ مذہب اور سیاست ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ڈاکٹر انیس ادیب (1934-2014) مولانا قاری ریاست علی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ 'اردو کے مشاہیر شعرا کی فارسی شاعری' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر بنارس ہندو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔ درس وتدریس سے وابستہ رہے، بحیثیت ادیب اور خطیب طلبا اور خاص وعام میں بڑے مقبول ومعروف ہوئے۔یہ شاعر کم اور نثر نگار زیادہ تھے۔ڈاکٹر شکیل احمد اپنی کتاب 'سمٹتا سائبان' میں ڈاکٹر انیس ادیب کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''ادیب کے علاوہ ایک مصنف کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات اہم ہیں۔ تخلیقی ادب میں آپ کے افسانے، انشائیے اور اشعار شامل ہیں۔ایک انتخاب کی شکل میں اس کی اشاعت ''نقوشِ صدرنگ'' کے نام سے دوسال قبل ہوئی......اس کتاب کی علمی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔''[3]

بسمل انصاری (1939-2010) مئوناتھ بھنجن کے ان معدودے شعرامیں سے ہیں جنھوں نے مئو کے تانے بانے کی رنگ آمیزی کی مہارت کے ساتھ اردو شعر وغزل میں بھی اپنے فن کے عمدہ نمونے پیش کیے۔انھیں فضا ابن فیضی اور اثر انصاری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ 'روحِ ادب' اور 'بزمِ ادب' سے وابستہ رہے۔انھوں نے صنفِ غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔غزلوں کا مجموعہ ''تخیلاتِ بسمل'' کے نام سے 2018 میں شائع ہوا ہے۔ایم اے دل حسینی (1940-2010) اثر انصاری کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز تیرہ برس کی عمر سے ہوگیا تھا۔انھیں شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے خاندان کے افراد اکثر شاعر ہوئے ہیں، جن میں سلیم حسین اور مضطر حسینی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ 'ہم چشم' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ رسالہ اور 'بنکر ٹائمز' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی نکالا تھا۔مدرسہ بحرالعلوم مئو میں درس وتدریس سے وابستہ رہے پھر ایک شبینہ اسکول 'روحِ ادب' قائم کیا۔نظم، غزل اور نعت عمدہ کہتے تھے۔ان کے دو نعتیہ مجموعے 'نغمۂ دل' اور 'فردوسِ خیال' کے نام سے شائع ہوئے۔ غزلوں اور نظموں کے مجموعے 'افسونِ جرس'، 'کیف وجنوں'، 'حدیثِ دیگراں' اور 'خونِ تمنا' شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبول ہوئے ہیں۔دل حسینی نے اپنے کلام میں اپنے عہد کی بہترین تصویرکشی کی ہے۔آزاد ہندوستان کے دیگرگوں اور ابتر حالات کو اپنی نظم 'اب تو دیش آزاد ہے اپنا' میں بڑی کامیابی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

دیپ خوشی کے کیوں نہیں جلتے کیوں تاریکی چھائی ہے
جاگو جاگو ہند کے ویرو !نیند تمھیں کیوں آئی ہے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آج بھی بھائی بھائی ہے
اب تو دیش آزاد ہے اپنا، اب تو دیش آزاد ہے اپنا

ماہر عبدالحی (1947-2011) کا شمار فضا ابن فیضی کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے۔انھیں اپنے استاد سے گہرا لگاؤ تھا۔ اردو زبان و ادب کی متعدد اصناف میں اظہار خیال کے مالک ہیں لیکن انھوں نے اپنے استاد کی طرح غزل گوئی کو ہی اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔شعری مجموعہ 'ہری سنہری خاک' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر عبدالحی با اخلاق، خوش گو، خوش فکر اور خوش اسلوب شاعر تھے۔علاوہ ازیں ان کا مطالعہ وسیع ،فکر وخیال عمیق، جذبہ واحساس شدید اور تخیل میں بلند پروازی موجود ہے۔ان کی غزلوں میں جو تنوع ہوتا ہے اس میں حسب ضرورت کلاسیکیت اور روایت کی پاسداری کے ساتھ جدت و عصریت کا احترام واہتمام بھی ہے۔وہ کسی گروہ یا تحریک کے پاسدار نہیں بلکہ اپنے ذہن ودل کو کھلا رکھتے ہیں اور اپنے محسوسات وخیالات کو موزوں الفاظ کا جامہ پہنا کر غزل کا پیکر عطا کردیتے ہیں۔

ڈاکٹر منور انجم (پیدائش 8/اگست 1948) مئوناتھ بھنجن کے ایک معروف ادیب اور شاعر ہیں۔ان کی علم دوستی، ادبی ذوق وشوق اور ادارہ 'ڈی سی ایس کے پی جی کالج' کی لیکچرشپ نے بہت جلد باشندگان مئو میں انھیں مشہور ومعروف کردیا۔وہ اس کالج میں اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے ہوئے صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہوئے اور 2011 میں اپنے عہدے سے سبک دوش بھی ہوئے۔ڈاکٹر منور انجم صرف خوش گو اور خوش فکر شاعر ہی نہیں بلکہ بہترین نثر نگار بھی ہیں، انھیں نثر اور نظم ہر دو اصناف پر یکساں قدرت حاصل ہے۔نثر میں ان کی متعدد کتابیں 'اقبال سہیل حیات اور شاعری' (تحقیقی مقالہ) 'اردو ادب کے ماہ وانجم' اور 'اردو ادب کے مہ وکہکشاں' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، منظومات اور قطعات میں جذبات واحساسات کو پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ حمد اور نعت جیسی پاکیزہ اور مقدس صنفوں میں بھی اپنے خیالات کا اظہار انتہائی دلکش اور مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔غزل ان کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ان کے متعدد مجموعۂ کلام ('شمعِ آرزو'، 'شرحِ آرزو'، ''شہرِ آرزو' اور 'سحرِ آرزو') شائع ہوکر ادبی حلقوں میں شہرت ومقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ان کا ایک قطعہ پیش خدمت ہے۔

شمعِ الفت تیری محفل میں جلانے کے لیے
گیت لکھتا ہوں غمِ دل کو بھلانے کے لیے
جانتا ہوں ترا دامن میری قسمت میں نہیں
جانتا ہوں کہ مسرت ہے زمانے کے لیے

شفیق احمد قلمی نام سردار شفیق، مولانا عبداللہ شائق اور فضا ابن فیضی کے شاگرد تھے۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ابتدا میں نظم کی طرف مائل تھے لیکن آگے چل کر غزل کی جانب رجوع ہوئے۔ان کی غزل گوئی نصف صدی پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بہترین غزلیں لکھی ہیں اور اپنے استاد فضا ابن فیضی کی تقلید کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں غزل سے خصوصی لگاؤ ہے اور اس صنف میں نہ صرف طویل ریاضت کی بلکہ دل وجان سے صنفِ غزل کا حق بھی ادا کردیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سردار شفیق کی غزلوں پر مشتمل دو شعری مجموعے 'تازہ ہوا' اور 'غبار صدا' شائع ہوکر خاص وعام میں مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔تیسرا مجموعہ منظومات پر مشتمل ہے اور چوتھا غزلوں کا مجموعہ 'حنائے دست غزل' زیر ترتیب ہے۔سردار شفیق 'بزم تعمیر اردو' کے صدر رہے اور نئے شعرا کی رہنمائی اور تربیت میں بھی پیش پیش رہے۔غنی احمد غنی مولانا عبداللہ شائق کے صاحبزادے اور فضا ابن فیضی کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی کی تعلیم مدرسہ فیض عام مئو سے حاصل کی۔گھر کا ماحول علمی وادبی ہونے کے سبب شاعری وراثت میں پائی ہے۔خوبصورت اور عمدہ غزلیں کہتے ہیں لیکن بہت کم کہتے ہیں۔مشتاق احمد شبنم خلف حافظ فیض الرحمٰن اور تلمیذ فضا ابن فیضی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ تھے۔شاعری کا عمدہ ذوق تھا اور مطالعۂ کتب میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے، لہٰذا یہی مطالعے ان کی صلاحیتوں میں نکھار کا سبب بنے۔ غزلیں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ڈاکٹر وکیل اشہر تعلیم الدین انٹر کالج مئو سے بحیثیت فارسی استاد ریٹائر ہوچکے ہیں۔'پروفیسر نورالحسن انصاری حیات اور خدمات' کے موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ شائع ہوچکا ہے جس پر بنارس ہندو یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا اچھا درک رکھتے ہیں۔عمدہ شعر کہتے ہیں لیکن بہت کم گو ہیں۔

ڈاکٹر شمشاد احمد عنبر آفاقی (پیدائش یکم مارچ 1958) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ شاعری میں فضا ابن فیضی کے شاگرد ہیں۔ بچپن سے مطالعے کا ذوق وشوق جنون کی حد تک تھا، ان کا یہ ذوق علم

نگر نگر اردو

انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لے گیا۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر شہریار اور آل احمد سرور جیسے عظیم فن کاروں سے فیض یاب ہونے کے مواقع میسر آئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد علاج ومعالجے کے پیشے سے وابستہ ہوگئے اور مختلف جگہوں اور مقامات پر میڈیکل پریکٹس کرتے رہے، بعد میں ریاستی محکمۂ طب یونانی (اتر پردیش) میں ملازمت اختیار کی۔ مریضوں کی مسیحائی کرنے کے ساتھ ساتھ شعروسخن کی مشاغلی میں بھی لگے رہے۔ غازیپور کے دورانِ قیام بہت سے شعرا سے فیض یاب ہوئے۔ بعدازاں ان کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا۔ گھر کا ماحول بڑی حدتک شاعرانہ تھا۔ ان کے دو بھائی ریاض احمد اور ڈاکٹر اقبال زاہد شعرفہمی اور شعرخوانی میں اچھا ذوق رکھتے تھے۔ لہٰذا ڈاکٹر شمشاد عنبرآفاقی کی تعلیم وتربیت اور شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ان کے بھائیوں کی شفقت ومحبت اور سرپرستی نے کافی اہم رول ادا کیا۔ شاعری کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے ہی ہوگیا تھا۔ لیکن ان کی شعرگوئی کا باقاعدہ آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (AMU) سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عنبر آفاقی غزل اور نظم دونوں اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ غزلوں پر مشتمل دو مجموعے 'کفِ آب' (2015) اور 'رگِ تاک' (2017) اہلِ ادب سے دادوتحسین حاصل کرچکے ہیں اور نظموں کا مجموعہ 'دُرناب' (2019) منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر محمد زبیر نے اپنے مضمون 'ڈاکٹر عنبرآفاقی کی نظم نگاری' میں لکھا ہے:

''ڈاکٹر شمشاد عنبر آفاقی نے کوچۂ شاعری میں جب قدم رکھا تو صنفِ غزل کو اپنے لیے موزوں پایا۔ اسی لیے اس صنف میں انھوں نے شعروسخن کے خوب خوب گیسو سنوارے، اپنے ذہنی بہاو اور مخصوص لب ولہجے کے ساتھ اس میں نئے پیکروں اور لفظوں کو محلول کرکے اردو غزل کی لفظیات اور جمالیات میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔ لیکن جب نظم کی جانب مائل ہوئے تو اس میں انھوں نے نہ صرف اپنے فکروفن کے کمال دکھائے بلکہ زمین وزماں کے متعدد خوب صورت سمعی، بصری، لمسی اور حرکی پیکر بھی وجود میں آگئے۔ بایں سبب عنبر آفاقی کی غزلوں کی طرح نظموں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔''4

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی (12 جنوری 1958۔17/ اکتوبر 2019) مشرقی اترپردیش کے علمی وادبی شہر مئو ناتھ بھنجن کے وہ واحد چشم وچراغ ہیں جنھوں نے اپنی تحقیقی وتنقیدی اور صحافتی غیرجانب داری اور بے باکی سے اردو ادب کو اعتبار بخشا ہے۔ وہ ایک ماہرِ تعلیم ہونے کے ساتھ ایک بہترین غزل گو اور عہد ساز شاعر بھی ہیں۔ ان کا شمار ان باکمال شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے مئو کی ادبی اور شعری بزم کو اپنے فکروفن کے چراغ سے روشنی بخشی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام پر اثر انصاری سے اصلاح لی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'میزانِ آگہی' (2011) اور 'فیضانِ آگہی' (2016) ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکے ہیں۔ دیگر شعرا کی طرح ان کے یہاں محبوب کے حسن وجمال اور عشق ومحبت کی فراوانی نہیں بلکہ ان کا کلام تعلیم وتعلم اور غوروفکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایک حساس اور باشعور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں قوم وملت کے مسائل اور دیگر عوامل اس قدر بیان ہوئے ہیں کہ گویا ان کی شاعری قومی تنزلی اور ملی مسائل سے عبارت ہوگئی ہے۔ وہ اپنی شاعری کے وسیلے سے قوم کے نونہالوں کو اپنے اجداد کی ایجادات اور کارناموں کو یاد دلاکر یہ باور کرانا چاہتے کہ ہمارے اکابرین علم وہنر اور ایجادات میں نہ صرف یکتا تھے بلکہ انھوں نے ہی اپنے علم وفن اور فکروریاضت سے پورے عالم کو جہالت اور کارِ ذلت سے نجات بھی دلائی تھی۔ علاوہ ازیں جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دردمندانہ شاعری ہے جو ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ ان کی زبان آسان، اندازِ بیان سلیس اور عام فہم ہے۔ ان کی یہی شعری انفرادیت دیگر شعرا سے انھیں ممتاز کرتی ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار پیش ہیں۔

پڑھی ہیں اہلِ یورپ نے کتابیں میرے ابا کی
نہیں تو اس سے پہلے کتنے ظلمت ناک تھے بابا
ہماری دین ہے، وہ کیمیا ہو یا کہ زولوجی
ہمارے تجربے بھی کتنے حیرت ناک تھے بابا
خود کو ہر دم نئی اڑان میں رکھ
پاؤں ہرپل نئے جہان میں رکھ

محفوظ الرحمٰن عادل (پیدائش 11 فروری 1962) بھی مئو ناتھ بھنجن کے ایک بہترین شاعر ہیں۔ مدرسہ بحرالعلوم کھیری باغ مئو میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ شاعری کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے ہی ہوگیا تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کے منازل طے کرتا گیا۔ شاعری میں ماہر عبدالحی اور سردار شفیق کے شاگرد ہیں۔ سادہ مزاج، مخلص اور ملنسار انسان ہیں۔ وہ اپنی غزلوں کے ذریعے پوری نسلِ انسانی کو بھائی چارگی اور ہمدردی کا پیغام دیتے ہیں۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے 'جلتے بجھتے خواب' (2012)، 'روپ کی دھوپ' (2014) اور 'لفظوں کا تعاقب' (2016) شائع ہوکر اہلِ ادب میں مقبولیت حاصل کرچکے ہیں اور چوتھا مجموعہ 'زہے نصیب' زیرِترتیب ہے۔ علاوہ ازیں مئو ناتھ بھنجن میں ایسے بے شمار شعرا موجود ہیں جو اپنے فکروفن اور علم وہنر سے اردو شعروادب کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کررہے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر امتیاز ندیم، گمان انصاری، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن غاسق، عبدالسلام فانی، اظہر سلیم، رحمت اللہ اچانک، جاوید سامر، سعیداللہ سعد، ذکی محفوظ، منظورالحق ناظر، جمیل منظر عاشق اور ظہیر حسن ظہیر وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔

حواشی

1 تذکرہ سخنورانِ مئو، اثر انصاری، ص 32
2 مجموعۂ کلام سبزۂ معنیٔ بیگانہ، فضا ابن فیضی، ص 9
3 سنّاٹا سائبان، ڈاکٹر شکیل احمد، ص 48
4 شعری مجموعہ دُرناب، ڈاکٹر شمشاد عنبر آفاقی، ص 14

Zikra Khatoon
Research Scholar, Dept. of Urdu
University of Mumbai
Add. 403 Rimsha Tower
Shibli Nagar, Mumbra
Thane-400612 (Mumbai)

اردو میں خواتین کے اولین سفرنامے

عدیلہ جسیم

اردو ادب میں خواتین نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے نظم ونثر کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ سفرنامہ نثر کی ایک اہم وقت طلب صنف ہے۔ اسے لکھنے کے لیے سفر لازمی ہے۔ پہلے زمانے میں اولاً تو سفر اپنے آپ میں ایک مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے لوگوں کو کئی کئی دن تک سفر کرنا پڑتا تھا، سفر کی دیگر صعوبتیں برداشت کر کے لوگ اپنی منزل مقصود تک مشکل سے پہنچتے تھے۔ دوئم عورتوں کا سفر اور بھی مشکل اس لیے ہوا کرتا تھا کہ سفر کے معقول انتظامات نہیں ہوا کرتے تھے۔ خواتین کے لیے سفرنامہ لکھنا دوسری اصناف سے زیادہ وقت طلب رہا ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود اولین دور میں اردو میں خواتین کے سفرنامے کی مثال اکا دکا ہی سہی لیکن مل جاتی ہیں۔ جن خواتین نے اس وقت سفرنامے تحریر کیے ہیں یہ وہ خواتین تھیں جن کے اوپر بچوں کی پرورش و پرداخت کے ساتھ ساتھ اپنی ریاست کی ذمے داریاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان خواتین نے پردے کے اہتمام کے ساتھ دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا۔ یہ وہ دور تھا جب دور دراز کے ممالک کا سفر پانی کے جہاز سے کیا جاتا تھا۔

اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش نے 'عجائبات فرنگ' کے نام سے لکھا، اسے 'تاریخ یوسفی' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس سفرنامے کا سنہ تحریر 1847 ہے۔ تقریباً 61 سال بعد 1908 میں ایک خاتون نے اپنا پہلا سفرنامہ 'سیر یورپ' لکھا۔ یہ اعزاز نواب بیگم نازلی رفیعہ سلطان کو حاصل ہے۔ اس کے بعد کئی خواتین نے سفرنامے لکھے۔

اردو میں سفرنامہ لکھنے کی ابتدا دیر سے ہوئی۔ اس میں خواتین کی حصے داری مزید تاخیر سے ہوئی۔ خواتین کے سفرنامے مردوں کی بہ نسبت الگ نوعیت کے ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دونوں میں احساسات و جذبات کا فرق ہوتا ہے۔ وہ چونکہ زیادہ حساس ہوتی ہیں اس لیے سماج کے دکھ درد کی زیادہ گہرائی سے عکاسی کرتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک کم و بیش دو ہزار سفرنامے اردو میں لکھے جا چکے ہیں۔ جس میں خواتین کے مشکل سے 100 یا 125 ہی نظر آتے ہیں۔

طباعت کے اعتبار سے اردو خواتین میں پہلا سفرنامہ 'روضۃ الریاحین' سنہ 1903 میں بیگم سلطان جہاں نے لکھا۔ لیکن اس میں سفر کے حالات و واقعات بہت ہی مختصر ہیں جس کی وجہ سے اولیت کی بنا پر اردو میں خواتین کا پہلا سفرنامہ 'سیر یورپ' ہی ہے۔ خواتین کی ہمدرد اور تعلیم نسواں کی خیر خواہ نازلی رفیعہ سلطان نواب بیگم صاحبہ نے 'سیر یورپ' 1908 میں لکھا۔ کچھ اہم اسما اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کچھ یوں ہے۔

سلطان نازلی رفیعہ بیگم (سیر یورپ)

نازلی رفیعہ بیگم 19 فروری 1874 کو بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ کا نام امیر النسا تھا۔ ان کی والدہ ایک صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ امیر النسا بیگم کی تین بیٹیاں تھیں پہلی زہرا بیگم فیضی، دوسری نازلی رفیعہ بیگم اور تیسری عطیہ بیگم فیضی۔ نازلی رفیعہ بیگم غیر معمولی اور نہایت تعلیم یافتہ خاندان سے تھیں۔ ان کی شادی 1886 میں نواب جنجیرہ سر سیدی احمد خان سے ہوئی۔ نواب سر سیدی صاحب بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ شخص تھے۔ انھوں نے اپنی ریاست میں تعلیم کو عام کرنے کی بہت سی کوششیں کیں اور ڈھیر سارے منصوبے بنائے اور اس کو عملی شکل دیا۔ نازلی رفیعہ بیگم سے شادی کے بعد ان کوششوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ پر افسوس کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت دن تک خوش گوار نہ رہ سکی۔ اولاد نرینہ کے نہ ہونے کی وجہ سے نواب صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ اس کے کچھ دنوں بعد ان دونوں کا طلاق ہو گیا۔

سیر یورپ

سیر یورپ میں سلطان نازلی رفیعہ بیگم نے یورپ کے سفر کے حالات کو قلم بند کیا ہے۔ اس سفر کی شروعات 25 اپریل 1908 میں ہوئی۔ اس میں ان کے شریک حیات نواب سر سیدی خان بہادر، بہن عطیہ فیضی، بھائی علی اصغر بیگ فیضی، سید سعید صاحب اور ڈاکٹر ہاشمی شریک سفر تھے۔ یہ سفر تقریباً چھ ماہ کی طویل مدت پر مشتمل ہے اور سفر پانی کے جہاز کے ذریعے پورا کیا گیا تھا۔ اس سفرنامہ میں انھوں نے لندن، پیرس، جرمنی اور سوئزرلینڈ کے سفری حالات بیان کیے ہیں۔

یہ سفرنامہ خطوط کی شکل میں لکھا گیا ہے اور یہ خطوط انھوں نے یورپ سے اپنے عزیز و اقارب اور خصوصاً اپنی بہن زہرا فیضی کو لکھے تھے۔

"نسبتاً جب یورپ اور ایشیا کو دیکھتی ہوں تو آپ اپنی نظر میں تھوڑی تھوڑی ہو جاتی ہوں۔ افسوس ہے کہ ایشیا اب ویسی ہو گئی جیسے ہزار بارہ سو برس پہلے یورپ تھا۔"

(سیر یورپ۔ نازلی رفیعہ بیگم سلطان، یونین پریس، لاہور 1908، ص 3)

دوران سفر انھوں نے وہاں کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے کا غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ وہاں کی صنعتی ترقی اور تمدنی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی صورت حال سے ہندوستانی سماج کو بیدار کرنے کے لیے اپنے بہترین تجربات و مشاہدات کو تحریری شکل عطا کی۔

نواب بیگم سلطان جہاں (روضۃ الریاحین)

بیگم سلطان جہاں کی پیدائش 19 جولائی 1858 بھوپال میں ہوئی۔ ان کی وفات 12 مئی 1930 میں 71 سال کی عمر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام باقی محمد خان

بہادر اور والدہ کا نام سلطان شاہ جہاں بیگم تھا۔ نواب سلطان جہاں ریاست کی چوتھی اور آخری مسلم خاتون حکمران تھیں۔

سفرنامہ 'روضۃ الریاحین' ان کے سفرِ حج کے حالات ومشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ سفرنامہ ان کے جوش ایمانی اور ان کے شوق اور جذبے کا آئینہ دار ہے۔ یہ سفرنامہ اردو سفرنامے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا دوسرا نام 'کشورِ حجاز' ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم سفرنامہ ہے۔ جلد اول میں 146 اور جلد دوم میں 227 صفحات ہیں۔ جلد اول میں انھوں نے مقدس مقامات کی تاریخی وجغرافیائی معلومات پیش کی ہیں۔ یہ سفرنامہ تمام ارکانِ حج اور مقدس مقامات کی معلومات کا ذخیرہ نظر آتا ہے۔

وہ سفر سے ہونے والے فوائد کا بیان بھی کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ سفر میں سب سے اہم اور اعلیٰ سفرِ حج ہے۔ اس سفر کا آغاز 5 نومبر 1903 میں بھوپال سے ہوا تھا۔ سفر پر جانے سے پہلے انھوں نے اپنی ریاست کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے بڑے فرزند کو سونپی تھی۔ اس سفرنامے میں سفر کے انتظامات اور روانگی کے حالات موجود ہیں۔ انھوں نے اس سفر سے پہلے اپنی رعایا سے معافی بھی طلب کی ہے:

''ایسے سفر کو جاتی ہوں جو وسیلہ نجات ومغفرت ہے لیکن وہ منصف حقیقی حقوق العباد سے اسی وقت چشم پوشی فرماتا ہے جبکہ اس کے بندے اپنے حقوق معاف کر دیں۔ اسی لیے سب سے عموماً یہ استدعا ہے کی ہماری محنت وجانکاہی پر نظر کر کے جس کسی کی نسبت دانستہ ونادانستہ جو خطا ہم سے واقع ہوئی۔ اور سب بصدق دل وصفائی نیت دعا کریں کہ خدائے تعالیٰ اس سفر دور دراز بحر و بر کو بخیر و بخوبی انجام پر پہونچائے اور مع الخیر و عافیت ہم کو آپ تک پہنچائے۔''

(روضۃ الریاحین: سلطان جہاں بیگم، مطبع سلطانی، بھوپال، 1904، ص 88)

سفرنامہ میں سادہ وسلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ اپنی تاریخی وجغرافیائی معلومات کو تو انھوں نے بہت تفصیل سے پیش کیا لیکن اپنی زیارت کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ ریاست کے انتظام وانصرام سے متعلق زیادہ لکھا ہے۔ دشواریوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ پردے کی پابندیاں ان کے لیے ایک لازمی عمل تھا۔

بیگم شاہ بانو (سیاحت سلطانی)

شاہ بانو کا اصل نام میمونہ سلطان تھا۔ بیگم سلطان جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے حمید اللہ سے کم سنی میں ہی میمونہ سلطان کا عقد کر دیا تھا۔ سلطان جہاں بیگم چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف تھیں اس لیے ان کی رخصتی بالغ ہونے کے بعد ہوئی۔ شاہ بانو نام بھی انھیں کی طرف سے ملا۔ ان کی پرورش، تعلیم وتربیت سلطان جہاں بیگم کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ قرآن، حدیث، عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، خوش خطی اور اسلامی تاریخ غرض انھیں ہر طرح کے تعلیمی زیورات سے آراستہ کیا۔ ان کے سفرنامے کا نام 'سیاحت سلطانی' ہے۔ یہ سفرنامہ یورپ کے سفر کا ہے۔ یہ ایک مختصر سفرنامہ ہے جو تقریباً 146 صفحات پر مشتمل ہے۔ شاہ بانو نے یہ سفر بیگم سلطان جہاں کے ساتھ کیا۔ اس سفر کا مقصد ان کے عزیز کی بیماری کا علاج تھا۔ چونکہ شاہ بانو کے سفر کا زیادہ حصہ تیمار داری میں گزرا۔ اس لیے انھیں زیادہ کچھ دیکھنے کا وقت نہ مل سکا۔

اردو میں سفرنامہ لکھنے کی ابتدا دیر سے ہوئی۔ اس میں خواتین کی حصے داری مزید تاخیر سے ہوئی۔ خواتین کے سفرنامے مردوں کی بہ نسبت الگ نوعیت کے ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دونوں میں احساسات و جذبات کا فرق ہوتا ہے۔

اس سفرنامے کو شاہ بانو نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ بھوپال سے بمبئی تک کا سفر بذریعہ ٹرین طے کیا گیا۔ پہلے حصے میں سفر کی وجہ، سفر کی تیاری، وداعی جلسے، روانگی، بھوپال سے بمبئی تک کے حالات، جہاز کی حالت، ایک بچے کی موت، عدن میں داخلہ، بحر الاحمر کا موسم، مارسیز، فرانس اس کی کیت اور آبادی، پیرس میں داخلہ، پیرس کے مقامات، لندن کی روانگی، ریڈہل کا قیام، بکنگھم پیلس میں کوئین الیکزنڈر اور لارڈ لیڈی منڈ کی ملاقات، جشن، تعلیم گاہوں کا معائنہ، تحائف شاہی، اخبارات کی حالت وغیرہ جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

حصہ دوم میں لندن سے روانگی اور جنیوا وغیرہ کا قیام، ترکی اور استنبول میں داخلہ اور سلطان سے ملاقات، مساجد ترکی، عورتیں، مدارس، زیارت گاہ، تبرکات، مسلمانوں کی حالت، قسطنطنیہ سے روانگی، بوڈاپیسٹ، وینس، فلارنس، پورٹ سعید قاہرہ سے روانگی اور سخت طوفان کے حالات اور آخر میں بمبئی سے بھوپال کے حالات سفر کا بیان ہے۔

یہ سفرنامہ روزنامچے کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ اس کو ترتیب دینے اور اس کے لکھنے کی ترغیب دونوں کی وجہ شاہ بانو اپنی خوش دامن بیگم سلطان جہاں کو دیتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''جن چیزوں کو حضور ممدوحہ نے ملاحظہ کیا جہاں جہاں تشریف لے گئیں۔ جو نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں ان سب کے متعلق کامل یادداشتیں لکھوا دیں اور ان یادداشتوں کو لکھواتے ہوئے ہر ایک بات میرے ذہن نشین بھی کر دی۔''

(سیاحت سلطانی: شاہ بانو، مفید عام پریس، آگرہ، 1911، ص 6)

اس سفرنامے میں انھوں نے چین، یورپ اور اسلامی ریاستوں کی بھی سیر کی۔ وہاں کی مسجدیں، آثار قدیمہ اور مزارات وغیرہ کی بھی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اس سفر کا ایک مقصد وہاں کے ترقی یافتہ مدارس کے نظام کا جائزہ بھی لینا تھا۔ تاکہ اس طرح کا تعلیمی نظام ہندوستان میں بھی قائم کیا جا سکے۔ اخبارات ورسائل کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔

امت الغنی نور النسا (سفرنامہ حجاز مصر وشام)

امت الغنی نور النساء اردو کے معروف مصنف ومحقق مولوی نصیر الدین ہاشمی کی بہن تھیں۔ امت الغنی نور النساء نے یہ سفر نومبر 1909 کو کیا تھا۔ اس سفر کی روداد کو ان کے بیٹے شرف الدین محمد عبد القادر نے 1935 میں حیدرآباد کے ایک رسالے 'مشیرِ نسواں' میں شائع کروایا تھا۔ بعد میں 1996 میں سفرنامہ 'سفرنامہ حجاز مصر وشام' کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ 76 صفحات پر مشتمل ہے۔

اس سفرنامے کو روزنامچے کی شکل میں قلم بند کیا گیا ہے۔ تمام مقدس مقامات کے تاثرات اس میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ بحری سفر عدن، ایران، جدہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، رابغ، حیفہ، دمشق، بیروت، فلسطین، یروشلم، بیت القدس، بیت الحلم، یافہ، رملہ اور قاہرہ وغیرہ پر محیط ہے۔ سفر بمبئی کی بندرگاہ سے شروع ہوا تھا۔ اس سفر میں ان کے شوہر اور بچے بھی شریک تھے۔

اس سفرنامے کو پڑھ کر ان کی اسلامی تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق علم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضورؐ کے معجزات کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ان مقدس مقامات کی بھی نشاندہی کرتی ہیں جو مناسک حج میں آتے ہیں۔ حج وزیارت کے ساتھ انھوں نے جو دوسرے اسلامی ممالک کا سفر کیا اس کے مناظر کو بھی دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوران سفر ملنے والی مسجدوں، عمارتوں، بازاروں اور ہوٹلوں کا بھی ذکر کرتی ہیں۔

بیگم سربلند جنگ بہادر (دنیا عورت کی نظر میں)

یہ سفرنامہ بیگم نواب سربلند جنگ بہادر نے لکھا۔ ان کا نام اختر حمید تھا شادی کے بعد اپنا نام بیگم سربلند جنگ بہادر لکھتی تھیں۔ لیکن اس سفرنامے کو خود وہ مرتب شدہ لکھتی ہیں۔ اسے کئی برسوں کے بعد اپنی ڈائری سے مرتب کر کتابی شکل دی۔ اپنے بچوں کے اصرار کی وجہ

سے انھوں نے اس سفرنامے کو 'دنیا عورت کی نظر میں مشرق ومغرب کا سفرنامہ' کے نام سے شائع کیا۔ یہ سفرنامہ انھوں نے اپنی عہد جوانی میں لکھا تھا۔ اس وقت ان کے شریک حیات نواب سر بلند جنگ بہادر ان کے ہم سفر تھے۔ اس کتاب کے مرتب کرنے کے وقت وہ اس دارفانی سے رخصت ہو چکے تھے۔

بیگم سربلند جنگ نے مشرق ومغرب کے کئی ممالک کا سفر کیا۔ جس میں عرب (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ)، مصر، شام، عراق، اٹلی، فرانس، انگلستان اور دنیا کے کئی ممالک کے حالات پیش کیے ہیں۔ یہ سفرنامہ خواجہ بک ڈپو برقی پریس جامع مسجد دہلی سے شائع ہوا جو 189 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حج بیت اللہ کے مبارک سفر کا ذکر ہے۔ اپنے احساسات، جذبات، تجربات ومشاہدات کو وہ اپنی ڈائری میں درج کرتی جاتی تھیں۔

بیگم سید ہمایوں مرزا (صغرا بیگم حیا)

صغرا بیگم حیا 1884 میں پیدا ہوئیں اور 1958 میں انتقال ہوا۔ وہ صفدر علی مرزا اور مریم بیگم کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی اپنے والدین سے سیکھی۔ تعلیم نسواں کی طرف توجہ دی۔ شادی کے بعد بہت سے اسفار کیے اور سفرنامے کے طور پر اردو دنیا کو بیش قیمتی تحفہ عطا کیا۔ وہ ایک ماہنامہ رسالہ 'النساء' حیدرآباد کی مدیر بھی تھیں۔ اس رسالے میں وہ خواتین کے لیے ادبی اور اخلاقی مضامین شامل کرتی تھیں۔ انھیں سیاحت کا شوق تھا اور تعلیم سے دلچسپی بھی۔ اس امتزاجی خوبیوں نے ان سے متعدد سفرنامے تحریر کروائے۔

سفرنامہ عراق (1915)، سفرنامہ یورپ (1925)

سفرنامہ' عراق: یہ سفرنامہ 1915 میں مطبع نظام دکن سے شائع ہوا۔ سفر عراق انھوں نے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ کیا۔ سفرنامہ روزنامچے کی شکل میں تحریر کیا گیا ہے۔ وہ بمبئی، کراچی سے ہوتے ہوئے بصرہ بغداد، کاظمین، سامرہ، کربلا معلی، نجف اشرف کی زیارت گاہوں پر حاضری ہوئیں۔

اس سفرنامہ کے دیباچے میں صغرا بیگم حیا نے اپنے خاندان کے احوال درج کیے ہیں۔ انھوں نے تاریخی واقعات ومقامات کی معلومات کی فراہمی کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کے جذبات کو شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وہ ملک کے لوگوں کو خصوصاً عورتوں کو دوسرے ممالک کے رہن سہن، رسم ورواج، معاشی حالات، طرز تعمیر، تہذیب وتمدن کے احوال سے تفصیل سے آگاہ کراتی ہیں۔

سفرنامہ' یورپ: یہ سفر 29 مارچ 1924 کو شروع ہوا۔ اس سفرنامہ میں مارسلز، پیرس، لندن، ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی سے ہوتے ہوئے 31 ستمبر 1924 تک کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سفرنامہ عظیم اسٹیم پریس چارمنار حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے یہ رسالہ 'تہذیب نسواں' میں قسطوار شائع ہوتا رہا۔ اس سفر کا مقصد ان کے شوہر کا علاج تھا جو دل کے مریض تھے۔

وہ نہ صرف ہندوستان کی ترقی کی خواہاں نظر آتی ہیں بلکہ وہ یہ چاہتی ہیں کہ اب صورت حال بدلنی چاہیے۔ انھوں نے یورپ کے لوگوں کی زندگی کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس سفرنامے کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''صغرا بیگم کا سفرنامہ یورپ جو انتہائی باریک بینی کے ساتھ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا موازنہ کرتے ہوئے خالصتاً نسوانی اپروچ کا حامل ہے۔''

(اردو سفرنامے کی تاریخ: مرزا حامد بیگ، اورینٹ پبلشرز، لاہور، 2014، ص 82)

عطیہ بیگم فیضی (زمانۂ تحصیل)

1906 میں عطیہ بیگم فیضی رحیمن کو انگریزی حکومت نے وظیفے پر برطانیہ ٹیچرز ٹریننگ کے لیے بھیجا۔ یہ کورس دو سال کا تھا مگر طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے انھیں ایک سال ایک ماہ میں ہندوستان واپس آنا پڑا۔ عطیہ بیگم فیضی نے اپنے لندن کے سفر اور وہاں کے واقعات کو ڈائری کی شکل میں محفوظ کر لیا تھا۔ ان کے خاندان کا اپنا ایک رسالہ 'کتاب الاخبار' تھا جس میں خاندان کے افراد کے مضامین اور واقعات کو تاریخ وار شائع کر دیا جاتا تھا۔

وہ اپنی ڈائری میں لکھے گئے روزنامچے کو مکتوب کی شکل میں اپنی بہن زہرا بیگم کو بھیج دیتی تھیں جو یہاں 'تہذیب نسواں' میں شائع ہو جاتا تھا۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں 'زمانۂ تحصیل' کے نام سے طبع ہوا تھا۔ اپنے وطن سے سات سمندر پار تعلیم حاصل کرنے گئیں اور اپنے سفر کے روز اول سے آخری دن تک کی اپنی تمام سرگرمیوں سے اپنے ملک کے لوگوں کو اور خصوصی طور پر یہاں کی خواتین کو آگاہ رکھا۔ 'زمانۂ تحصیل' ان کی اردو میں واحد تصنیف ہے اور دیگر ساری کتابیں انگریزی میں ہیں۔

اس سفر میں ان کے ساتھ ان کے بھائی ازہر فیضی اور بھتیجا طیب علی اکبر بھی تھے۔ ویسے مسز سروجنی نائیڈو بھی پرواز کے دوران ان کی ہم سفر تھیں۔ وہ اپنے سفر کے تعلق سے تمام تفصیلات اپنے خطوط میں لکھ کر بھیجتی تھیں۔

مصنفہ نے اپنے سفرنامہ کو اپنی نانی بیگم شجاع الدین طیب علی کے نام انتہائی عزت واحترام کے ساتھ انتساب کیا ہے۔ یہ سفرنامہ 121 صفحات پر مشتمل ہے۔

اپنی تربیتی تعلیم کے سلسلے میں وہ اپنی تمام سرگرمیوں کا ذکر کرتی ہیں اور کالج کے اساتذہ کے وقت کی پابندیوں کے اہتمام پر رشک کرتی ہیں۔ دس بجنے میں دس منٹ پر حاضر ہونا رہتا تھا۔ وقت پر لوگ حاضر ہو جاتے اور ٹھیک دس بجے استانیاں اپنے کلاس روم میں آ جاتی ہیں اور اپنا اپنا سبجیکٹ پڑھا اور سکھا کر چلی جاتی ہیں۔ لندن کی ترقی انھیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ یہ توقع کرتی ہیں کہ اس طرح کا تعلیمی اور ترقیاتی نظام ہندوستان میں بھی قائم ہونا چاہیے۔ وہاں کی لائبریری کا رکھ رکھاؤ، فرنیچر کی سجاوٹ، طلبہ کی خاموشی اور اسکول کا انتظام سب کچھ انھیں اپنی طرف لبھاتا ہے۔

عطیہ فیضی نے انگلینڈ میں دیکھی ہوئی معمولی سی معمولی بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے تاکہ اپنی ہم وطن بہنوں کی ترقی اور تعلیم کی طرف ذہن مائل ہو سکے۔ وہ وہاں کی سماجی زندگی سے بھی متعارف کرواتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ وہاں کے لوگوں کی زندگی کتنی خوش گوار ہوتی ہے، مکان آرام دہ ہوتے ہیں لوگ صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ انور سدید ان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عطیہ بیگم فیضی رحیمن کا یہ سفرنامہ لندن کی زندگی کو اونچے طبقے کی تہذیبی آنکھ سے دیکھتا ہے اور قاری کو مرعوب کرنے والی تصویریں دکھا دیتا ہے۔''

(اردو ادب میں سفرنامہ: انور سدید، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، 2012، ص 201)

بیگم انعام حبیب اللہ (تاثرات سفر یورپ)

ان کا نام بیگم انعام فاطمہ تھا شادی کے بعد بیگم انعام حبیب اللہ ہو گئیں۔ ان کے سفر کا آغاز لکھنؤ سے 12 مارچ 1924 کو ہوا۔ مصنفہ نے مسلم خواتین کی بیداری اور ان کی تعلیم کے لیے اپنی تمام تر کوششیں کیں جس کا نتیجہ تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج لکھنؤ کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے حقوق نسواں کی وکالت کی اور آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ خواتین کی فلاح اور بہبود کے لیے انھوں نے بہت سارے تعمیری کام کیے۔

اس سفر کا مقصد اپنے بچوں سے ملنا تھا جو لندن میں زیر تعلیم تھے۔ بیگم حبیب اپنے سفرنامے میں جذبات نگاری سے کام لیتے ہوئے دوران سفر جہاز پر ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعات کا ذکر تفصیل سے درج کرتی ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کے شوہر تھے اور ایک بیٹی بھی تھی جس کی طبیعت علیل تھی۔

اس سفرنامے کو وہ اس خیال سے لکھتی ہیں کہ اسے

پڑھ کر لوگ یورپ کی ترقی کو سمجھ پائیں اور اسے پانے کی خواہش اپنے دل میں بھی پالیں اور یہ بھی کہتی ہیں کہ وہاں جا کر دیکھیں اور سیکھیں دنیا کس قدر آگے بڑھ چکی ہے۔

محمودہ عثمان حیدر (مشاہدات بلاد اسلامیہ)

محمودہ عثمان حیدر قصبہ نہوڑ، ضلع بجنور 1908 میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام حکیم سید غلام حیدر تھا اور سجاد حیدر یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر سے ان کی شادی ہوئی۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ان مقدس مقامات کی زیارت کی اور سفرنامہ 'مشاہدات بلاد اسلامیہ' لکھا۔

یہ سفرنامہ 1932 میں آف سیٹ پریس، کراچی سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ مقدس مقامات کی زیارت گاہوں کی سیر پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس سفرنامے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سفر سے متعلق احوال بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مقامات زیارت اور اللہ کے ولیوں اور اس کے برگزیدہ بندوں کے مختصر حالات زندگی کا بیان ہے۔ یہ سفر انھوں نے اپنے شوہر سید عثمان حیدر کے ہمراہ 1929 سے 1933 تک تقریباً 4 سال کی طویل مدت میں مکمل کیا۔ جس میں انھوں نے مشرق وسطی کے مختلف ملکوں اور وہاں کی اہم زیارت گاہوں میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ جن ممالک کا سفر کیا ان میں ایران، عراق، ترکی، شام اور بیروت ہیں اور ان ممالک کے جن شہروں میں گئیں وہ دمشق، حلب، کربلا، نجف، کوفہ، موصل، حیفہ، اور بیت المقدس ہیں۔

اس سفرنامے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ مشاہدات بلاد اسلامیہ کو پڑھنے کے بعد اپنی محرومی پر افسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے دوران سفر میں لاعلمی کے وجہ سے اہم مقامات کے پاس سے گزرا اور وہاں حاضری نہ دے سکا۔ اب آرزو ہے کہ اس کا ایک نسخہ لے کر دوبارہ ارض اسلام کی سیاحت پر جاؤں اور اس کی زیر رہنمائی سب مقامات پر حاضری دوں۔

(مشمولہ محمودہ عثمان، مشاہدات، شبلی نعمانی، معارف، ص 7)

اس سفرنامے کی زبان عام فہم ہے۔ زیارت مقامات مقدسہ، وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، رسم و رواج، تہذیب و ثقافت اور تاریخی مقامات اور اس کے ساتھ ساتھ بزرگان دین اور ان کی قربانیوں کا ذکر اور ان کی کرامات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مساجد اور درگاہوں کی تفصیل بھی درج ہے۔ اس سفرنامے میں حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور دیگر بزرگان دین کی حکایات و پند و نصاح اور حالات و شخصیت کا بیان ہے۔

نشاط النساء بیگم حسرت موہانی (سفرنامہ عراق)

بیگم نشاط النساء اتر پردیش اناؤ میں 1885 کو پیدا ہوئیں۔ وہ ایک ایسی خاتون ہیں جنھوں نے آزادی کی جد و جہد میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اپنے شوہر حسرت موہانی کے جیل جانے کے بعد ان کے جوہر ابھر کر سامنے آئے اور انھوں نے ایک عظیم خاتون ہونے کا بھرپور ثبوت دیا اور مخالف حالات سے کبھی ہار نہیں مانی۔ ان کی ضمانت کے لیے مستقل جد و جہد اور کوششیں کرتی رہیں۔ چونکہ وہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور خاتون تھیں۔ انھوں نے جنگ آزادی کی کئی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان میں انقلابی تقاریر بھی کیں۔ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ بیگم حسرت موہانی ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور ہمیشہ اس کی پابند رہیں۔ انھوں نے دنیا کو پردے کے اندر سے ہی دیکھا اور سمجھا تھا۔

انھوں نے حجاز و عراق کا سفر کیا اور یہ ان کا آخری سفر تھا۔ یہ سفر خشکی کے راستے سے طے ہوا۔ اس سفر کے حالات و واقعات سے وہ اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو خطوط کے ذریعے باخبر کرتی رہیں۔ ان کے خطوط کو مولانا نے مرتب کر کے اردوئے معلی میں ایک تعارفی اور وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ آخری حصہ مکمل نہ ہو سکا تھا۔ یہ سفرنامہ محض چھ خطوط پر مبنی ایک مختصر سفرنامہ ہے۔

یہ ایک بے حد مختصر سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے عراق کی سیاسی، سماجی، اخلاقی، جغرافیائی، تاریخی، معاشی و اقتصادی زندگی کے ہر گوشے پر اپنی نظر رکھی ہے۔ اپنے سفر کے متعلق تمام چھوٹے بڑے واقعات کے تاثرات اس سفرنامے میں انھوں نے شامل کر لیے ہیں۔ وہ اپنے سفر سے متعلق سفر حجاز کے ساتھ عراق کے سفر کو بھی خاصی اہمیت دیتی ہیں۔

اس سفرنامے میں اپنے اور حسرت موہانی جو تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے کے بارے میں گفتگو کی ہے، رہن سہن، کھان پان اور اپنی خانگی زندگی کے ایسے گوشے کو بھی پیش کیا ہے جن کا ذکر یہاں نہ ہوتا تو یہ کسی کے علم میں آتا بھی نہیں۔ حسرت موہانی کی صحبت نے ان کی ادبی حس کو بڑھایا اور تب ان کا رجحان اردو کی جانب ہوا۔ یہ سفرنامہ ادبی لحاظ سے اتنا اہم نہیں ہے لیکن اس کی تاریخی اور سیاسی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

1900 سے 1940 تک کے درمیان کے سفرناموں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں جن خواتین نے سفرنامے تحریر کیے نہایت ہی اعلیٰ اور اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور کچھ نے تو ریاستوں کا بار ہی اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ تعلیم اس وقت عام نہ تھی۔ یہ خواتین سماج میں حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کی حامی تھیں۔ اس کے لیے مسلسل کوششیں کیں اور عملی میدان میں آ کر سماج میں اپنی حصے داری کو ثابت کیا۔ یہ خواتین اس بات کی ضامن ہیں کہ وہ درون خانہ کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، معاشی شعبے میں بھی اپنی کارکردگی اور اپنی گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

ان خواتین میں عطیہ بیگم فیضی کے علاوہ اور دیگر سفرنامہ نگار پردے کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم سختی سے پردے کا اہتمام کرتی تھیں لیکن کبھی بھی ریاست کے نظم و نسق میں کوئی کوتاہی نہیں آنے دی۔ عطیہ فیضی پہلی ایسی خاتون تھیں جنھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک کا سفر کیا۔ سماج کی تمام تر بندشوں کو فراموش کیا حالانکہ ادب اور شائستگی کا دامن کبھی نہ چھوڑا اور خود بھی تعلیم حاصل کی اور دیگر خواتین کی تعلیم و تربیت میں معاون و مددگار بھی بنیں۔ یہ خواتین اپنے رسالے بھی نکالتی تھیں اور رسالوں میں مضامین بھی لکھا کرتی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر معاشرے کے سامنے آ کر تقاریر بھی کرتی تھیں۔ انھیں اس بات کا بھی علم تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی بات کو پہنچانے کے لیے ادب ایک بہترین ذریعہ ہے۔

ان خواتین نے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ادب کو ہی بنایا۔ اس کے ذریعے انھوں نے خواتین کے اندر سماج میں عورتوں کے حقوق اور تعلیم کی طرف توجہ دی۔ ان خواتین نے روزنامچے، خودنوشت، سوانح، علمی، مذہبی مضامین اور سفرنامے ادب میں تخلیق کیے۔ زیادہ سے زیازہ موثر انداز میں اپنی روزمرہ کی زندگی سے متعارف کرایا تاکہ دیگر خواتین کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کا موضوع و مخاطب صرف خواتین اور ان کے مسائل ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ خواتین قوم و ملت کا درد بھی اپنے سینے میں نہاں رکھتی تھیں۔ لوگوں کے سامنے بیرون ملک کی تعلیم و تربیت، رہن سہن اور سیاسی، معاشی اور صنعتی ترقیوں کا ذکر کرتی ہیں تاکہ ہندوستان کی پسماندہ و زبوں حال زندگی گزار رہے لوگوں کے اندر تعلیم اور ترقی حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہو۔

■

Adeela Jaseem
Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Email.:adilajasim1991@gmail.com

آصف پرویز

دوارکا پرشاد افق لکھنوی کی شاعری

ہماری مشترکہ تہذیب کے علمبردار اور عہد ساز شعرا، جنھوں نے افق ادب پر چمک کر ایک عہد کو چونکا دیا ان میں ایک نمایاں نام ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کا بھی ہے۔ افق لکھنوی ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جہاں شعروادب ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ شاعری ان کی پشتینی وراثت تھی افق لکھنوی کے دادا منشی ایشوری پرشاد شعاع شعروادب کے پارکھ تھے اور اپنے عہد کے خوش گو شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ فارسی شاعری کا عمدہ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ آپ ایک کامیاب نثر نگار بھی تھے۔ افق لکھنوی کے والد منشی پورن چند ذرہ اردو اور فارسی کے دلدادہ اور شعروشاعری کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ انھیں تاریخ نویسی میں ید طولی حاصل تھا۔ 'اودھ سماچار' حکومت اودھ کی تاریخ پر مبنی اہم اور تاریخی دستاویز کی اہمیت رکھتا ہے۔ مزید برآں آپ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ اپنے بیٹے رام سہائے تمنا کی ادارت میں ایک ہفت روزہ اخبار 'تمنائی' اور ایک اخبار 'مہر ظرافت' شائع کیا۔

شعروادب کے ایسے ہی گہواروں میں پلنے والے اردو زبان وادب کے پروردہ اور محب اردو ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی ہیں جنھوں نے نہ صرف خاندانی روایت کو آگے بڑھایا۔ بلکہ اپنی انفرادی شان و شوکت کے جوہر بھی دکھلائے۔ مذہبی اقدار، گنگا جمنی تہذیب، جذبۂ حب الوطنی، اخلاقیات، معاشرتی میل جول، جذبۂ ایثار وقربانی، اور خلوص ومحبت ان کی شاعری کے طرۂ امتیاز ہیں۔

ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا اور ابتدا دل تخلص اختیار کیا۔ اس دور کی شاعری سے متعلق دو اشعار پیش خدمت ہیں۔

عاشق بے سروساماں سے نہ تم اے مہرباں
رشتۂ الفت نہ توڑو عہد و پیماں کی طرح
ساتھ غیروں کے نہایا جس گھڑی وہ بہر حسن
پھٹ گیا دریا کا دل عاشق کے داماں کی طرح

لیکن انھوں نے جلد ہی افق تخلص اختیار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے افق شاعری پر چھا گئے۔

خاک زاہد سے اگر تسبیح کے دانے بنیں
مانگ لیں ہم رند انگلی پر نچانے کے لیے

ان کے اشعار کے مطالعے سے فن بلاغت اور عروض پر ان کی کامل دسترس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ رعایت لفظی، تشبیہات واستعارات وغیرہ صنعتوں کا استعمال خوب سے خوب تر ملتا ہے۔ غزل کے علاوہ انھوں نے مسدس، رباعی، مثنوی، قصیدہ اور تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

عظیم شاعر ماضی حال اور مستقبل کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کی تخلیق ہر دور میں پڑھنے والے کے فکروذہن کو متاثر کرتی ہے۔ میرے خیال میں ادب وہی کامیاب ہے جو عصری مسائل وموضوعات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

غربت ہر دور کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے مگر افق صاحب نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ غربت زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ یعنی غربت کوئی مسئلہ نہیں بلکہ تمام مسائل کا حل ہے کیوں کہ غربت ہی انسان کو خدا کے نزدیک مقبول بناتی ہے۔ ارشاد ہے۔

امیری آدمی کو عیش سے مجہول کرتی ہے
غریبی درگاہ اللہ میں مقبول کرتی ہے

انسانیت نوازی اور انسانی ہمدردی ان کی شاعری کا وصف خاص ہے۔ آج مادہ پرستی کی اس دنیا میں انسانیت دم توڑ رہی ہے انسانی اقدار شکست و ریخت کا شکار ہیں۔ حرص وہوس، غرور و گھمنڈ اور خود پرستی کے اس دور میں انسانیت سسکتی نظر آتی ہے اس حوالے سے افق کی شاعری ہر دور میں ہماری رہبری کرتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خودی اہل خودی کا آپ ہی سر توڑ دیتی ہے
خودی انساں کا منہ راہ ادب سے موڑ دیتی ہے
بنا دیتی ہے اندھا چشم باطن پھوڑ دیتی ہے
ڈبونے کے لیے کشتی بھنور میں چھوڑ دیتی ہے
خودی سے آدمی کیسے فرشتہ نے نہ پھل پایا
وہ کھویا دم بھر میں خودی سے تھا جو کل پایا

(مسدس خودی)

عالمی مذہبیات پر منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کو عالمانہ دسترس تھی۔ ہندو مذہب کے ساتھ ہی دیگر مذاہب کا عمیق مطالعہ رکھتے تھے۔ مذہبی تعلیمات کے مطابق تکبر اور گھمنڈ کا انجام صرف اور صرف تباہی ہے۔ خدائے حقیقی نے غرور کرنے والوں کا کیا انجام کیا، تاریخ شاہد ہے۔ فرعون، ابرہہ، شداد، نمرود تو دوسری طرف راون، ہرشیہ، کشیپ، راجہ نل وغیرہ نے جب حد سے تجاوز کی اور سرکشی پر اتر آئے تو خدا نے ان کو رہتی دنیا تک کے لیے عبرت بنا دیا۔

سزاوار اس سے فرعوں ہوگیا قہر الٰہی کا
ملا ضحاک کو داغ اس خودی سے روسیاہی کا
نشانہ بن گیا شداد اس خو سے تباہی کا
ہوا صدمہ اسی سے راجہ نل کی عزلہ شاہی کا
خودی ہی سے تنزل کنس کے اقبال نے دیکھا
خودی ہی سے تہہ تیغ اپنا سر ششوپال نے دیکھا

زمانہ شاہد ہے کہ مظلوموں پر ظلم ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ افق صاحب فرماتے ہیں خدا مظلوموں کی فریاد رد نہیں کرتا لہٰذا ایک نہ ایک دن انھیں انصاف مل کر ہی رہتا ہے۔

غضب ڈھاتی ہیں مظلوماں پریشاں حالی کی آہیں
جلا دیتی ہیں جسم آہن کا مردہ کھال کی آہیں

انسانیت ہی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے انسانی اقدار سے عاری شخص حیوان سے بدتر ہے۔ انسانی اقدار زماں ومکاں کی قیود سے بالاتر ہوتے ہیں انسان چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو انسانیت اولین شرط ہے۔

گوہر انسان خوش گوہر کا ہے جوہر یہی
فخر کا تمغہ یہی ہے وقر کا زیور یہی
آدمیت آدمی کو زینہ معراج ہے
گر نہیں انسانیت کیا ہے جو سر پر تاج ہے

منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کی شاعری میں گنگا جمنی

تہذیب، قومی یکجہتی، مذہبی ہم آہنگی اور سیکولزم کے عناصر خاص طور پر جلوہ گر ہیں۔ جذبہ حب الوطنی سے سرشار ان کی رباعی دیکھیے۔

ہندوستاں گھر جہاں پناہی کا ہے
ماتھے پر اسی کے فخر کا ٹیکہ ہے
عظمت کا ثبوت قدرتی ہے افق
اوپر ہے ہند نیچے امریکہ ہے

ہمالہ کی عظمت پر یوں رقمطراز ہیں۔

حوروں کی طبیعت اس پہ لوٹی دیکھی
وسعت میں بہشت اس سے چھوٹی دیکھی
سر ہند سے ہوگیا فلک کا نیچا
جس وقت ہمالیہ کی چوٹی دیکھی

اس رباعی میں افق صاحب نے ہند کی عظمت اور اس کی تہذیب و ثقافت کا ذکر بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

افق صاحب کا گھرانہ مذہبی تھا جس کا اثر ان کی شاعری میں صاف جھلکتا ہے۔ مذہب اور انسانیت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ مذہب کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ ہر مذہب نے انسانیت کی تعلیم دی ہے۔ وہ مذہبی تفریق کے خلاف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مذہبی اتحاد وہم آہنگی گنگا جمنی تہذیب کی روح ہے اور آج سماجی زندگی اسی روح سے خالی نظر آتی ہے۔ جس کی بنیاد پر فرقہ وارانہ فسادات اور مذہبی عدم برداشت کی فضا قائم ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے افق فرماتے ہیں۔

مولی لا مذہبی سے انسان کو بچائے
نفرت نہ کسی دین سے ہونے پائے
مذہب پہ رہو افق ہمیشہ قائم
سمجھے رہو جان جائے ایمان نہ جائے

مذہبی اتحاد واحترام کے ساتھ قومی یکجہتی جو آج کی ایک اہم ضرورت بن گئی ہے اسی کا درس دیتے ہوئے خلوص ومحبت، نیک نیتی اور ہمدردی پر زور دیتے ہیں۔

بھائی کی طلب کبھی نہ اصلاً دیکھی
سمجھے نہ بھلی کسی کا دیکھا دیکھی
ہمدردی باہمی نہ کی تو نے افق
دنیا میں کبھی نہ جاتی دنیا دیکھی

ہندوستانی سماج میں عورت کو اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ عورت دیوی، ماں، بیوی، بہن، بیٹی اور بھارت ماتا کی مختلف جہت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ عورت کا تقدس ہی سماج کی اصل روح ہے۔ افق صاحب کے یہاں عورت کا ذکر کرتے ہوئے کومل بھٹناگر لکھتی ہیں:

''افق کے یہاں عورت مثالیت کا پیکر ہے۔ سراپا رحمت ہے، عفت وپارسائی، ایثار وقربانی اور خودسپردگی اس کا جذبہ اعظم ہے۔ عورتوں کی انہی خصوصیات کی وجہ سے ان کا مرتبہ قابل ستائش مانا گیا ہے۔''

(ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی، کومل بھٹناگر صفحہ نمبر 247 لکھنؤ 2007)

عورت کی پاک دامنی ہی اس کی عفت وعصمت کی حفاظت کرتی ہے۔ آج بھی ایک ہندوتانی عورت اپنی عصمت کو بچانے کے لیے اپنی جان تک دینے سے گریز نہیں کرتی۔ ہندوستانی عورت کی شوہر پرستی اور وفا شعاری اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اپنے شوہر کو خدا اور بھگوان کا درجہ دیتی ہے اور اسے پوجتی ہے۔ افق اپنی مثنوی استری دھرم میں فرماتے ہیں۔

قلم کو ہے ادب ساوتری کا
بیاں ہے دھرم ہندو استری کا
ہے ہندو استری شوہر کا دام انگ
ہے چوکھا اس کے حسن وعشق کا رنگ
لباس اخلاق ہے زیور وفا ہے
سنگار اس کا محبت ہے، حیا ہے

افق صاحب نے ہندوستانی بیوہ عورتوں کی سادہ زندگی اور ان کی ایثار وقربانی کو عمدہ اور گہرے جذبات کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

مشرف ہوگی سنیاس سے ہے
سوا عظمت میں جوگ ابھیاس سے ہے
تپیاس جوگیوں کی دل لگی ہے
بڑا سے بھی بڑا تپ بیوگی ہے
ریاضت ہے بڑی دل بس میں کرنا
عبادت ہے بڑی پتے کا مرنا

استاد اور شاگرد کا رشتہ ہر دور میں مقدس مانا جاتا ہے۔ خدمت استاد کو ہمارے سماج میں کافی اہم تصور کیا جاتا ہے۔ ایک طالب علم جب بھی اپنے استاد کے سامنے آتا ہے۔ آداب شاگردی کا ہمیشہ خیال رکھتا ہے۔ افق کی مثنوی 'گرو سیوا یا خدمت مرشد' میں گرو یعنی استاد کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح ہندو مذہب میں شیش اور گرو کا رشتہ مقدس مانا جاتا ہے۔ افق صاحب اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ گرو کے بنا علم کا حصول ممکن نہیں۔ کیونکہ گرو کا درجہ ایشور سے بڑا ہے۔ گرو کی محبت وعظمت خدا تک پہنچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جو شاگرد اپنے گرو کی عزت کرتا ہے وہ دنیا وآخرت میں کامیاب ہوتا ہے۔ گرو علم کی روشنی سے شاگرد کی دنیا منور کرتا ہے۔ افق کہتے ہیں۔

گرو کی واجب التعظیم ہے ذات
ہے اس کی ساری دنیا سے بڑی بات
گرو سے جھکتے ہیں کشورستاں تک
جاتے ہیں اس کے آستاں تک

اور پھر۔

گرو کی جس نے دل سے بات مانی
ملی اس کو حیات جاودانی
افق تعظیم دو دل سے گرو کی
جگہ دو گوشہ دل میں گفتگو کی

ایک بلند پایہ شاعر ماضی کی بازیافت، حال آئینہ اور مستقبل کا پیش رو ہوتا ہے۔ دوارکا پرشاد افق ایسے ہی شعرا میں سے تھے جنھوں نے اپنی تاریخ کے اوراق پارینہ کو فراموش نہیں کیا اور حال پر بھی غائرانہ نگاہ رکھی اور مستقبل کے لیے ایسے نکات کو بروئے کار لایا جو ان کی شناخت بن گئی اور شاعری سے پیغمبری کا کام بھی لیا جانے لگا۔

افق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ شاعری کا مذاق ستھرا اور اعلیٰ تھا۔ فن شاعری پر مکمل قدرت کے ساتھ موضوع اور بیان کی پیش کش کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ شارب صاحب افق لکھنوی کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک انسانیت دوست اور قوم وملک کے لیے دردمند دل رکھتے تھے۔ اور انگریزی کی آمد کے بعد جو تہذیبی انقلاب ملک میں آیا جس نے اگر ایک طرف ترقی کی راہیں کھولیں تو دوسری طرف صدیوں پرانی تہذیبی وراثت اور رشتوں کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ نقصان پہنچایا اور یہ صورت کسی بھی حساس انسان کے لیے تکلیف دہ ہوسکتی ہے۔ اس زمانے کے تمام عالموں اور دانشوروں نے اس وقت پیدا ہونے والی برائیوں کی طرف توجہ دلائی لیکن اپنی شاعری کے ذریعے جس خوبصورت اور پراثر انداز میں دوارکا پرشاد افق نے لوگوں کو متوجہ کیا اس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ افق کی شاعری ایک طرح سے اس کا بھی اظہار ہے کہ شاعری صرف عشق وعاشقی کے اظہار اور تفنن طبع کی چیز نہیں ہے اس کے ذریعے فکر اور ذہنوں کو بدلا جاسکتا ہے۔ اپنے عہد میں دوارکا پرشاد افق نے اپنی شاعری کے ذریعے بہت کامیابی سے اس سے یہ کام لیا۔ ان کی شاعری ڈیڑھ سو سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد آج بھی تازہ اور اثر آفریں ہے۔''

(دوارکا پرشاد افق لکھنوی، شارب ردولوی، نیا دور، ص نمبر 39، ستمبر 2014)

حواشی

1 دبستان لکھنؤ کے عظیم ادیب ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی، کومل بھٹناگر، 2007، ناشر مصنف لکھنؤ
2 منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نمبر، نیا دور، ستمبر، 2014

■

Asif Parvez
Research Scholar, Dept of Urdu
Alia University
Kolkata - (West Bengal)
Mob.:9804511171

مشاعروں کے فروغ میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار

فرمان چودھری

اردو زبان وادب کے فروغ میں مشاعروں کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ مشاعروں نے اردو زبان کو عوام تک پہنچانے اور مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشاعرہ مشترکہ تہذیب کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ ہے جو مختلف الخیال لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ مشاعرے ہماری تہذیبی اقدار کا اہم حصہ ہیں۔ مشاعرے کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہر عہد میں اس نے زبان اردو کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر اس نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ایک وہ بھی وقت تھا جب مشاعروں میں کسی خاص طبقے کی شمولیت ہوتی تھی۔ آج مشاعروں نے اپنے دامن کو وسعت دیتے ہوئے ہر خاص وعام کو شامل کیا ہے۔ یہ اردو شاعری کی مقبولیت ہے۔ ہندوستان سمیت پوری دنیا میں ایسی روایت کسی اور زبان میں نہیں ملتی جس میں شعرا کا کلام سننے کے لیے عوام کا ہجوم جمع ہو۔ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے مشاعروں کی شکل بھی تبدیل کردی ہے۔ پہلے جہاں عوامی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور ریڈیو، ٹی وی پر ان کی ریکارڈنگ نشر کی جاتی تھی، وہیں اب روایتی مشاعرے کے ساتھ ساتھ ریڈیائی مشاعروں اور اسٹوڈیو مشاعروں کا بھی آغاز ہوگیا ہے۔ جہاں شعرا کو جمع کرکے ان کا کلام سنا جاتا ہے اور اسے ریکارڈ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ریڈیائی مشاعرے اور ٹیلی ویژن مشاعرے اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کررہے ہیں۔ ان مشاعروں کے ذریعے قومی یکجہتی کا فروغ بھی ہورہا ہے۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ٹیلی ویژن آج ایک ضرورت ہے۔ ترسیل وابلاغ میں ٹیلی ویژن ایک ایسا ذریعہ بن کر ابھرا ہے جس کا مقابلہ کوئی دیگر ذریعہ کرہی نہیں سکتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ اس کا سمعی اور بصری نظام ہے۔ اس میں آواز تو سنائی پڑتی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ چیزیں بھی دیکھی جاتی ہیں لہٰذا اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

15 ستمبر 1959 کو ہندوستان میں ٹی وی کا آغاز ہوا۔ ٹیلی ویژن معلومات پہنچانے کے علاوہ لوگوں کے لیے تفریح کا سامان تو مہیا کرتا ہی ہے، اس کے علاوہ یہ اردو زبان وادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کررہا ہے۔ خواہ وہ تفریحی چینل ہوں یا پھر خبریں نشر کرنے والے ہندی چینل۔ یہ تمام چینل اردو زبان وادب کے فروغ میں کسی نہ کسی طرح اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں جن کی اہمیت کبھی بھی کم نہیں ہوسکتی۔ ٹیلی ویژن کی پہنچ اب شہر تو شہر، قصبوں اور گاؤں تک ہوگئی ہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام کے لوگوں کو اس نے اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ ہر خاص وعام ٹیلی ویژن کو بہت ہی شوق سے دیکھتے ہیں اور بڑی دلچسپی سے اس کے پروگراموں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس پر نشر ہونے والے پروگراموں کا، ان پروگراموں میں استعمال ہونے والی زبان اور الفاظ کا، اس کے دیکھنے اور سننے والوں پر اثر پڑنا فطری ہے۔ لہٰذا ٹی وی نے مشاعروں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے نشریاتی ذرائع کا جائزہ لیں تو ہندوستان میں کئی ایسے اردو چینل ہیں جن پر خبروں کے علاوہ اردو زبان وادب اور ثقافت سے متعلق بہت سے پروگرام ترجیحی طور پر نشر کیے جاتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ ٹیلی ویژن پر اردو نشریات سے اردو زبان وادب کا فروغ بھی ہوتا ہے، اس کی رسائی بھی دور تک ہوتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ سائنسی ایجادات واختراعات کی وجہ سے دنیا ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن اور اس کے بعد انٹرنیٹ کی ایجاد نے فاصلوں کو بالکل ختم کردیا ہے۔ موبائل اور سوشل میڈیا نے اس سے دو قدم آگے کا سفر طے کرتے ہوئے دنیا کو انسان کی مٹھی میں بند کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واٹس ایپ، فیس بک، یوٹیوب اور ٹیلی ویژن کے ذریعے دنیا کے کسی بھی گوشے میں منعقد ہونے والے پروگرام بڑی آسانی سے ہم دیکھ لیتے ہیں۔

ترسیل وابلاغ کے بحر ذخار میں 'ٹیلی ویژن' معلومات فراہم کرنے اور اطلاعات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ تفریح کا ایک معتبر ذریعہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناظرین اپنی ذہنی آسودگی کے لیے ٹیلی ویژن کا رخ کرتے ہیں۔ چونکہ یہاں ہر کسی کے ذوق کی تسکین کا خیال کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر رقص وموسیقی اور ساز وآواز کے علاوہ زندگی کے ان گنت رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں عشق کی گہرائی بھی ہے اور حسن کی انگڑائی بھی۔ فنون لطیفہ کے جملہ اقسام میں شعروادب کی اہمیت وانفرادیت اس لیے مسلم ہے کہ اس میں زندگی کی تمام جہتیں روشن ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے پروگراموں میں ادبی پروگراموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کا ایک بڑا جال پھیلا ہوا ہے۔ نیوز چینل اور تفریحی چینلوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ اردو چینلوں کی تعداد گرچہ کم ہے لیکن جو چینل ہیں انھیں دیکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد برصغیر کے ساتھ ساتھ خلیجی اور یوروپی ممالک میں آباد ہے۔ اردو چینلوں کی تعداد یہاں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اردو چینلوں میں ڈی ڈی اردو، نیوز 18 اردو (ای ٹی وی اردو)، زی سلام، منصف ٹی وی، عالمی سے اور تہذیب ٹی وی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ ٹی وی چینل ایسے ہیں جنہیں اردو چینل تو نہیں کہا جاسکتا البتہ ان پر اردو کے پروگرام بھی نشر کیے جاتے ہیں، خاص طور پر مشاعرے کی کلپس۔ تمام اردو چینلوں میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان سبھی چینلوں پر مشاعرے ضرور نشر کیے جاتے ہیں۔ جن سے شائقین مشاعرہ محظوظ ہوتے ہیں۔

دوردرشن ہندوستان کا ایک قومی نشریاتی ادارہ ہے۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے نشریاتی اداروں میں ہوتا ہے۔ دوردرشن نے 1959 میں تجرباتی طور پر نشریات کا آغاز کیا تھا۔ جو آج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ دوردرشن کے قومی اور علاقائی سمیت تقریباً 31 چینل ہیں جو 24 گھنٹے پروگرام نشر کررہے ہیں۔ جن کی پہنچ تقریباً 90 فیصد آبادی تک ہے۔

ڈی ڈی اردو ایک انفوٹینمنٹ چینل ہے جس میں خبروں کے علاوہ سیریل، مشاعرے، غزل، بیت بازی،

دستاویزی فلمیں، فیچر فلمیں اور دیگر تفریحی پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ ابتدا میں ڈی ڈی اردو کی نشریات کا دورانیہ چھ گھنٹے پر محیط تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد مکمل اردو چینل کا درجہ دے کر اسے چوبیس گھنٹے کا کر دیا گیا۔ ڈی ڈی اردو ایک مفت چینل ہے جو کیبل سمیت تمام چینل فراہم کرنے والی ڈی ٹی ایچ کمپنیوں کے ذریعے مفت میں دکھایا جاتا ہے۔ ڈی ڈی اردو کے ناظرین نہ صرف ہندوستان میں ہیں بلکہ ایشیا، چین اور خلیجی ممالک کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں ڈی ڈی اردو کی نشریات سے محبان اردو فیضیاب ہو رہے ہیں۔

ڈی ڈی اردو کا سلوگن ہے 'خوشبو ہندوستان کی' سرکاری چینل میں ڈی ڈی اردو، اردو سے متعلق پروگرام، مشاعرے اور ہندوستانی تہذیب وثقافت سے دنیا کو متعارف کرا رہا ہے۔ اس کے پروگرام معاشرے کے تمام طبقات میں دیکھے جاتے ہیں۔ ہر سنیچر کو ڈی ڈی اردو پر نمائندہ قومی یا عالمی مشاعرہ نشر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈی ڈی اردو پر اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیے گئے مشاعرے بھی نشر ہوتے ہیں۔ ڈی ڈی اردو کے پروگراموں سے نہ صرف قومی یکجہتی کو فروغ مل رہا ہے بلکہ اس سے اردو زبان وادب کو بھی فروغ مل رہا ہے اور اردو کے لیے ایک نئی فضا سازگار ہو رہی ہے۔

حیدرآباد سے نشر ہونے والے ای ٹی وی اردو چینل کو ہی نیوز 18 اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کیونکہ ای ٹی وی کے تمام حقوق نیوز 18 گروپ نے خرید لیے ہیں۔ لیکن اس سے چینل کی مقبولیت اور اس کے آہنگ پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا اور وہ پہلے کی طرح ہی اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ پروگرام بھی تقریباً وہی ہیں جو پہلے تھے۔ بلکہ اس کے پروگرام مزید بہتر ہو گئے ہیں۔

نیوز 18 اردو کو 16 / مارچ 2018 کو نئے نام کے ساتھ لانچ کیا گیا جبکہ اس کا پہلا نام ای ٹی وی اردو تھا۔ ای ٹی وی اردو کو ہندوستان کا پہلا اردو چینل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اینا ڈو گروپ کے اس چینل کا افتتاح 15 / اگست 2001 کو فلم اداکار دلیپ کمار کے ہاتھوں کیا گیا تھا۔ اس چینل کی نوعیت بین الاقوامی ہے۔ یہ نہ صرف ہندوستان میں مقبول ہے بلکہ خلیجی ممالک سمیت پوری دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ اس چینل کو شروع کرنے کا سہرا آندھرا پردیش کے مشہور صنعت کار راموجی راؤ کو جاتا ہے۔

نیوز 18 اردو 24 گھنٹے چلنے والا ایک انفوٹینمنٹ چینل ہے۔ نیوز 18 اردو پر خبروں کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی مشاعرے بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ محفل مشاعرہ نیوز 8 1 اردو کا ایک مقبول ترین پروگرام ہے۔ نیوز 18 اردو ہندوستان اور بیرون ممالک کے مشاعرے ریکارڈ کر کے نشر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شعرا کو اپنے اسٹوڈیو میں بلا کر بھی مشاعرے کا انعقاد کرتا ہے جسے بعد میں نشر کیا جاتا ہے۔ اس طرح ناظرین گھر بیٹھے قومی، بین الاقوامی اور اسٹوڈیو میں ہونے والے مشاعرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں کے ذریعے اردو گھروں میں داخل ہو رہی ہے۔ نیوز 18 اردو کے مشاعروں نے اردو کو گلی گلی اور گھر گھر تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج غیر اردو داں حضرات بھی اس پروگرام کے ذریعے اردو کے قریب آ رہے ہیں اور ان میں اردو سیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔

زی میڈیا کارپوریشن لمیٹڈ کا ایک اہم اردو چینل ہے زی سلام۔ اس چینل کا افتتاح فروری 2010 میں دہلی میں کیا گیا تھا۔ شروع میں یہ ایک مذہبی چینل تھا لیکن بعد میں 2014 سے اس میں کچھ بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ جس سے یہ چینل نہ صرف مسلم ناظرین کی پسند بنا ہوا ہے بلکہ غیر مسلم ناظرین بھی اس سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ جس پر خبروں کے ساتھ ساتھ پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

زی سلام چینل پر حمد ونعت کے علاوہ سلام محفل اور جشن مشاعرہ نام کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ زی سلام اردو کی مقبول صنف شاعری حمد ونعت کو فروغ دینے میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ سلام محفل زی سلام پر مشاعرے اور ادبی نشستوں کا بہت ہی خوبصورت پروگرام ہے۔ اس پروگرام میں کچھ شعرا وشاعرات کو اسٹوڈیو میں بلایا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ روایتی مشاعرے سے الگ اسے ٹی وی کا مشاعرہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ سلام محفل میں بڑے اور عمدہ شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ایک سنجیدہ محفل سجتی ہے اور ناظرین اردو شاعری کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ اردو کو مقبول بنانے میں اس طرح کے مشاعروں کا بڑا عمل دخل ہے۔

منصف ٹیلی ویژن میں بھی خبروں کے ساتھ ساتھ ادب وثقافت سے متعلق پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ 'اس ہفتے کا شاعر' منصف ٹی وی کا ایک ادبی سلسلہ ہے جسے کافی پسند کیا جاتا ہے۔ دکن میں اردو کے مرکز حیدرآباد سے 26 جنوری 2011 کو منصف ٹی وی چینل کو لانچ کیا گیا۔ منصف گروپ کے ذریعے شروع کیا گیا یہ ایک انفوٹینمنٹ چینل ہے۔ چینل شروع کرنے سے قبل منصف گروپ کا ایک روزنامہ اخبار منصف کے نام سے حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے جو بہت مقبول اخبار ہے۔ منصف ٹی وی پر ادبی پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں ایک شاعر ایک کہانی کافی اہم ہے۔ اس کے علاوہ منصف ٹی وی پر مشاعرے بھی نشر کیے جاتے ہیں۔

پرنٹ میڈیا میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد سہارا گروپ نے 27 دسمبر 2010 کو مشہور شاعر مرزا غالب کے یوم پیدائش کے موقع پر عالمی سہارا کے نام سے اردو چینل لانچ کیا۔ یہ ملک کا پہلا 24 گھنٹے کا اردو نیوز چینل ہے۔ بعد میں اس چینل کا نام عالمی سہارا سے بدل کر عالمی سے کر دیا گیا۔ یہ چینل ہندوستان پاکستان سمیت 53 ممالک میں دیکھا جاتا ہے۔ خبروں اور حالات حاضرہ کے علاوہ اس چینل پر پیش ہونے والے سماجی، ادبی اور ثقافتی پروگرام اردو کی ترویج وترقی میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ مشاعرے کا پروگرام بزم ادب ہو یا لٹریری پروگرام بزم سخن ادبی شخصیات سے ملاقات پر مبنی پروگرام ایک ملاقات، ان سب نے اردو داں خواتین وحضرات کے ادبی وشعری ذوق وشوق کو نکھارا اور اس کی آبیاری کی ہے۔

بزم سخن عالمی سے کا ایک اہم پروگرام ہے۔ اس کے تحت ہفتے میں ایک بار ملک وبیرون ملک میں ہونے والے مشاعرے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ گھر بیٹھے لوگ مشاعرے کی محفل سے لطف اندوز ہو سکیں۔

ہندوستان میں اردو ناظرین خاص طور پر مسلم ناظرین کی بڑی تعداد کو دیکھتے ہوئے دہلی کے قرول باغ میں تہذیب ٹی وی کا افتتاح جنوری 2018 میں کیا گیا۔ تہذیب ٹی وی پر مذہبی، ادبی، ثقافتی اور صحت سے متعلق پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک پروگرام چینل ہے، جس کا مقصد اردو زبان وادب کی تہذیب سے عوام کو واقف کرانا ہے۔

محفل تہذیب مقبول پروگرام ہے جس میں چار سے پانچ شعرا کو بلا کر اسٹوڈیو میں ایک ادبی نشست کی ریکارڈنگ کی جاتی ہے۔ ریکارڈ کیے ہوئے مشاعرے کو بعد میں کئی بار ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر سوشل میڈیا نے بھی مشاعروں کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ 15 فروری 2005 میں وجود میں آنے والے یوٹیوب سے مشاعروں کا جتنا فروغ ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج یوٹیوب پر قدیم شعرا کا کلام خود ان کی آواز میں موجود ہے۔ جس سے پوری دنیا کے شائقین مشاعرہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ جدید شعرا بھی اپنا کلام ویڈیو بنا کر یوٹیوب پر اپلوڈ کرتے رہتے ہیں۔ جس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مشاعروں کا بھی فروغ ہو رہا ہے۔

■

Farman Chaudhary
C-68 Flat No. 404
Shaheen Bagh, Jamia Nagar Okhla
New Delhi-110025
Mob. 9910440960
EMail:farman257@gmail.com

رفعت مشتاق

بین الاقوامی سیاحت کی اہمیت

ہندوستان کے حوالے سے

گذشتہ چند دہائیوں کے دوران سیاحت کی صنعت نے زبردست ترقی حاصل کی ہے۔ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں سیاحت کی صنعت معاشی اور معاشرتی سطح پر نمایاں کردار ادا کرتی نظر آرہی ہے۔جس کے سبب بین الاقوامی تجارت کو فروغ حاصل ہورہا ہے۔دراصل سیاحت کے ذریعے وسیع پیمانے پر ملازمت کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، آمدنی کے ذرائع بڑھتے ہیں اور پوری دنیا میں برآمدات کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

سیاحت کا تعلق انسان کے فطری ذوق سے ہے۔ ہر شخص مختلف مقامات دیکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔گزشتہ صدیوں میں بھی جب کہ لوگوں کے پاس ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے ذرائع بھی نہ تھے اور تھوڑے فاصلے پر بھی جانے کے لیے دنوں، ہفتوں اور مہینوں کا وقت لگ جایا کرتا تھا، تب بھی کچھ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے تھے اور اپنی وسعت وطاقت کے مطابق قدرت کے پیدا کردہ مقامات اور حسین مناظر کا شوق سے مشاہدہ کرتے تھے۔لیکن اب جب کہ سفر کے لیے بہت سے وسائل مہیا ہوچکے ہیں، بسیں، ٹرینیں یہاں تک کہ تیز رفتار ہوائی جہاز وجود میں آگئے ہیں، جس کے باعث ایک ملک سے دوسرے ملک تک کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے، تو لوگوں نے دنیا دیکھنے کی اپنی فطری خواہش کی تکمیل کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ملک کے اندر موجود اور ملک کے باہر پائے جانے والے سیاحتی مقامات کی سیر کرنا اب عوام الناس کا دلچسپ مشغلہ بن گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں سیاحت کی صنعت کو دن بہ دن ترقی حاصل ہورہی ہے۔

سیاحت کا شعبہ دنیا کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لاکر بین الاقوامی تفہیم میں بھی مدد کرتا ہے اور مختلف اقوام وممالک کی تہذیب وثقافت اور رسم ورواج کو بھی سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔اسی لیے پوری دنیا کے لوگ مختلف ممالک کی متنوع ثقافتوں، رسم ورواج اور روایات کو سمجھنے اور اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے سرحد پار کا سفر کرتے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کی بات ہے تو ہندوستان ایشیا کا ایک ایسا سیاحتی مقام ہے جس میں مختلف مذاہب، روایات، ثقافتیں، لباس اور تہوار ہیں۔ یہاں پہاڑوں کا بھی سلسلہ ہے۔ساحلی علاقے بھی ہیں۔جغرافیائی مقامات، محلات، مذہبی اہمیت کے مقامات بھی پوری دنیا کے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کیرالہ، کشمیر، گوا ساحل، منالی، شملہ جیسے علاقوں میں دنیا بھر کے سیاح آتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ ملک قدیم تاریخی اور ثقافتی تعمیراتی ڈھانچے جیسے میسور پیلس، قطب مینار، تاج محل، چار مینار (حیدرآباد)، ہوا محل (جے پور)، فتح پور سیکری، اجنتا ایلورا غار (اورنگ آباد)، ہمپی کے مقامات، وکٹوریہ میموریل (کولکتہ)، مغل باغات (جموں وکشمیر) سے مالا مال ہے۔ان مقامات کو دنیا کے سب سے پرکشش سیاحتی مقامات میں شامل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان حیاتیاتی تنوع سے بھی مالا مال ہے جس میں دنیا کے صرف 2.4 فیصد اراضی رقبہ موجود ہونے کے باوجود، دنیا کے تمام ریکارڈ شدہ پودوں اور جانوروں کے تقریباً 7.8 فیصد موجود ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں پودوں کی تقریباً 45000 species، 15000 پھولدار پودوں، 91000 جانوروں کی پرجاتیوں جس میں 60000 کیڑے کے پرجاتی، 2456 مچھلی کی پرجاتی، 1230 پرندوں کی پرجاتی، 372 ستدھاری جانور، 440 سے زائد رینگنے والے جانور اور 1200 امفیبئن شامل ہیں۔

ہندوستان میں بین الاقوامی سیاحت کی اہمیت

دنیا بھر سے سیاحوں کی ہندوستان آمد کی وجہ سے بین الاقوامی سیاحت میں ہندوستان کا مقام بلند ہوتا جارہا ہے۔گزشتہ چند دہائیوں کے دوران سیاحت کے نقطہ نظر سے ہندوستان پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ہر سال ہمارا ملک سیاحتی شعبے میں مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ مسلسل پچھلے سال سیاحت کی صنعت کی ترقی نے عالمی معیشت کی ترقی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔سال 2017 میں فرانس اس درجہ بندی میں سرفہرست تھا جس نے 86.9 ملین بین الاقوامی سیاحوں کو اپنی طرف راغب کیا، اسی طرح اسپین نے 81.8 ملین، امریکہ نے 76.9 ملین، چین نے 37.7 ملین، ترکی نے 37.6 ملین، جرمنی نے 37.5 ملین اور تھائی لینڈ نے 35.4 ملین بین الاقوامی سیاحوں کو بالترتیب اپنی طرف راغب کردیا (UNWTO report, 2018)۔تاہم، بین الاقوامی سیاحوں کی رسیدوں کے معاملے میں یہ امریکہ تھا جو اس درجہ بندی میں سرفہرست تھا (210.7 امریکی بلین ڈالر)، اس کے بعد اسپین (68 امریکی بلین ڈالر)، فرانس (60.7 امریکی بلین ڈالر)، تھائی لینڈ (57.5 امریکی بلین ڈالر)، برطانیہ (51.2 امریکی بلین ڈالر)، اٹلی (44.2 امریکی بلین ڈالر)، آسٹریلیا (41.7 امریکی بلین ڈالر)، جرمنی (39.8 امریکی بلین ڈالر)، مکاؤ چین (35.6 امریکی بلین ڈالر) اور جاپان (34.1 امریکی بلین ڈالر) بالترتیب شامل ہیں۔

ہندوستان کی معاشی ترقی پر براہ راست اور بالواسطہ سفر اور سیاحت کا اثر دکھائی دے رہا ہے۔ ورلڈ ٹریول اینڈ ٹورازم کونسل کی رپورٹ نے جی ڈی پی پر سفری اور سیاحت کے اثرات کے لحاظ سے ہندوستان کو 184 ممالک میں سے 7 ویں نمبر پر رکھا ہے، اور سیاحت کی شراکت کے لحاظ سے روزگار پیدا کرنے میں دوسرا درجہ دیا ہے۔مزید برآں اس رپورٹ میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ سال 2017 میں سیاحت کی صنعت نے ہندوستان کے جی ڈی پی میں بلاواسطہ اور بالواسطہ 9.4 فیصد، روزگار کی پیداوار میں 8 فیصد، کل برآمدات میں 5.8 فیصد اور کل سرمایہ کاری میں 6.3 فیصد کی شراکت کی ہے۔لہٰذا، سیاحت کی صنعت ترقی کو تحریک دیتی ہے، روزگار پیدا

کرتی ہے، غیر ملکی زرمبادلہ کی صورت میں آمدنی اور حکومت کے لیے آمدنی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ہندوستان میں مزدوروں کی صلاحیتوں اور تکنیکی مہارتوں کی سطح کو دیکھتے ہوئے، ہنرمند اور غیر ہنرمند مزدوروں کو ملازمت فراہم کرتی ہے، جو انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ لاکھوں لوگوں کو ملازمت فراہم کرنے کے علاوہ یہ ٹریول ایجنسیوں، ہوٹل مالکان، سیاحوں کے رہنماؤں، ایئر لائن کمپنیوں وغیرہ کے لیے بھی کمائی کا ذریعہ ہے۔

سال 1995 سے سال 2016 تک ملک میں بین الاقوامی سیاحوں کی آمد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ بین الاقوامی سیاحوں کی آمد میں ہندوستان کا حصہ 1.17 فیصد ہے، جو ملک کو عالمی سطح پر 26 ویں پوزیشن پر رکھتا ہے، اور ایشیا اور پیسیفک خطے میں اس کا حصہ 4.81 فیصد ہے، جو اسے ساتویں پوزیشن پر رکھتا ہے۔ محکمہ سیاحت، حکومت ہند 2018 کی رپورٹ میں یہ بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ بین الاقوامی سیاحوں کی وصولیوں میں ہندوستان کا حصہ امریکی ڈالر کے لحاظ سے دنیا میں 2.05 فیصد ہے جس کی درجہ بندی 13 ویں نمبر پر ہے اور ایشیا اور پیسیفک خطے میں اس کا حصہ 7.01 فیصد ہے جس کی درجہ بندی 7 ویں پوزیشن پر ہے۔ سیاحت کی وزارت حکومت ہند کی کوششوں کی وجہ سے، وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سیاحت کی پوزیشن میں بہتری آئی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں کے دوران غیر ملکی سیاحوں کی آمد میں تقریباً چھ گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ حکومت اور کاروباری تنظیموں کی طرف سے پیش کی جانے والی کوششوں کے سبب ہے۔ وزارت سیاحت، حکومت ہند نے قومی، ریاستی اور علاقائی سطح پر سیاحت کے شعبے کی ترقی کے لئے متعدد نتیجہ خیز کوششیں کی ہیں۔

سیاحت کی صنعت سے ہندوستان کی زرمبادلہ کی آمدنی میں گذشتہ سالوں میں مثبت اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک زرمبادلہ کی آمدنی کا تعلق ہے، وزارت سیاحت کے ذریعہ فراہم کردہ تخمینے کے مطابق ہندوستان نے سال 2016 کے دوران سال 2015 کے مقابلے میں 14 فیصد کا اضافہ ریکارڈ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی سال 2016 میں 154146 کروڑ روپے تھی جس کے مقابلے میں سال 2015، میں زرمبادلہ کی آمدنی 135193 کروڑ روپے تھی۔ تاہم، امریکی ڈالر کے حوالے سے، سیاحت کے شعبے سے غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی سال 2016 میں 22923 ملین امریکی ڈالر تھی جو پچھلے سال کے مقابلے میں 8.8 فیصد سے بڑھی تھی۔ اسی طرح سال 2017 کے دوران ہندوستان کی سیاحت سے زرمبادلہ کی آمدنی 27310 ملین امریکی ڈالر تھی جس کی سالانہ شرح 19.1 فیصد تھی۔

ہندوستان متنوع ثقافت اور روایات کا حامل ملک ہے، یہاں کے تہواروں، روایات، رسومات، ثقافتی وتہذیبی ورثے کے مقامات کو دنیا بھر میں شہرت حاصل ہے اور ان کا قدرتی حسن بہت مقبول ہے۔ یہ پوری دنیا سے زائرین کو راغب کرتا ہے۔ سال کے تمام موسموں میں ملک میں داخلی اور بین الاقوامی سیاحوں کی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ دنیا بھر میں سیاحوں کو راغب کرنے کی وجہ حکومت اور کاروباری تنظیموں کی طرف سے پیش کی جانے والی کوششیں بھی ہیں۔ وزارت سیاحت حکومت ہند نے گذشتہ برسوں میں مختلف اقدامات کیے ہیں تاکہ ہندوستان میں سیاحت کی صنعت شناخت، تنوع، ترقی اور فروغ پائے۔ سیاحت کے پہلو کو موسمی طور پر قابو پانے، ہندوستان کو 365 دن سیاحتی مقام کی حیثیت سے فروغ دینے، سیاحوں کے بار بار آنے کو یقینی بنانے، ماحولیات کی سیاحت کو بڑھانے، ایڈونچر ٹورزم وغیرہ کو بڑھانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً حکومت ہند مختلف پالیسیاں مرتب کرتی ہے تاکہ بین الاقوامی سیاحوں کا رخ ہندوستان کی طرف کیا جائے۔ ان میں ہندوستانی سیاحت کی پالیسی 1982ء، نیشنل ایکشن پلان برائے ٹورزم 1992ء اور 2002ء کی نیشنل ٹورزم پالیسی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی سیاحت کے فروغ اور مارکیٹنگ کے ارادے سے بھی متعدد دیگر قدم اٹھائے گئے جن میں incredible India campaign 2002, Atithi Devo Bhavah of 2008, Visit India 2009 وغیرہ شامل ہیں۔ مرکزی حکومت کے پانچ سالہ منصوبوں میں بھی سیاحت کی صنعت پر کافی توجہ دی گئی ہے۔

مزید براں وزارت سیاحت، حکومت ہند نے قومی، ریاستی اور علاقائی سطح پر سیاحت کے شعبے کی ترقی کے لیے متعدد نتیجہ خیز کوششیں کیں۔ ان کوششوں میں ہوائی اڈوں کی جدید کاری اور اپ گریڈیشن، روڈ انفراسٹرکچر کو جدید بنانا، ٹیلی مواصلات کی ترقی، مختلف مقاصد کے حامل سیاحوں کے لیے ای ویزا (e-visa) کی مختلف سہولیات، اہم سیاحوں اور زیارت گاہوں میں سفر کرنے میں راحت وغیرہ سیاحوں کی آمد کو راغب کرنے میں انتہائی کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وزارت سیاحت نے سال 2014-15 میں دو بڑی اسکیمیں بھی شروع کیں یعنی ملک کے روزگار کے مواقع کو بڑھانے اور سیاحوں کے تجربات کو بہتر بنانے کے لیے تمام اسٹیک ہولڈرز کی ضروریات اور خدشات سے نمٹنے کے لیے سودیش درشن اسکیم شروع کی گئی تھی۔ رپورٹ میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس اسکیم نے سیاحوں کی اہمیت، مسابقت اور استحکام کے اصولوں کو مربوط انداز میں حاصل کرنے کے لیے theme based tourist circuits کو تیار کرنے پر توجہ دی ہے۔ اسی طرح PRASHAD کی اسکیم کے تحت، 25 ریاستوں میں 41 مقامات ترقی کے عمل کے لیے شناخت کیے گئے ہیں۔ اس رپورٹ میں اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ اس مقصد کے لیے، 28 منصوبوں کی تکمیل کے لیے 857.61 کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے، جن میں سے 397.67 روپے مارچ، 2019 تک جاری کردیے گئے ہیں۔

سال 2016 میں ملک کے نصف بین الاقوامی سیاحوں کا تعلق براعظم ایشیا سے تھا جس کے بعد بالترتیب یورپ، آسٹریلیا اور امریکہ سے تھا۔ تاہم، غیر ملکی سیاحوں کی کم سے کم آمد براعظم افریقہ سے تھی۔ سال 2016 میں علاقائی لحاظ سے ہندوستان کے سیاحوں کی آمد زیادہ سے زیادہ جنوبی ایشیاء کے خطے سے 24.93 فیصد تھی۔ اس کے بعد مغربی یورپ (23.05 فیصد)، شمالی امریکہ (18.33 فیصد)، جنوب مشرقی ایشیاء (8.47 فیصد)، مشرقی ایشیاء (7.01 فیصد)، مغربی ایشیاء (5.13 فیصد)، مشرقی یورپ (4.61 فیصد)، آسٹریلیا (3.96 فیصد)، افریقہ (3.42 فیصد) اور وسطی اور جنوبی امریکہ (0.89 فیصد) سے بالترتیب تھی۔

سال 2016 میں ہندوستان کے بین الاقوامی سیاحوں کی اکثریت بنگلہ دیش سے تھی جس کی شراکت 19 فیصد تھی۔ اس کے بعد امریکہ اور برطانیہ کی شراکت 18 فیصد اور 13 فیصد تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے ان تینوں ممالک سے ہندوستان کے 50 فیصد سے زیادہ بین الاقوامی سیاحوں کی آمد ہے۔ یہ تینوں ممالک پچھلی دو دہائیوں سے مسلسل ہندوستان کے 3 سرفہرست سیاحتی ممالک کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کے بین الاقوامی سیاحوں کے لئے آمدورفت کے طریقوں کا تعلق ہے، زیادہ تر غیر ملکی سیاح ارضی اور پانی کی نقل وحمل کے مقابلے میں ہوائی نقل وحمل کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ سال 2016 میں 84.1 فیصد سیاح ہوائی نقل وحمل کے ذریعہ ہندوستان پہنچے۔ زمینی اور پانی کی نقل وحمل سے بالترتیب 15.0 فیصد اور 0.9 فیصد ہندوستان پہنچے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عام طور پر غیر ملکی سیاح تفریح کی غرض سے دوسرے ممالک جاتے ہیں۔

■

Reffat Mushtaq
ICSSR Doctoral Fellow in Economics
Maulana Azad National Urdu University,
Hyderabad- 500032 (Telengana)
Mob.: 7006644076

ایم ایس۔ ایکسل میں فنکشن

(Functions in MS-Excel)

ایکسل میں دستیاب ورک شیٹ فنکشن ایسی طاقتور سہولیات ہیں، جن کی مدد سے آپ پیچیدہ سے پیچیدہ حساب کر سکتے ہیں۔ اس میں ایسے سیکڑوں فنکشن دیے گئے ہیں، جن کی مدد سے آپ انجینئرنگ کے بھی حساب کر سکتے ہیں، ٹیکسٹ کو بدل سکتے ہیں اور دیگر بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ ورک شیٹ فنکشنز (Worksheet Functions) کا استعمال اکیلے فارمولہ کی شکل میں یا دوسرے فنکشنز اور آپریٹروں کے ساتھ زیادہ پیچیدہ فارمولے بنانے میں کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، SQRT() فنکشن کسی جمع والے عدد کا مربع (Square Root) معلوم کرتا ہے۔ آسان تر معاملے میں آپ کسی سیل میں فارمولہ '=SQRT(16)' بھر سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ '4' دیکھ سکتے ہیں یا پھر اس کا استعمال پیچیدہ فارمولوں میں کیا جا سکتا ہے، جیسے '=5*SQRT(16)'۔

فنکشن زیادہ تر ورک شیٹ میں دیگر چیزوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں، جیسے '=SQRT(A3)' سیل A3 میں بھرے ہوئے عدد کا مربع نکالے گا۔ کچھ فنکشن سیلوں کی جانچ کر کے نتیجہ دیتے ہیں، جیسے فنکشن EXACT() دو ٹیکسٹ کا موازنہ کر کے بتاتا ہے کہ وہ برابر ہیں یا نہیں۔ اسی طرح کچھ فنکشنز چیزوں کی شکل بدل دیتے ہیں، جیسے فنکشن UPPER() کسی ٹیکسٹ کو چھاپے کے بڑے حروف (Capital Letters) میں بدلتا ہے۔ ایکسل میں زیادہ تر کاموں اور حسابوں کے لیے فنکشن پہلے سے موجود ہیں اور ضرورت پڑنے پر آپ اپنے نئے فنکشن بنا کر جوڑ سکتے ہیں۔

فنکشن کے حصے (Parts of a Function)

کسی فنکشن کے دو حصے ہوتے ہیں۔ **فنکشن کا نام (Function Name)** اور **براہین (Arguments)**۔ مثال کے طور پر 'SQRT(16)' میں SQRT ایک فنکشن کا نام ہے اور جس عدد کا مربع یہ نکالتا ہے، یعنی 16، اس کا برہان ہے۔ براہین کو قوسین میں رکھا جاتا ہے، جیسا کہ اوپر دی گئی مثالوں میں کیا گیا ہے۔ کسی فنکشن میں ضروری براہین کی تعداد اس کے نحو (Syntax) کے مطابق 0 (صفر) سے لے کر اس سے زیادہ کتنی بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، فنکشن SQRT میں صرف ایک برہان (Argument) ہوتا ہے، جب کہ فنکشن SUM میں براہین کی تعداد کتنی بھی ہو سکتی ہے۔ فنکشنز کا نحو یا تو آپ ایکسل کے مینوئل میں دیکھ سکتے ہیں یا ایکسل کی ہیلپ (Help) ونڈو میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کسی فنکشن میں ایک سے زیادہ برہان ہیں، تو ان سب کو کاما (Comma) کے ذریعے الگ الگ کیا جاتا ہے، جیسے '=SUM(14,52,B8)'

ہم برہان کے طور پر دوسرے فنکشنز کا بھی استعمال کر سکتے ہیں، جیسے '=SQRT(SUM (C3:C8)'، '=ROUND (SQRT(C5),2)' وغیرہ۔ پہلی مثال میں سب سے پہلے رینج C3:C8 کے عددوں کا جمع نکالا جائے گا، پھر اس جمع کا مربع معلوم کیا جائے گا۔ دوسری مثال میں سیل C5 میں بھرے گئے عدد کا مربع معلوم کر کے اسے اعشاریہ نقطہ (Decimal Point) کے بعد 2 جگہوں تک قریب (Round) کیا جائے گا۔ اگر کسی سیل میں کوئی فارمولہ بھرا ہوا ہے، تو اس میں فارمولے کی آخری قدر ہی دکھائی جاتی ہے۔

ایکسل میں ورک شیٹ فنکشنز کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب آسانی کے لیے انھیں درج ذیل گیارہ زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1	مالیاتی (Financial)	2	تاریخ اور وقت (Date&Time)
3	حسابیات اور ٹرگنومیٹری (Math&Trig)	4	شماریاتی (Statistical)
5	حوالہ جات (Lookup&Reference)	6	کوائفیہ (Database)
7	متن (Text)	8	منطقی (Logical)
9	اطلاع (Information)	10	انجینئرنگ (Engineering)
11	مکعب (Cube)		

ان میں سے ہر ایک زمرہ میں بڑی تعداد میں مفید فنکشن دستیاب ہیں۔ ان میں سے کچھ زیادہ مفید فنکشنز کے نام اور مختصر تعارف نیچے دیے گئے ہیں:

تاریخ اور وقت فنکشن (Date and Time Functions)

Date	: دن کی تعداد	Day	: کسی تاریخ کا دن
Month	: کسی تاریخ میں ماہ	Now	: موجودہ وقت
Today	: آج کی تاریخ	Weekday	: ہفتہ میں کام کرنے والے دن
Year	: کسی تاریخ میں سال		

حسابی فنکشن (Mathematical Functions)

ABS	: کسی عدد کی مطلق قدر
EXP	: قوت نما (Exponential)
FACT	: کسی عدد کا جزضربیہ (Factorial)
INT	: کسی عدد کا کل حصہ
LN	: فطری لوگرتھم (بنیادی)
LOG	: دی ہوئی بنیاد پر لوگرتھم
LOG10	: بنیاد 10 پر لوگرتھم
MOD	: کسی حصہ کا بقیہ (Remainder)
PI	: پائی (π) کا نتیجہ 3.14159265358979
POWER	: کسی عدد کا مکعب
RAND	: 0 سے 1 کے درمیان کا بے ترتیب نمبر (Random Number)
ROUND	: دی ہوئی اعشاریہ عددوں تک قریبی قدر
SQRT	: کسی جمع نمبر کا مربع (Square Root)
SUM	: دیے ہوئے عددوں کا جمع

شماریاتی فنکشن (Statistical Functions)

AVERAGE	: دیے ہوئے عددوں کا اوسط
MAX	: سب سے بڑا عدد
MIN	: سب سے چھوٹا عدد
STDEV	: معیاری انحراف (Standard Deviation)
VAR	: تغیر (Variance)

ٹیکسٹ فنکشن (Text Functions)

CHAR	:	کسی دیے ہوئے کوڈ کا کیرکٹر (Character)
CODE	:	کسی کیرکٹر (حرف) کا کوڈ
EXACT	:	دو ٹیکسٹوں کا موازنہ کرنا
LEFT	:	کسی ٹیکسٹ کا بایاں حصہ
LEN	:	کسی ٹیکسٹ میں کیرکٹر کی تعداد (یا ٹیکسٹ کی لمبائی)
LOWER	:	کسی ٹیکسٹ کو چھوٹے حروف (Small) میں بدلنا
MID	:	کسی ٹیکسٹ کا بیچ کا حصہ
RIGHT	:	کسی ٹیکسٹ کا دایاں حصہ
TRIM	:	شروع اور اخیر کی سبھی خالی جگہیں (Spaces) ختم کرنا
TEXT	:	دیے ہوئے عدد کا ٹیکسٹ بنانا
UPPER	:	کسی ٹیکسٹ کو بڑے حروف (Capital letters) میں بدلنا
VALUE	:	صرف عدد والے ٹیکسٹ کی عددی قدر

منطقی فنکشن (Logical Functions)

AND	:	منطق 'اور'
IF	:	اگر (حالت کی جانچ کرنا)
NOT	:	منطق 'نہیں'
OR	:	منطق 'یا'
TRUE	:	منطق 'سچ' یا 'ہاں'
FALSE	:	منطق 'غلط' یا 'ہاں'

ان میں سے کسی بھی فنکشن کے بارے میں تفصیل سے جاننے کے لیے ایکسل کی ہیلپ (Help) سہولت کی مدد لینی چاہیے، جس کے بارے میں آگے بتایا گیا ہے۔

فنکشنز میں مدد لینا (Taking Help in Functions)

ایم ایس-ایکسل میں فنکشنز کے بارے میں کام کرتے وقت ہی آن-لائن مدد لینے کی سہولت دستیاب ہے۔ اس سے آپ کے لیے فنکشن لکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1 ورک شیٹ میں اس سیل کو ایکٹو کیجیے، جہاں فنکشن بھرنا ہے یا جوڑنا ہے۔

2 سیل میں = سے شروع کرکے فنکشن سے پہلے تک کا فارمولا (اگر کوئی ہو) ٹائپ کیجیے۔

3 انسرٹ فنکشن (Insert Function) بٹن، جس پر fx چھپا رہتا ہے، کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر E-5.1 کی طرح 'Insert Function' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

4 اس ڈائیلاگ باکس میں اوپر بتائے گئے سبھی گیارہ زمروں کے علاوہ 'Most Recently Used' اور 'All' کے دو نئے زمرے بھی دیے گئے ہیں۔ ان میں سے 'All' میں سبھی زمروں کے سبھی فنکشن حروفی ترتیب میں دیے جاتے ہیں اور 'Mostly Revently Used' میں آپ کے ذریعے حال ہی میں استعمال کیے گئے فنکشن دیے جاتے ہیں، تاکہ کوئی فنکشن بار بار نہ ڈھونڈنا پڑے۔

5 آپ کسی بھی زمرے کی فہرست میں سے اپنی ضرورت کا فنکشن چنیے۔ جب بھی آپ کسی فنکشن پر کلک کرتے ہیں، اس کا مختصر تعارف اس ڈائیلاگ باکس میں نیچے کے حصہ میں دکھایا جاتا ہے۔ جس فنکشن کو آپ چننا چاہتے ہیں، اسے کلک کرکے OK بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کے ذریعے چنے ہوئے فنکشن کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا، جیسا کہ تصویر E-5.2 میں SUM فنکشن کا ڈائیلاگ باکس دکھایا گیا ہے۔

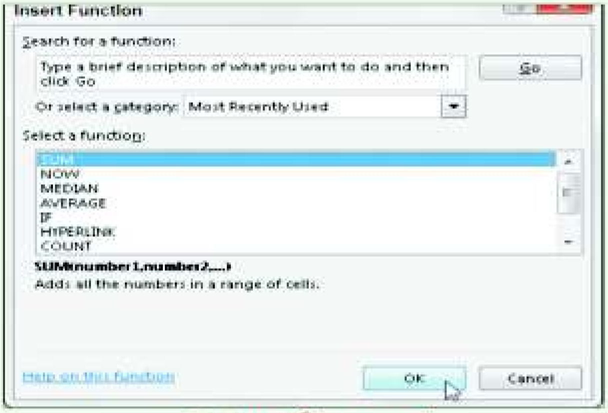

تصویر E-5.1: انسرٹ فنکشن کا ڈائیلاگ باکس

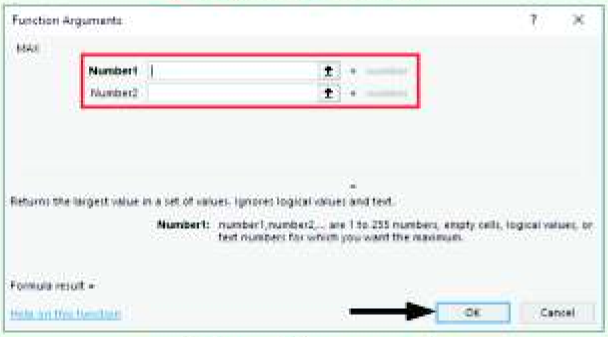

تصویر E-5.2: SUM فنکشن کا ڈائیلاگ باکس

اس میں براہان (Aregument) بھرنے کے لیے ضروری باکس دیے جاتے ہیں۔

6 اس ڈائیلاگ باکس میں آپ متعینہ باکسوں میں کوئی بھی براہان (عدد، سیل پتہ یا رینج) بھر سکتے ہیں۔ آپ جو بھی براہان بھریں گے، ان کا نتیجہ (یعنی جمع) اس ڈائیلاگ باکس میں 'Formula result=' کے سامنے دکھایا جائے گا۔ آپ SUM فنکشن کے لیے 1 سے 30 تک براہان بھر سکتے ہیں۔ ہر ایک براہان کی قدر بھی متعلقہ باکس کے آگے دکھائی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، براہان بھرنے کے بعد فنکشن کی جو شکل بنے گی، وہ مین ڈائیلاگ باکس میں مقررہ جگہ پر دکھائی جاتی رہتی ہے، جیسا کہ تصویر E-5.3 میں دکھایا گیا ہے۔

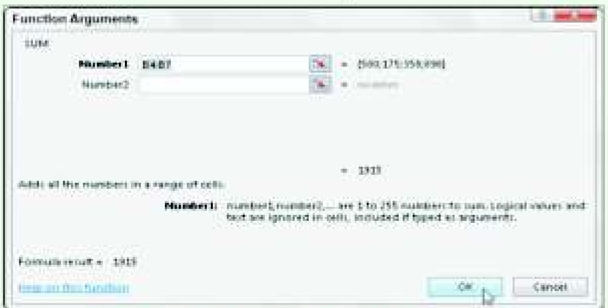

تصویر E-5.3: براہان بھرنے کے بعد SUM فنکشن کا ڈائیلاگ باکس

7 سبھی براہان بھر کر 'OK' بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کے ذریعے بنایا گیا فنکشن ایکٹو سیل میں نقطہ شمول (Insertion Point) یا کرسر کی جگہ پر جڑ جائے گا۔

اس طرح آپ کوئی بھی فنکشن بنا سکتے ہیں۔ ویسے تجربہ ہو جانے پر آپ یہ اور ایسے ہی فنکشن کسی سیل یا فارمولے میں سیدھے بھی ٹائپ کر سکتے ہیں۔ اس سے آپ کا وقت بھی بچے گا۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیا ت کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندھی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

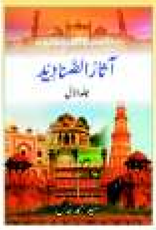

آثار الصنادید (جلد اول، دوم، سوم)

مصنف: سر سید احمد خاں
مرتب: خلیق انجم
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: یوسف رامپوری، ٹانڈہ، رامپور، یوپی

سر سید احمد خاں کی شخصیت مختلف جہات میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بیک وقت مفکر، مصلح، ادیب، انشاء پرداز، مورخ، مصنف اور معلم تھے۔ ان کے کارہائے نمایاں سے ان کے عہد کے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچا اور آنے والی نسلیں بھی ان کے روشن کردہ علم کے چراغ سے فیضیاب ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ سر سید احمد خاں نے عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے جن وسائل وذرائع کا بھرپور استعمال کیا، ان میں ایک وسیلہ 'قلم' بھی ہے۔ قلم کے ذریعے انھوں نے اپنے پیغامات وافکار کو دور تک پہنچایا۔ سماجی، اخلاقی، علمی اور ادبی مضامین لکھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے توسط سے انھوں نے زبان کی اصلاح کا بھی فریضہ انجام دیا کہ اردو زبان شستہ وشائستہ، آسان اور عام فہم ہوجائے۔ سر سید احمد خاں کے قلم سے کئی اہم کتابیں بھی نکلیں جن میں 'آثار الصنادید' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ 'آثار الصنادید' کئی صدیوں پر محیط دہلی کے آثار قدیمہ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں ان عمارتوں کی تفصیلات مہیا کی گئی ہیں جن کو مختلف ادوار میں سلاطین وامرا نے تعمیر کرایا تھا اور جو فن تعمیر کا عمدہ نمونہ قرار پائیں۔ ایسے ہی دہلی کی کئی اہم شخصیات کا تذکرہ بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اسے استناد اور معتبریت کا درجہ حاصل ہوا، اور اسے دہلی کے آثار قدیمہ کے حوالے سے نہایت مستند ماخذ خیال کیا گیا۔ اسی لیے اس کی مقبولیت آج تک برقرار ہے۔

'آثار الصنادید' کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران مختلف اداروں اور مکتبوں سے بار بار اس کے اڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن 1854 میں شائع ہوا تھا، تازہ ترین اڈیشن (2020 میں) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے چھاپا ہے۔ مجموعی طور پر اس کے چھ اڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

آثار الصنادید کا تازہ ترین اور پیش نظر اڈیشن معروف ادیب ومصنف خلیق انجم کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ یہ اڈیشن سابقہ اڈیشنوں کے مقابلے میں اس لیے اہم ہے کہ اس میں مرتب نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ سر سید احمد خاں کے زمانے میں جو عمارتیں موجود تھیں اور جن کا انھوں نے اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے، ان میں سے کون کونسی عمارتیں معدوم ہوچکی ہیں اور کون کونسی عمارتیں ہنوز صفحہ ہستی پر موجود ،اورا وہ کس حالت میں ؟اس اڈیشن میں مرب نے حواشی اور

ماٰخذ کے عنوان کے تحت آثار قدیمہ کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔مرتب نے کتاب میں شامل عمارتوں کی تصویروں کے حوالے سے بہت عرق ریزی سے کام لیا ہے جس کے سبب کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس تعلق سے مرتب کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

’’میں نے بہت سی عمارتوں کی تصویریں خود لی ہیں جو اس اڈیشن میں شامل کی جارہی ہیں۔ان تصویروں سے عمارتوں کی موجودہ حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔چوتھے اڈیشن کے لیے البتہ کچھ تصویریں بعض جدید کتابوں سے بھی لی گئی ہیں۔سرسید نے ’آثار الصنادید‘ کے پہلے اڈیشن میں اپنے ماٰخذ کے حوالے نہیں دیے تھے۔دوسرے اڈیشن میں متن کے حاشیے پر حوالے دیے گئے ہیں۔زیر نظر اڈیشن کے آخر میں جن حواشی کے آگے قوسین میں ’سید احمد‘ لکھا گیا ہے، یہ وہ حواشی ہیں جو سرسید نے لکھے تھے۔ سرسید نے کہیں کہیں کتبوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ یہ کتبے زیر نظر اڈیشن میں شامل کردیے گئے ہیں۔‘‘ (آثار الصنادید،ص 12 ،از سرسید احمد خاں،مرتب خلیق انجم،اشاعت 2020)

اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرتب نے جدید اڈیشن میں کتنے اہم اور مفید نکات پر کام کیا ہے اور ان کو کتاب میں شامل کرکے قارئین کے لیے کس قدر قیمتی معلومات فراہم کردی ہیں۔

آثار الصنادید کو تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔جلد اول 386 صفحات پر مشتمل ہے۔جلد دوم میں 297 صفحات ہیں اور جلد سوم کے صفحات کی تعداد 424 ہے۔کتاب کا سائز موجودہ عہد میں چھپنے والی کتابوں سے بڑا اور الگ ہے۔مرتب خلیق انجم نے ’حرف آغاز‘ میں اپنی بات لکھی ہے جس میں انھوں نے کتاب کی ترتیب کے دوران پیش نظر رکھی جانے والی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ’آثار الصنادید‘ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی اور تحقیقی گفتگو کی ہے۔اس میں دہلی کی اہم عمارتوں کے تذکرے کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ان عنوانات سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے: عہد خاندان غلامان کی تعمیرات،توڑے دار محراب سے اصل محراب تک کا ارتقا،قطب مینار،مسجد قوۃ الاسلام میں توسیع،سلطان غازی کا مقبرہ،اڑھائی دن کا جھونپڑا،التمش کا مقبرہ،مقبرہ رکن الدین، عہد خاندان خلجی،علائی دروازہ، جماعت خانہ، خاندان تغلق کی تعمیرات، تغلق آباد،مقبرہ غیاث الدین تغلق، عادل آباد، محمد آباد یا عمارت ہزار ستون،فیروز شاہ تغلق کی تعمیرات، خان جہاں کی مسجدیں،مقبرہ خان جہاں تلنگانی، خاندان سید کی تعمیرات،خاندان لودی کی تعمیرات، لودی فن تعمیر کی اہم خصوصیات، بابر اور ہمایوں کے عہد کی تعمیرات،سوری خاندان کی تعمیرات،مقبرہ عیسیٰ خاں، سبز برج، مغل عہد کی تعمیرات،ہمایوں کا مقبرہ،دلی عہد بہ عہد،دلی کی قدیم ترین آبادی، اندر پرستھ، اشوک کے عہد کا کتبہ، دلی پر مسلمانوں کا قبضہ،نئی دلی وغیرہ۔

مرتب نے ’سرسید بحیثیت مورخ‘ کے تحت سرسید کی تاریخ شناسی اور تاریخ نویسی کا جائزہ لیا ہے۔اس مضمون کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ سرسید تاریخ کا کس قدر گہرا علم رکھتے تھے۔تاریخ کے موضوع پر سرسید کی جن کتابوں کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے، وہ اس طرح ہیں: جام جم،سلسلۃ الملوک، آئین اکبری،تاریخ بجنور،تاریخ سرکشی ضلع بجنور، اسباب بغاوت ہند،تاریخ فیروز شاہی،تزک جہانگیری، آثار الصنادید۔مرتب نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ سرسید نے مذہبی، تاریخی، علمی، تہذیبی اور تعلیمی موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنے قلم کو کسی ایک یا چند موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا اور بہترین مضامین اور کتابیں تصنیف کیں۔پھر مرتب نے ’آثار الصنادید‘ پر خصوصی بحث کی ہے جس میں وجہ تصنیف کو بیان کرتے ہوئے کئی اور پہلوؤں پر بات کی گئی ہے، آثار الصنادید کے مختلف اڈیشنوں کا تقابلی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

’آثار الصنادید‘ کی جلد اول تین ابواب میں منقسم ہے۔پہلا باب ’دلی کی عمل داریوں کے مختصر حالات‘ کے حوالے سے ہے۔دوسرا باب ’دلی میں قلعوں کے بننے اور آباد ہونے کے بیان میں‘ ہے۔تیسرا باب ’بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے بیان میں‘ ہے۔ باب اول کو شروع کرنے سے پہلے کئی اہم عمارتوں کی تصویریں شائع کی گئی ہیں۔جن میں سے چند اس طرح ہیں: ہمایوں کا مقبرہ، پرانے قلعے میں شیر گڑھ، شمس الدین التمش کے مقبرے کی ایک دیوار پر نقاشی، جنتر منتر، سبز برج، مقبرہ غیاث الدین تغلق،مقبرہ عیسیٰ خاں، مسجد خیر المنازل، دروازہ عرب سرائے، قدسیہ باغ کے ہاتھی خانہ کا دروازہ، فیروز شاہ کوٹلہ۔یہ تمام تصویریں بہت صاف ستھری ہیں۔ان پر ایک نگاہ ڈال کر عمارتوں کی موجودہ صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جلد اول کے پہلے باب کے تحت فرماں روان دہلی کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک فہرست نما خاکہ ہے۔اس کی ابتدا راجہ جدہشٹر سے کی گئی ہے جن کا زمانہ 1400 سال قبل مسیح کا ہے اور اس کا اختتام ملکہ وکٹوریہ پر کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر 1400 سال قبل مسیح سے لے کر 1837 تک کے فرماں رواؤں تک کا ہلکا سا منظر نامہ اس خاکہ کے ذریعے سامنے آجاتا ہے۔اس خاکہ میں جن فرماں رواؤں کے نام مع ولدیت لکھے گئے ہیں ان کا سال جلوس بھی لکھا گیا ہے اور ان کے دار السلطنت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس کی سلطنت کتنی مدت تک قائم رہی۔آخر میں ’حالات‘ کا کالم دیا گیا ہے جس میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ احوال مذکور ہیں۔اگرچہ یہ خاکہ بہت مختصر ہے، تاہم اس سے بھی دہلی کے فرماں رواؤں کے بارے میں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوجاتا ہے۔یہ خاکہ ایک وضاحتی اشاریہ کی بھی شکل رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دہلی کے بادشاہوں کے بارے میں مختصر حالات جانے جاسکتے ہیں۔

دوسرے باب کے آغاز میں ایک فہرست دی گئی ہے جس میں سات کالم ہیں۔پہلا کالم نمبر شمار کا ہے۔دوسرے کالم میں قلعے یا شہر کا نام ہے۔تیسرے کالم میں اصل بانی کا نام درج کیا گیا ہے، چوتھے کالم میں سال ہجری، پانچویں کالم میں سنہ عیسوی ہے، چھٹا کالم کیفیت کا ہے۔ساتواں کالم صفحہ نمبر کے نام سے مندرج ہے، مگر اس میں کسی بھی صفحہ کی کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔اس لیے اس کالم کو بنانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔اگر صفحات نمبر دے دیے جاتے تو یہ کالم بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس فہرست کے توسط سے ہم دلی شہر کے مختلف ناموں سے واقف ہوجاتے ہیں اور دہلی کے مختلف قلعوں کے بارے میں بھی آگہی حاصل کرلیتے ہیں۔فہرست کے بعد ان کے تفصیلی حالات لکھے گئے ہیں۔جن عمارتوں اور مقامات کے تفصیلی حالات دیے گئے ہیں، ان میں اندر پرستھ، دلی، پرانا قلعہ، دین پناہ،قلعہ رائے پتھورا،غزنیں دروازہ، کوشک لال،قلعہ مرغن،قصر معزی،کوشک لال یا نیا شہر، دلی علائی،قصر ہزار ستون، تغلق آباد، جہاں پناہ،کوشک فیروز شاہ یا کوٹلہ فیروز شاہ،شہر فیروز آباد،خضر آباد، مبارک آباد، دہلی شیر شاہ،قلعہ شاہجہاں، دلی دروازہ ولاہوری دوروازہ قلعہ، چھتہ لاہوری دروازہ، نقار خانہ، دیوان عام،نشیمن ظل الٰہی، خاص محل، امتیاز محل، برج طلا یا مثمن برج، شاہ محل یا دیوان خاص،حمام، موتی محل، نہر بہشت، باغ حیات بخش،شاہ برج، شہر شاہجہاں آباد، برج اکبر، اردو بازار اور چاندنی چوک،فیض بازار اور فیض نہر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آثار الصنادید کی پہلی جلد کا دوسرا باب ہمیں

عمارتوں اور مقامات کے بارے میں کس قدر قیمتی معلومات مہیا کراتا ہے۔

تیسرے باب جس میں بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کا اجمالی اور تفصیلی احوال مندرج ہے، اس میں دوسرے باب کی طرح پہلے ایک فہرست نما خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد سلسلہ وار قدرے تفصیلی حالات لکھے گئے ہیں۔ اس باب میں بعض ان عمارتوں کا بھی تذکرہ ہے جن کا تعلق قبل مسیح زمانے سے ہے۔ جیسے لوہے کی لاٹھ، لاٹھ اشوکا وغیرہ۔ اس کے بعد سنہ عیسوی اور سنہ ہجری میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ باب دہلی کے تمام سلاطین اور عمارتوں سے قارئین کو روشناس کراتا ہے۔ گویا کہ مجموعی طور پر آثار الصنادید کی پہلی جلد دہلی کے سلاطین و امرا اور مقامات و عمارتوں کے احوال کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ چوں کہ سرسید احمد خاں ایک بڑے مورخ تھے اور نہایت ہی عرق ریزی سے انھوں نے حالات جمع کیے ہیں، اس لیے ان کی جمع کردہ تفصیلات کو معتبر سمجھا گیا ہے۔ خاص طور سے دہلی کی عمارتوں کے تعلق سے سرسید نے جو کام کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔

'آثار الصنادید' کی دوسری جلد میں دہلی کی معروف شخصیات کا تذکرہ ہے جنھوں نے اپنے عہد میں کارہائے نمایاں انجام دیے یا انھیں کسی میدان میں مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی، البتہ اس جلد میں سلاطین و امرا کے حالات بیان نہیں کیے گئے ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی جلد میں ان کے حالات مذکور ہو چکے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں صاحب کتاب نے ایک عنوان 'دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان میں' قائم کیا ہے۔ اس کے تحت دلی کی آب و ہوا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد شاہ جہاں آباد کے لوگوں کے مجموعی مزاج و مذاق پر بات کی ہے، پھر ذیلی عنوانات کے تحت الگ الگ میدان کی شخصیتوں کا احوال لکھا ہے۔ مثلاً ذکر کبائر مشائخین رضی اللہ عنہم اجمعین، رسول شاہیوں کا بیان، مجذوبوں کا بیان، ذکر حکمائے کرام ذوالمجد والاحترام، ذکر علمائے دین رضی اللہ عنہم اجمعین، ذکر قرا و حفاظ شکر اللہ سعیہم، ذکر بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہجہاں آباد، خوش نویسیاں، مصوران، ارباب موسیقی۔ یہ ذیلی عنوانات اس بات کا پتہ دیتے ہیں سرسید احمد خان نے کس کس شعبے کی شخصیات کے حالات آثار الصنادید کی دوسری جلد میں مرقوم کیے ہیں۔ ذکر کبائر مشائخین کے تحت سترہ اکابر علما و مشائخین کے حالات ہیں۔ مثلاً مولانا شیخ غلام علی، مولانا شاہ احمد سعید، مولانا شاہ عبدالغنی، مولانا فخر الدین، حضرت سید احمد صاحب وغیرہم۔ ذکر حکمائے کرام میں الگ الگ ادوار کے بارہ بڑے حکیموں کا تذکرہ ہے۔ ذکر علمائے دین کے تحت انتیس بڑے علماء کے حالات مرقوم کیے گئے ہیں۔ اس طرح ہر ذیلی عنوان کے تحت متعلقہ شعبے کی متعدد شخصیات کے احوال مندرج ہیں۔ گویا کہ آثار الصنادید دہلی کی بڑی شخصیات کے حالات سے قارئین کو واقف کراتی ہے۔ آخر میں سرسید احمد خاں نے اپنے عہد کے کئی مشاہیر علماء و شعرا کی تقاریظ کو پیش کیا ہے۔ جیسے مرزا اسداللہ خاں غالب، مولوی امام بخش صہبائی، مولانا محمد صدرالدین۔ کتاب کے آخر میں حواشی، کتابیات اور اشاریہ کے شامل ہونے کی وجہ سے کتاب کی معنویت و افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

آثار الصنادید کی تیسری جلد میں تصویریں، کتبے، نقشے پیش کیے گئے ہیں۔ عمارتوں کی تصاویر خاص انداز سے لی گئی ہیں جن سے عمارتوں کا پس منظر اور پیش منظر واضح ہو جاتا ہے۔ تمام تصاویر بہت صاف ستھری ہیں۔ ان عمارتوں کی تصویروں میں مقبروں و مزاروں کی بھی تصویریں ہیں، مسجدوں کی بھی، میناروں کی بھی، گنبدوں کی بھی، قلعوں و محلوں کی بھی، دروازوں کی بھی، دیواروں کی بھی وغیرہ۔ اس کے بعد اہم کتبے شامل اشاعت کیے گئے ہیں جو کتاب کو ایک دستاویزی نوعیت دیتے ہیں۔ ان کتبوں سے دہلی کے مختلف ادوار کے حالات کا گہرائی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ 'نقشے' بھی اس کتاب کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں اور ازمنۂ قدیم و وسطیٰ کی عمارتوں کی صحیح صورت حال کو سامنے لاتے ہیں۔ 'آثار الصنادید' کی تیسری جلد میں مرتب کتاب نے 'حواشی اور ماخذ' کا خاص طور پر التزام کیا ہے جس سے بہت سی درگاہوں، عمارتوں، دروازوں، مسجدوں، مقبروں اور مزاروں کے تفصیلی احوال کا پتہ چل جاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو، فارسی کے ماخذ اور ان کے مخففات کو بھی پیش کر دیا گیا ہے تاکہ قارئین آثار الصنادید میں پیش کیے ہوئے مواد کے مصادر کی طرف رجوع کرنا چاہیں تو آسانی سے کر سکیں۔

آثار الصنادید کے مطالعے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تاریخی لحاظ سے یہ نہایت اہم کتاب ہے، اور اس کتاب کو ہر مؤرخ اور تاریخ کے طالب علم کے پاس ہونا چاہیے۔ سرسید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' آنے والی نسلوں کو ان کے ماضی سے جوڑتی ہے تاکہ وہ عہد رفتہ کی روشنی میں اپنے حال و استقبال کا سفر کامیابی کے ساتھ طے کر سکیں۔ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی عمارتوں کے یہ اعلیٰ نمونے فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خاص طور پر قیمتی ہیں۔

تازہ ترین اڈیشن کو نہایت عمدہ اور قابل استفادہ بنانے میں مرحوم خلیق انجم صاحب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس بات کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے تاریخ اور آثار قدیمہ کے حوالے سے بہت ہی مستند کتاب کو اپنے یہاں سے شائع کرکے باذوق قارئین کے لیے مطالعہ کا قیمتی سامان فراہم کر دیا اور انھیں تاریخ کے بوسیدہ مگر روشن کھنڈرات سے جوڑ دیا تاکہ وہ اپنے ماضی اور اپنی تہذیب کو کم از کم اپنے ذہنوں میں زندہ رکھ سکیں۔ ■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

مضامین پروفیسر افضل الدین اقبال: ایک جائزہ

مرتب/ ناشر: ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم
صفحات: 128، قیمت: 150 روپے
مبصر: ڈاکٹر محی الدین حبیبی
11-3-855، نیو ملے پلی، حیدرآباد۔ 500001 (تلنگانہ)

پروفیسر محمد افضل الدین اقبال جامعہ عثمانیہ کے ان نامور فرزندان میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی توسیع و تحقیق میں بڑا مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نصف صدی پر مشتمل ادبی زندگی میں درجنوں تحقیقی کتب مرتب کیں۔ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ ان کے فرزند ڈاکٹر احتشام الدین خرم نے ان کے چند اہم مضامین کو کتابی شکل دی ہے۔ واقعی یہ انتخاب کا عمل مشکل رہا ہوگا کیونکہ جو کچھ بھی اس کتاب کے مشمولات ہیں وہ سب پروفیسر صاحب مرحوم کی تحقیقی کدو کاوش کی ایک جھلک ہے۔ وہ مضامین میں تمہید بہت کم ہی باندھتے تھے۔ حرف اوّل ہی سے محققانہ انکشافات کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ ہر جملہ ایک تحقیقی منزل کی نشاندہی کرتا تھا۔ وہ 'قلت الفاظ' یا 'کفایت لفظی' کو اپنا کر بین المتونیت میں ربط باہمی کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ایسا تحقیقی انداز اور طرز نگارش بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں جملہ دس مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون ڈاکٹر محمد اقبال پر ہے جو محمڈن کالج مدراس کی اردو سوسائٹی کی جانب سے علامہ اقبال کے خیر مقدم کی روداد ہے۔ تقریباً سو سال قبل کے واقعات کچھ اس دلکش انداز میں پیش کیے ہیں کہ وہ آج کل کی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا مضمون قاضی بدرالدولہ جو شہرۂ آفاق محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے دادا تھے، ان کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے یہ بتایا ہے کہ ان کی زیادہ تر کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ اور سیرت النبی کا احاطہ کرتی ہیں اور یہ اہم تحقیق بھی ہمارے سامنے لائی ہے کہ جس طرح شمالی ہندوستان میں سرسید احمد خان جدید اردو نثر کے بانی قرار دیے جاتے ہیں وہی مرتبہ جنوبی ہند میں قاضی بدرالدولہ کو حاصل تھا۔ 'مولانا آزاد حیدرآباد میں' کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں یہ تذکرہ ہے کہ مولانا آزاد کی پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد آمد اور خصوصاً مسلمانوں کے خوف کو دور کرنے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کا ایک وسیلہ تھا۔ پروفیسر صاحب نے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں سابق والی ریاست حیدرآباد سے ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ چوتھا مضمون 'کتب خانہ سعیدیہ' میر ہے۔ یہ کتب خانہ شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد سعید خاص صاحب کی یادگار ہے جو نادر کتب اور ہمہ لسانی مخطوطات کا مخزن ہے۔ جہاں نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب ممالک کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کرتے ہوئے مخطوطات کو جمع کیا گیا ہے۔ تب ہی تو مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت نے اس کتب خانہ کے معائنہ کو اپنے اولین دورۂ حیدرآباد میں ترجیح دی تھی۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال کا یہ انکشاف چونکا دینے والا ہے کہ اس کتب خانہ کی مدد سے مجلس اشاعت العلوم، دائرۃ المعارف و احیاء المعارف النعمانیہ کے مطبوعات کی اشاعت ہوئی۔ حضرت امجد حیدرآبادی ایک فقید المثال شاعر اور عارف باللہ تھے۔ آپ نے اپنی رباعیوں کے ذریعے صرف چار مصرعوں میں بڑی بلاغت و فصاحت اور اجمال و کفایت لفظی کے ساتھ درس قرآن، حدیث اور تصوف دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر افضل الدین اقبال نے ان کے غیر مطبوعہ کلام کو بڑی تحقیق کے ساتھ تلاش کیا اور ایک اثر انگیز مضمون کی شکل میں ہمارے استفادہ کے لیے پیش کر دیا۔

حضرت امجد کی بھی شاعری پر ایک علیحدہ مضمون ملتا ہے جس میں یہ اہم انکشافات ملتے ہیں کہ مولانا حالی، علامہ شبلی، علامہ اقبال اور پروفیسر وحید الدین سلیم جیسے اکابرین نے بھی آپ کی شعری صلاحیتوں اور مضمون آفرینی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی علمی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہی ان کی بخشش کا انشاء اللہ بڑا وسیلہ بنے گی لیکن ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے 'اردو صحافت عہد آصف سابق' میں' جیسا مضمون لکھ کر ایک نئے پہلو کی طرف ہماری توجہ مرکوز کی ہے اس مضمون میں حیدرآباد میں اردو صحافت کے آغاز اور عروج کی داستان کو قلمبند کیا ہے جس میں عہد عثمانی میں شائع ہونے والے روزناموں، ہفتہ وار اور ماہناموں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ادب کے علاوہ سائنسی علوم سے متعلق کتابوں کی تفصیل اور دارالترجمہ کے بارے میں کما حقہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

قطب ویلور حضرت شاہ عبداللطیف نقوی حیدرآبادی اور ان کی علمی خدمات پر مبنی مقالہ میں حضرت کی تبلیغی سرگرمیوں کو نہایت تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت قطب ویلور کی عربی، فارسی اور اردو تصانیف کا مختصر مگر جامع تعارف بھی پیش کیا ہے جس سے آپ کی گراں قدر اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ 'نظام اردو ٹرسٹ لائبریری' حیدرآباد میں موجود ہے۔ جی ہاں! یہ کتب خانہ 1974 سے نواب مکرّم جاہ بہادر کی زیر سرپرستی آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ یہاں کئی قدیم اخبارات کی فائلیں، رسائل اور کتب موجود ہیں، جو محققین کے لیے معلومات کا ایک مخزن ہے۔ علاوہ ازیں، تقریباً تمام اردو رسائل کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اہم رسائل بھی منگوائے جاتے ہیں۔ جناب حیدر حسینی صاحب معتمد نظام ٹرسٹ کی نگرانی میں اب یہ لائبریری جدید سہولتوں سے بھی آراستہ ہوگئی ہے اور استفادہ کنندگان کی تعداد میں کافی اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔

اپنے آخری مضمون 'محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ' حیدرآباد میں اردو عہد آصف سابق میں سررشتہ اطلاعات کا قیام میں مطبوعات محکمہ اطلاعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف نظما کے دور میں اس محکمہ کی ترقی اور ترویج کو بھی پیش کیا ہے۔

اس طرح پروفیسر محمد افضل الدین اقبال کے مضامین کا یہ مجموعہ ہمیں مختلف اکابرین کے کوائف، شعری و نثری کمالات اور کتب خانوں سے واقف کرواتا ہے جو ایک اسکالر کے لیے نشان منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے بڑے فرزند محمد سعید الدین فرخ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کتاب کی تزئین و آرائش کی ہے۔ یقین ہے کہ تحقیقی، اور علمی ذوق رکھنے والے اس علمی خزینے سے مستفید ہوں گے۔

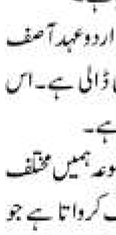

آئینۂ تنقید

مصنف و ناشر: عبدالمتین جامی
صفحات: 200، قیمت: 280، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: شمیم احمد صدیقی، بی 2، نسیم منزل، مدح گنج، سیتاپور روڈ، لکھنؤ۔ 226020

'آئینۂ تنقید' مجموعی طور پر مختلف النوع موضوعات سے متعلق اُن 24 مضامین یا مقالات پر مشتمل ہے۔ کتاب میں شامل موضوعات درج ذیل ہیں: جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک، اڈیشا میں اردو تعلیم کے مسائل اور ان کا حل، صنف رباعی کا ایک

مختصر جائزہ، اڈیشا کے غیراردو داں طبقے میں اردو کی مقبولیت، اڈیشا میں نعتیہ شاعری حال و ماضی کے تناظر میں، اردو تہذیب و ثقافت کی پہچان ہے، اردو ادب کے مختلف اصناف 1905 سے 1955 تک، علامہ شبلی کی غزلوں کا جائزہ، تاج پیامی بنام کلیم الدین، اثر خامہ کا شاعر علیم صبا نویدی، ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری: ایک ہمہ جہت شخصیت، شارق عدیل اپنی رباعیوں کے آئینے میں، سعید رحمانی بہ حیثیت صحافی، ادیب و شاعر، مشرف عالم ذوقی کا ناول نالہ شب گیر: ایک مطالعہ، رؤف خیر کی نثر نگاری: دکن کی چند ہستیاں کے آئینے میں، شاخسار کے اداریے اور تبصرے، غیر منقسم بہار میں اردو کے غیر مسلم شعراء، کتاب العروض پر ایک نظر، صنف دوہا کا ایک اور سنگ میل 'لہجہ لہجہ'، انتقادیات، عمرانیات وادبیات کا دلکش تحفہ، 'عکس معاشرہ'، شعوری رجحان ایک مطالعہ، ورق ورق شمیم: اور ایک دیوان رباعیات، مقبول احمد مقبول کی رباعیات، خالد رحیم: عکس در عکس سے غبار راہ گزر تک —— زیادہ تر مضامین میں صوبۂ اڈیشہ کے شعرا یا قلم کاروں کے ادب پاروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ فہرست عناوین پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ شعری اصناف کو فوقیت دی گئی ہے نیز اُن میں کئی مضامین رباعی سے متعلق ہیں۔

راقم السطور عبدالمتین جامی سے محض نو برس پہلے ہی متعارف ہوا تھا اور یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی تھی کہ اُن کو رباعی گوئی پر اچھی دسترس حاصل ہے۔ لہٰذا خاکسار نے خود کے ذریعہ مرتب کی جانے والی انوکھی کتاب 'گنجینۂ رباعیات' جو اولان و دیوان کے طرز پر تھی، کے لیے کئی درجن ایسی رباعیات اُن سے تخلیق کرائی تھیں جو غیر معروف حروف کو ابتدا یا انتہا میں رکھ کر کہی جاتی تھیں تاکہ ان رباعیات کو حسبِ ضرورت بیت بازی مقابلوں میں پیش کر کے جیت کو یقینی بنایا جاسکے۔ درج ذیل رباعی جامی صاحب نے خاکسار کی درخواست پر ہی لکھی تھی ۔

ضامن تو مرے شعر کے ہوں گے الفاظ پائیں گے مناقب مرے سارے الفاظ
مجروح نگر فکر کو کرتے ہیں عبث نکلے لغتِ جامع کچھ ایسے الفاظ

'آئینہ تنقید' میں جامی صاحب کی شائع شدہ کتابوں کی فہرست دیکھ کر اور 'آئینہ تنقید' کے مضامین پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے ضرور کسی دانشگاہ سے پی ایچ ڈی کی ہوگی اور کسی یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہوں گے۔ راقم السطور کو انتہائی حیرت ہوئی جب یہ پتہ چلا کہ جامی صاحب اُردو میں گریجویٹ بھی نہیں ہیں اور نہ کسی ادارہ میں اردو درس و تدریس میں مصروف ہیں تاہم ہندوستانی دانشگاہوں کے اکثر پروفیسر صاحبان عبدالمتین جامی کی علمی استعداد کے سامنے بونے ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اب تک جو کتابیں شائع کی ہیں اُن میں سیکڑوں رباعیات پر مشتمل دو مجموعہ ہائے رباعیات کے علاوہ ایک دیوانِ رباعیات بھی ہے، غزلیات کے مجموعے بھی ہیں ایک ناول بھی ہے، افسانوی مجموعہ بھی ہے، اُڑیہ ادب سے اُردو میں کیے گئے تراجم اور تحقیق وتنقید کی کتب بھی ہیں۔

'آئینہ تنقید' میں جامی صاحب کی تحریر شستہ ہونے کے ساتھ رواں ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر جس انداز سے بحث کی ہے وہ غماز ہے کہ اُن کی باریک بیں نگاہ نے موضوع کے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ ہم اپنی بات کے ثبوت میں اُن کے مضمون 'تاج پیامی بنام کلیم الدین' سے ایک اقتباس ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

''تاج پیامی صاحب کے جوابوں کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہوئے بھی ہم اس سلسلے میں کچھ اپنی رائے پیش کرنا پسند کریں گے۔ ہماری نظر میں جس طرح کلیم صاحب انتہا پسند تنقید نگار ہیں اسی طرح تاج پیامی صاحب بھی انتہا پسند قاری ہیں۔ کلیم صاحب کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے پوری زبان و ادب کو اپنا معیار بنایا اور اس معیار پر پوری نہ اُترنے والی ہر شے کو یکسر باطل قرار دے دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہرکس وناکس کلیم الدین احمد کے اس قول کا کہ 'غزل نیم وحشی ہے'، صنف سخن کا حوالہ دیتا ہے لیکن اس کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ تاج پیامی اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ ''کسی ملک کی شاعری اگر اپنے دور کے مروجہ علوم سے مطابقت نہیں رکھتی اور زمانے کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کے لئے نیم وحشی کا درجہ رکھتی ہے اور ایک مہذب معاشرے میں وہ شاعر نیم وحشی معلوم ہوتا ہے جو اپنے معاشرے کے تقاضے کو پورا نہ کرے۔''

مضمون کا خاتمہ اس جملے کے ساتھ ہوا ہے ''ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کو کسی بھی فن پارے کے مطالعہ کے وقت شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ خامیوں کو قبول کر لینے ہی میں عظمت ہے نہ کہ ان سے چشم پوشی کرنے میں۔''

'آئینہ تنقید' میں شامل تمام مضامین بڑی عرق ریزی سے تحریر کیے گئے ہیں اور تحقیق وتنقید کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہر مضمون کے ساتھ یہ حوالہ بھی درج ہوتا کہ وہ بطور مقالہ کہاں اور کس کانفرنس میں پڑھا گیا یا کس جریدے کی کون سی اشاعت کی زینت بنا۔

انٹرویوز

عالم خیال میں (اردو کے مرحوم شعرا کے انٹرویوز)

انٹرویو کار: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 64، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عمران عاکف خان، 5/4، فکشن نما، C/o: نگینہ اسٹور نور نگر، نئی دہلی 25

اردو ادب میں گاہے گاہے حیرت انگیز اور خوشگوار اضافے کیے جاتے رہے ہیں... اور ایسا اکثر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی نیا، زرخیز، باشعور اور اعلا تربیت یافتہ ذہن کاغذ وقرطاس کی میراث سنبھالتا ہے۔ لکیر لکیر چلنا سفر اور نامعلوم راستوں میں تو لازمی ہے مگر اردو ادب کی راہوں میں یہ عمل ناپسندیدہ ہے وہاں تو نئی راہیں تلاش کرنے اور نئی سمتوں کا رخ کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ بالخصوص اس وقت تو لکیر لکیر چلنا اور بھی زیادہ معیوب ہوتا ہے جب قلم کار تربیتی مراحل سے گزر کر میدان قلم وقرطاس کا شہسوار بن جاتا ہے۔ تاہم اس وقت یہ بھی لازم ہے کہ قدیم سرمایۂ ادب سے کسی نہ کسی صورت میں اس کا انسلاک ہو اور اگر جدید عہد میں قدیم علوم وفنون، نظریات، افکار، اصناف، تجربات اور مہمات کی بازیافت ہو تو پھر سونے پر سہاگہ والا عمل ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'عالم خیال میں: اردو کے مرحوم شعرا کے انٹرویوز' ایک ایسی ہی کتاب ہے جو اردو ادب میں حیرت انگیز اور خوش گوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح یہ قدیم اردو ورثے سے منسلک ماضی کی اصناف کی بازیافت بھی ہے۔

انٹرویو کار معروف محقق، مصنف، تذکرہ نگار، فکشن پارکھ و نقاد ڈاکٹر غضنفر اقبال ہیں۔ انھوں نے اس مجموعے میں مشاہیر اردو ادب کے جس دل کش وخوب صورت انداز میں انٹرویو لیے ہیں وہ ایک بے نظیر اور لائق تحسین کارنامہ ہے۔ اس طرح انھوں نے لامکاں میں موجود ہستیوں کو بزم امکان میں لا بٹھایا۔

صاحب کتاب نے اس مجموعے میں 9 شاعروں کے انٹرویوز ان کی ہی زبان یعنی شاعری میں کیے ہیں۔ ان شعرا میں ابن صفی، اعجاز صدیقی، محمود ایاز، زبیر رضوی، حمید الماس وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے انھوں نے نہایت بے باکی، جرأت اور نہایت سعادت مندی سے

سوالات کیے ہیں اور جواب دینے والوں نے اسی انداز سے انھیں تمغۂ جواب سے سرفراز کیا ہے۔

عالم خیال میں، یا مرحومین کا انٹرویو یقیناً ایک تعجب خیز اور حیرت انگیز بات ہے۔ اردو ادب میں اس کا سلسلہ کہاں شروع ہوتا ہے اور وہ اولین مصنف کون ہیں جنھوں نے اس سمت میں خامہ فرسائی کی، اسی طرح اردو ادب میں اس کی کوئی گنجائش ہے، نیز اسے کب بطور صنف استعمال کیا گیا؟ ان سوالوں کے جواب ڈاکٹر موصوف اپنے اس عمل یعنی مرحومین کے انٹرویوز کی مہم جوئی کے متعلق، کتاب میں شامل مضمون 'خیال میں' میں یوں رقمطراز ہیں:

'عالم خیال میں 'ملاقات نگاری کا نیا عنوان ہے۔ پتا نہیں کیوں یہ فن ادب وشعر میں آبیاری اور اشاعت وفروغ سے صرف نظر ہوتا رہا۔ نصف صدی سے اوپر اس فن میں اردو کے بارہ عہد ساز شعرا سے آں جہانی نریش کمار شاد (1927-1969) کے مخاطبے کتاب 'الہامی انٹرویوز' میں محفوظ ہیں۔ حالیہ برسوں میں چند اصحاب کی ذہنی کاوشوں نے معروف شعرا کے مخاطبے کیے ہیں جو اُن کے اشتیاق طبع کی روشن دلیلیں ہیں۔

معاصر بدلتی دنیا میں کتاب 'عالم خیال میں' کے شاعروں کا کلام شوق آنکھوں کا سرمہ ہے۔ وقت اب اُلٹے پاؤں چلنے لگا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ مخاطبے باذوق قاری کے طبائع نازک پر گراں نہیں گزریں گے اور راقم تحریر کے مخاطبوں کو تاجوران ادب بہ نظر امعان دیکھیں گے۔'

اقتباسات بالا میں صاحب کتاب نے اولاً تو 'ملاقات نگاری' کے اس عنوان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے معاً ان ادیبوں کا بھی ذکر کیا جنھوں نے اس سمت میں پہلی کوشش کی اور بعد میں بھی گاہے گاہے اس جانب متوجہ ہوتے رہے۔ پھر خود اس کی جانب بہ حیثیت قلم کار توجہ دی اور ایک بے مثال پیش کش نذر قارئین کردی۔ عالم یہ ہے کہ 'عالم خیال' کا یہ 'مخاطبہ' نہایت دل چسپ اور خاصے کی چیز بن گیا۔

انٹرویو کا طریقہ یہ ہے کہ انٹرویو کار شاعر سے نثر میں مختلف رنگ، کیف، جہت، حالت، عالم، انداز، صورت، طرز اور ڈھنگ اسی طرح اردو ادب وشعر میں لازم ومتعدی اندیشوں، امکانات، امیدوں، ناامیدیوں، آسروں، اردو زبان وادب کے تئیں درپیش مسائل غرض جس طرح سے بھی ممکن ہو، سوال پوچھتے ہیں اور شاعر اپنے مجموعہ ہائے کلام میں موجود کسی شعر سے اس کا جواب دیتے ہیں جس سے سوال وجواب دونوں کی معنوی اور فکری اہمیت اُجاگر ہوجاتی ہے۔ شاعر کے مجموعوں میں شامل اس نوعیت کے اشعار کی تخریج کرنا واقعی اہم کارنامہ اور لائق تحسین ومبارک باد کوشش ہے۔ جس کے حق دار بلا شبہ انٹرویو کار ڈاکٹر غضنفر اقبال ہیں۔

کتاب کے سرورق پر ان تمام شعرا کے عکس بنے ہیں، جن سے اس کتاب میں مخاطبہ کیا گیا ہے۔ عمدہ طباعت اور بہترین اسلوب وتزئین کاری نے کتاب کی اہمیت دوچند کردی ہے۔ امید ہے کہ جہاں یہ کتاب اردو ادب میں ایک نئے سلسلے کو فروغ دے گی وہیں قارئین کے ذوق وشوق کی تکمیل بھی اس کے ذریعے ہوگی۔

فکشن

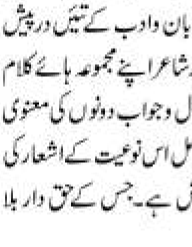

چلڈرنس فارم (ناولٹ)

مصنف: ایم۔ مبین

صفحات: 84، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: امتیاز احمد، ایم اید، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'چلڈرنس فارم' ایم مبین کا ناولٹ ہے جس میں انھوں نے ایک پارسی کے حالات وکوائف، نظریات وعقائد اور انسان دوستی کے تناظر میں سماج میں پنپ رہی جنسی بے راہ روی، ہیجانی انتشار اور بشری تنزل وانحطاط کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب کا انتساب ان نوجوانوں اور جیالوں کے نام ہے جو سماجی بے اعتدالی، اخلاقی بگاڑ، جذباتی کشمکش اور معاشرتی ومذہبی تصادم وتضاد کے شکار ہیں۔ پیش لفظ دیپک بدکی نے تحریر کیا ہے جس میں فکشن کی دو اہم اصناف ناول وافسانہ کی شعریات ومضمرات اور ارتقائی منازل کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور اس ناولٹ کی خصوصیات وامتیازات اور موضوعاتی انفرادیت کو واضح کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔

ناولٹ کی شروعات صبح کے مناظر، عقائد ورسومات کی ادائیگی اور چلڈرنس فارم کے تعارف سے ہوتی ہے، ابتدائی سطروں میں اشتیاق وانہماک کا عنصر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے یہ عنصر مفقود ہوتا جاتا ہے اور کہانی کی دلچسپی اور جاذبیت میں کمی آنے لگتی ہے۔ ناولٹ کے دوسرے حصے میں چلڈرنس فارم کے مالک کا نام، حسب ونسب، شب وروز کے مشاغل، ذریعہ معاش، فارم میں داخلے کے طریقے، نام کرن اور دیکھ بھال کرنے والوں اور والیوں کو متعارف کرایا جاتا ہے اور اسی نہج پر کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے۔

ناولٹ کا موضوع عام ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں انوکھا اور اچھوتا ہے ایسے بے شمار افسانے اور ناول ہیں جن میں سماجی برائی، اخلاقی خرابی اور جنسی تعلقات کے مضر اور مہلک پہلوؤں کو نہ صرف بیان کیا گیا ہے بلکہ ان سے جذبہ تنفر اور ازالہ واصلاح کا شعور بھی بیدار کرایا گیا ہے۔ یہ ناولٹ اس حیثیت سے غیر معمولی اور قابل قرأت ہے کہ اس میں نہ صرف ہیجانی کیفیت کے اسباب وعلل کو موضوع بنایا گیا ہے بلکہ اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی بے راہ روی، غیر شرعی جنسی مراسم، اسقاط حمل، جنین کشی اور جاہ وحشم کی بنا پر طبقاتی استحصال کو نہایت بے باکی سے بیان کیا گیا ہے نیز اس کی آڑ میں کی جانے والی اس انسانیت سوز فعل وعمل کو بھی آشکار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بہت سے معصوم نوزائیدہ اس دنیائے رنگ وبو میں آتے ہی حرمان، بے بسی اور غریب الوطنی جیسے خطرناک اور جاں گسل ماحول وفضا کا شکار ہوجاتے ہیں، ناولٹ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ لوگوں کے لذت حاصل کرنے کے گناہ کی پاداش میں اس کے وجود کی تخلیق ہوئی ہوگی اور وہ دنیا میں ان کی مرضی کے خلاف آیا ہوگا۔''

ناولٹ کا یہ اقتباس ہمیں اندر سے متزلزل کردیتا ہے اور سماج میں پنپ رہے ان درندہ صفت انسانوں سے گھن کرنے اور انتقام لینے پر آمادہ کردیتا ہے نیز اس مقہور ومجبور نومولود کو اپنانے پر اکساتا ہے لیکن حیف کہ ہمارا سماج ومعاشرہ اس عمل بچہ پروری کو معیوب اور اس میں ہاتھ بڑھانے والے کو توہین وتحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ناولٹ نگار سماج کے اس رویے اور نظریے پر چوٹ کرتا ہے اور اسے غیر انسانی وغیر سماجی قرار دیکر عوام الناس کو آگے آکر ختم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ سماج کے اسی غیر انسانی رجحان کو زائل کرنے کے لیے چلڈرنس فارم کا وجود ہوتا ہے جس میں سڑک، پارک اور کچڑے میں پڑے نوزائیدہ بچے کی پرورش و پرداخت ہوتی ہے اور انہیں ایک بہتر زندگی اور روشن مستقبل کے لیے تراشا جاتا ہے۔

ناولٹ میں جہاں ایک طرف فرسودہ معاشرتی عقائد وتصورات، غیر سماجی راہ ورسم اور غیر اخلاقی جنسی تعلقات کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے وہیں دوسری طرف رفاہی وفلاحی ادارے سے پھل پھول کر خوش گوار معاش پانے والے ان لوگوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے جو نوکری، پیسہ اور عیش وعشرت حاصل کرتے ہی سماجی خدمات، انسانی جذبات سے عاری ہوجاتے ہیں اور اپنے جہنم نما شکم کی سیرابی کے لئے ہمہ وقت غریب، نادار اور بے بس کا خون چوسنے کو تیار رہتے ہیں۔

''ارے یہ جانور ڈاکٹر ساگر ہمارے چلڈرنس فارم کا پہلا پلانٹ نمبر 36 ہے۔''

ناولٹ کا کردار بیک وقت مختلف صفات سے متصف نظر آتا ہے، ایک طرف اپنے ماضی کے غیر شعوری گناہ پر تائب و شرمندہ ہے تو دوسری طرف وقتی خواہشات کے تلے روندی جانے والی صنف نازک کی عزت و ناموس اور وقار و مقام کے لیے فکر مند بھی۔ جہاں وہ جوانی کے طوفان بے تمیز میں ہوس و خواہش کی کشتی پر سوار دکھائی دیتا ہے تو وہیں بڑھاپے کا سہارا، آنکھوں کا تارا اور جگر پارہ نہ پاکر مضطرب و مضمحل بھی نظر آتا ہے اور نعمت خداوندی سے محرومی کی وجہ اپنے اس گناہ بے لذت کو تصور کرتا ہے جس کا کفارہ چلڈرنس فارم قائم کر کے بھی ادا نہ کر سکا۔

رسائل و جرائد

ارمغان 9 (مجلّہ)

مدیر اعلیٰ/مدیر: پروفیسر شہزاد انجم/پروفیسر کوثر مظہری

صفحات: 496، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A تیسری منزل

فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ادارہ ہی نہیں بلکہ قوم و ملت کے لیے کسی رہنما سے کم نہیں جہاں تشنگان علم اپنی علمی پیاس بجھا کر عالمی سطح پر اپنے ادارے اور ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ اس ادارے کا قیام 29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ میں عمل میں آیا تھا اور 29 اکتوبر 2020 کو اس ادارے کے قیام کے سو برس مکمل ہو چکے ہیں۔

یہاں کا 'شعبہ اردو' موجودہ عہد میں پورے برصغیر میں اپنی منفرد شناخت قائم کر چکا ہے۔ اس شعبے میں ایسے ایسے جواہر پارے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں، تحقیق و تنقید کا میدان ہو یا شعر و شاعری کا، فکشن تخلیق کاروں کا ہو یا مترجمین کا یا کوئی اور۔ سب کی اپنی اپنی مستحکم شناخت قائم ہو چکی ہے۔ اس شعبے کے تحت گزشتہ کئی برسوں سے متواتر ایک سالانہ مجلّہ 'ارمغان' کے نام سے شائع ہو رہا ہے جس میں اردو کی مختلف اصناف سخن سے متعلق بیش بہا ذخیرے سے طلبا و طالبات اور اساتذہ کو مستفید ہونے کے مواقع ملتے ہیں۔ اس رسالے کا گزشتہ شمارہ ایک خصوصی شمارہ تھا جو جامعہ کی صدی تقریبات کے موقع پر پیش کیا گیا تھا جس کا عنوان 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو خدمات' تھا۔ تازہ شمارہ 'ارمغان 9' اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ یہ شمارہ گزشتہ شمارے سے مختلف ہے، اس معنی میں کہ اس کا عنوان 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تخلیقی ادب' ہے۔ اس میں جامعہ کے تمام شعبوں میں سے صرف انھیں ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی طور تخلیقی ادب تحریر کیا ہے، وہ تخلیقی ادب خواہ شاعری کے فارم میں ہو یا فکشن کے، خاکے ہوں یا خودنوشت یا کسی اور ہیئت و صنف میں۔ اس رسالے کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں پہلا حصہ 'شاعری' کا ہے۔ اس میں اکابرین اور معاصرین شعرا میں جن کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نام بالترتیب اس طرح ہیں، شیخ الہند مولانا محمود حسن، حکیم اجمل خاں شیدا، محمد علی جوہر، اسلم جیراجپوری، عبدالمجید خواجہ شیدا، شفیع الدین نیر، سیفی پریمی، قیصر زیدی، مسعود حسین خاں، سید منیر الحسن، محمد خلیق صدیقی، تنویر احمد علوی، یوسف پاپا، محمد ذاکر، انوار علی خاں سوز، حنیف کیفی، انور صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی، سید ساجد حسین زیدی، عنوان چشتی، سطوت رسول، شمیم حنفی، چودھری عبدالمعروف خاں، نظر برنی، شیث محمد اسماعیل اعظمی، زبیر احمد فاروقی، خالد محمود، فرحت احساس، انیس الرحمٰن، سہیل احمد فاروقی، عراق رضا زیدی، شہپر رسول، عبید صدیقی، عارف نقوی، شکیل جہانگیری، ماجد دیوبندی، کوثر مظہری، عبدالنصیب خاں، محمود الحسنی، احمد محفوظ، واحد نظیر، عمران احمد عندلیب، رحمٰن مصور، فردوس عظمت صدیقی، اورنگ زیب، خالد مبشر وغیرہ۔ اس میں مذکورہ شعرا کے چنندہ کلام، سوانحی کوائف اور دستی تحریر (بخط شاعر/ادیب) کو بطور نمونہ شامل کر کے ایک دستاویز کی شکل عطا کی گئی ہے۔

اس رسالے کا دوسرا حصہ 'ناول' پر مشتمل ہے جس میں جامعہ سے تعلق رکھنے والے تین منفرد ناول نگاروں میں گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر کے ناول 'گردش رنگ چمن' سے (سرخ پٹاری)، غضنفر کے ناول 'دویہ بانی' سے ایک باب اور صاحب اسلوب فکشن نگار خالد جاوید کے ناول 'نعمت خانہ' سے کچھ حصے بطور نمونہ شامل کیے گئے ہیں تاکہ ان کی قرأت سے ان کے تخلیقی وفور، لب و لہجہ، ڈکشن، ہیئت و تکنیک اور بیانیہ کی سطح پر ان کی انفرادیت کو نمایاں کیا جا سکے۔ رسالے کا تیسرا حصہ 'افسانے' کے عنوان سے ہے۔ اس میں جن افسانہ نگاروں کے افسانوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں پریم چند کا مشہور افسانہ 'کفن' ذاکر حسین کا 'اندھا گھوڑا' عبدالواحد سندھی کا 'مچھیرا اور اس کی بیوی' سعید انصاری کا 'بھولا ہوا بچہ' صغرا مہدی کا 'چوتھا کھونٹ' راز صابری کا 'خواب کی تعبیر' اوصاف احمد کا 'جال' ہاجرہ شکور کا 'برزخ' شمس الحق عثمانی کا 'وہ ایک' نشاط قیصر کا 'باہر کا کمرہ' غیاث الرحمٰن کا 'اس پار' رخشندہ روحی مہدی کا 'پی پی مدرس ڈے' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس حصے میں مذکورہ افسانہ نگاروں کے افسانوں، ان کے سوانحی کوائف اور دستی تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ سارے افسانہ نگار وہ ہیں جن کا تعلق جامعہ کے مختلف شعبوں سے رہا ہے ان تخلیق کاروں کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ جامعہ میں کیسے کیسے انمول ہیرے ہیں جنھیں اپنے پارکھی کی تلاش تھی۔ یہاں ہر ذرہ ایک آفتاب کی مانند ہے جو اپنی چمک سے سارے جہان کو روشن کرنے کا ہنر جانتا ہے۔

رسالے کا چوتھا حصہ 'ڈرامے' کے نام سے ہے۔ اس میں بانیان جامعہ میں سے سید عابد حسین کا ڈرامہ 'پردۂ غفلت' اور محمد مجیب کا ڈرامہ 'حبّہ خاتون' کو شامل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورا ڈراما شامل کرنا مشکل تھا اس لیے دونوں کے منتخب مناظر شامل کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی ڈرامے اور سوانحی کوائف کے ساتھ خط ادیب کے طور پر ڈراما نگاروں کی دستی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ پانچواں حصہ 'سفرنامے' پر مشتمل ہے جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سفرنامہ 'سفر آشنا' (بہر سو رقص بسمل)، صادقہ ذکی کے سفر نامہ 'خیموں کے شہر میں' اور رضوان لطیف خان کے سفرنامہ 'چناروں کے سائے میں' (ڈل جھیل کے کنارے ایک شام) میں سے کچھ حصے شامل کیے گئے ہیں۔ ان سفرناموں کے چنندہ حصوں کے مطالعے سے سفرنامہ پڑھنے کی طرف ذہن راغب ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی ماقبل کی طرح مذکورہ سفرنامہ نگاروں کے سفرنامے ان کے سوانحی کوائف اور دستی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔

رسالے کا چھٹا حصہ 'خاکے' کے نام سے ہے۔ اس میں ظفر احمد نظامی نے جن اہم شخصیات پر خاکے تحریر کیے ہیں ان میں سے پروفیسر آل احمد سرور، مجروح سلطان پوری اور ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے نام نمایاں ہیں۔ انھیں شخصیات کے چند نمونے شامل کیے گئے ہیں جن سے ان کی شخصیت کی متنوع پہلوؤں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ساتھ ہی ظفر نظامی صاحب کے مقفّی اسلوب نگارش کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شہزاد انجم موجودہ صدر شعبہ اردو کا ڈاکٹر محمد ذکی رضوی پر لکھا گیا خاکہ شامل ہے۔ اس حصے میں بھی مذکورہ خاکہ نگاروں کے خاکوں کے ساتھ ان کے سوانحی کوائف اور دستی تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔

رسالے کا ساتواں حصہ 'خودنوشت سوانح' پر مبنی ہے۔ جس میں جامعہ کے تین اہم خودنوشت سوانح نگاروں کی خودنوشتوں کے کچھ حصے شامل کیے گیے ہیں جن میں عبد الغفار مدھولی کی 'ایک طالب علم کی کہانی' سلامت اللہ کی 'یادوں کے چراغ' بدرالدین الحافظ کی 'یادوں کی نگری' اہم ہیں۔ مذکورہ خودنوشتوں کے مطالعے سے ان کی زندگی کے مختلف نشیب وفراز، رہن سہن اور حالات زندگی کے ساتھ جامعہ کی تہذیبی و ثقافتی صورتحال کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس حصے میں مصنف کے سوانحی کوائف کا ذکر تو ہے لیکن یہاں بدرالدین الحافظ کے علاوہ دولوگوں کی دستی تحریریں دستیاب نہیں ہوسکیں۔

اس رسالے کا آخری حصہ 'جامعہ کے بانیان اور اکابرین کے تاثرات' کے نام سے ہے جس میں بانیان جامعہ اور اکابرین کے جامعہ سے متعلق تاثرات ہیں جو سند کا درجہ رکھتے ہیں، اس میں جن اہم معمار قوم اور دانشوروں کے تاثرات شامل ہیں ان میں شیخ الہند محمود حسن، حکیم اجمل خاں، ایم کے گاندھی، علامہ اقبال، پریم چند، مولانا محمد علی جوہر، مختار احمد انصاری، عبد المجید خواجہ شیدا، سید عابد حسین، ذاکر حسین اور محمد مجیب وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

اس رسالے کے مذکورہ حصوں سے قبل ابتدا میں دو اداریے شامل ہیں پہلا اس شمارے کے مدیر اعلیٰ پروفیسر شہزاد انجم کا اور دوسرا اس کے مدیر پروفیسر کوثر مظہری کا۔ ان دونوں اداریوں کے مطالعے سے اس رسالے کے ابتدائی مراحل سے اشاعت پذیر ہونے تک کے متنوع مسائل کو نہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بلکہ مستقبل کے امید افزا عزائم کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے جس کی طباعت عمدہ اور جاذب نظر ہے ہر چیز اپنی جگہ مرتب اور منظم ہے کسی طرح کی کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ امید قوی ہے کہ علمی وادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

عالمی یوم اردو یادگار مجلہ

ماہر تعلیم مولوی اسمٰعیل میرٹھی: حیات وخدمات

مجلس ادارت: ڈاکٹر شفقت اعظمی، محمد عارف اقبال

صفحات: 154، قیمت: نومبر 2020

ناشر: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا/ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن

D-49، شہید اشفاق اللہ پارک، نیو سیلم پور، دہلی 53

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

''دنیا میں جو زبانیں رائج ہیں، ان میں سے بعض بالکل متغائر ہیں۔ بعض میں ایک پوشیدہ رشتہ غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ بعض میں کھلا میل جول ہے، چنانچہ فارسی اردو قسم آخر کی مثال ہے۔ ان میں بے شمار الفاظ مشترک ہیں۔ جملے کی ترکیب کا انداز بھی تقریباً یکساں ہے۔ البتہ بعض افعال اور ان کی گردان کا طور اور بعض حروف جداگانہ ہیں۔ لہٰذا ہمارے اسکولوں کے طلبا کا جن کی مادری زبان اردو اور درسی زبان فارسی ہے، ترجمہ کی مشق کرنے سے پیشتر مقدم کام یہ ہے کہ مصادر فارسی کی فہرست با معنی اور افعال کی تصریف مستحضر ہو۔''

یہ الفاظ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے ہیں جو انھوں نے مبتدی طلبا کے لیے 'ترجمان فارسی' کتاب مرتب کرتے ہوئے اس کے دیباچہ میں کہے تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے طلبا کو یہ سمجھایا ہے کہ ایک تو اردو اور فارسی کا رشتہ بہت قریبی ہے، دوسرے اس کے افعال اگرچہ جدا ہیں، لیکن جملوں کی تراکیب ایک جیسی ہی ہیں۔ اس لیے فارسی یا اردو کو اپنے اوپر بوجھ نہ سمجھا جائے اور ان کو مستقل مزاجی کے ساتھ پڑھا جائے اور اسباق یاد کیے جائیں۔

پیش نظر عالمی یوم اردو مجلّہ 2020 'مولوی اسمٰعیل میرٹھی: حیات وخدمات' پر مشتمل ہے۔ یہ وہی اسمٰعیل میرٹھی ہیں، جن کی نظمیں ساٹھ ستر کی دہائی تک ہر مکتب اور اسکول کے طلبہ کو ازبر ہوتی تھیں اور وہ آتے جاتے ہوئے ان کی گردان کیا کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے بہت سے مواضعات اور قصبات میں ان کی کتابیں اردو کی پہلی کتاب سے لے کر پانچویں کتاب تک رائج ہیں اور ذوق وشوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سید احمد خاں جو یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے سکریٹری جنزل ہیں، انھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ کم وبیش پچیس برس سے ہر سال شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم پیدائش 9 نومبر کو عالمی یوم اردو مناتے آرہے ہیں اور اس موقعے پر اردو کی نامور اور قابل قدر شخصیات میں سے کسی ایک پر خصوصی شمارہ بھی شائع کرتے ہیں۔ اس مرتبہ قرعۂ فال مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے نام نکلا ہے کہ ان کی درسی اور ادبی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے، بلکہ دوسری یادگار شخصیتیں ان کے قریب بھی نہیں پہنچ سکی ہیں۔

سید قمر الحسن نے جو ایک نامور ومعتبر قلم کار ہیں، بالکل درست لکھا ہے کہ ''مولوی اسمٰعیل میرٹھی کو محکمہ تعلیم اور مختلف اسکولوں میں رہ کر انھیں بچوں کو نفسیات کی سمجھنے اور تعلیم وتربیت پر کام کرنے کا اچھا خاصا موقع ملا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بچوں کی ہی زبان میں بہت سلیس اور آسان اردو میں ابتدائی درجات سے ثانوی درجات تک کے لیے کتابیں لکھیں اور درسی کتب کا ایک ایسا مفید سلسلہ تیار کیا جس کی ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی کوئی نظیر نہیں ملتی۔''

ڈاکٹر سید احمد خان کا عالمی یوم اردو کے موقعے پر کسی ایک شخصیت پر خصوصی اشاعت کے سلسلے کی ہمیشہ پذیرائی ہوتی ہے۔ اس مجلّہ میں شامل پروفیسر شہپر رسول اور پروفیسر اختر الواسع نے بھی اپنے اپنے پیغامات میں ان کے اس اقدام کو سراہا ہے اور بہت سے اداروں کے لیے قابل تقلید بھی قرار دیا ہے۔

اردو مجلّہ کے دیگر مشمولات ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی، سید قمر الحسن، ڈاکٹر سیدہ نرجس ناظم، پروفیسر فضل اللہ قادری، پروفیسر صالحہ رشید، ڈاکٹر جمیل اختر، راشدہ حیات، نصرت شمسی، شاہ نواز، ریشا قمر، ڈاکٹر شیخ نگینوی، انجینئر محی بخش قادری وغیرہ میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی تعلیم، نصابی کتابیں، بچوں کے نفسیات داں، سرسید تحریک سے ان کی وابستگی اور اردو ادب میں اسمٰعیل میرٹھی کے مقام ومرتبہ پر پرمغز گفتگو کی ہے اور یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی ہے کہ ان کی تمام تخلیقات میں موضوعات کے انتخاب سے لے کر ان موضوعات کی شاعرانہ بنت تک سب میں بچوں کی نفسیات سے پوری واقفیت کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ ان کی مقبول ومعروف نظم 'ہماری گائے' تو ہماری نسل کے لوگوں کو آج بھی ازبر ہے:

رب کا شکر ادا کر بھائی　　　جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں　　　جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت　　　دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت

ان کی شاعری میں خیالات کی یہ روانی بچوں کی ذہنی استعداد، ان کی عمر مشاہدے اور تجربات سے ہر طرح ہم آہنگ اور مطابقت رکھنے والی ہے۔ مضمون نگاروں کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا تقاضا ہے کہ نئے سرے سے ان کی تخلیقی جہتوں پر گفتگو کے سلسلے کا آغاز کیا جانا چاہیے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ اہل علم کی توجہ کا باعث ہوگا اور ڈاکٹر سید احمد خاں کی آرگنائزیشن کی اس پیش کو ان کے سابقہ مجلوں کی طرح بہر حال سراہا جائے گا۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

مجھے بچپن سے ہی اردو سے لگاؤ رہا ہے: ڈاکٹر رنبیر سنگھ

دہلی کے چیف الیکٹورل آفیسر ڈاکٹر رنبیر سنگھ کا قومی اردو کونسل میں استقبال

نئی دهلی: علم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ اگر انسان کے اندر جذبہ اور شوق ہو تو وہ کسی بھی عمر میں علم حاصل کرسکتا ہے۔ جو لوگ مطالعے کا شوق رکھتے ہیں انھیں ایسا لطف آتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی حصے میں اسے نہیں چھوڑتے اور اس طرح ان کے

علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اردو زبان سے میرا لگاؤ بچپن سے ہی رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی کے چیف الیکٹورل آفیسر جناب ڈاکٹر رنبیر سنگھ نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ استقبالیہ پروگرام میں کیا۔ اردو سے اپنے لگاؤ کی روداد سناتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں دورانِ طالب علمی اردو کی شاعری ہندی رسم الخط میں پڑھا کرتا تھا۔ جب میں نویں کلاس میں تھا تو میں نے ہندی میں 'دیوان غالب' کا مطالعہ کیا۔ مجھے غالب کی شاعری بہت اچھی لگی۔ میں اردو سیکھنا چاہتا تھا مگر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بہت سی دفتری مصروفیات نے مجھے اس کی فرصت نہ دی۔ قریب ڈیڑھ سال قبل جب میں نے اپنے بیٹے کو موبائل پر اردو میں پڑھتے لکھتے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں نے اس سے ترغیب پاکر اردو سیکھنے کا عزم کیا اور باضابطہ اردو سیکھنے کے لیے اردو سرٹیفکٹ کورس میں داخلہ لے لیا۔ جس کے امتحان میں مجھے پہلی پوزیشن حاصل ہوئی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمان ذی وقار ڈاکٹر رنبیر سنگھ کا قومی کونسل آمد پر شکریہ ادا کیا اور ان کی خدمت میں گلدستہ پیش کرکے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر رنبیر سنگھ اردو سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں، اس کا سب سے بڑا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ باضابطہ اردو سیکھ رہے ہیں۔ وہ اردو کی شاعری کو بخوبی سمجھتے ہیں اور روانی کے ساتھ اردو بولنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے پرجوش انداز میں کہا کہ جب تک ایسی شخصیتیں اردو سے محبت کرتی رہیں گی اردو کا فروغ ہوتا رہے گا۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کا پورا اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 فروری 2021

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں عربی زبان وادب کے پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: ہندوستان تہذیبی ولسانی تنوعات سے آراستہ ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف زمانوں میں دنیا کی کئی تہذیبوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، اسی طرح اس ملک میں دنیا کی بہت سی زبانوں کوفروغ حاصل ہوا ہے۔ خود اس ملک میں سیکڑوں زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ یہی ہمارے ملک کی خوب صورتی ہے اور اسی خوب صورتی کے تحفظ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کے تحفظ و فروغ کے لیے بھی سرگرم کوششیں کررہی ہے جن کا اردو زبان سے گہرا ناطہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ عربی زبان و ادب کے پینل کی میٹنگ میں کیا۔

انھوں نے کہا کہ عربی اور فارسی زبان سے واقفیت کے بغیر اردو زبان میں مہارت حاصل نہیں کی جاسکتی اس لیے اردو کے طلبا وعلما کا عربی زبان سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے اور اسی مقصد سے کونسل کی جانب سے جہاں عربی زبان میں ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما کے کورسز کروائے جاتے ہیں وہیں عربی زبان و ادب کا باقاعدہ پینل ہے جس کے مشوروں اور رہنمائی میں عربی زبان وادب سے متعلق اہم موضوعات پر تحقیقی و تصنیفی کام بھی ہوتے ہیں اور انھیں کونسل کی جانب سے شائع بھی کیا جاتا ہے۔ میٹنگ کے دوران پینل کے ممبران نے کونسل کے زیر اہتمام عربی زبان وادب کی مکمل تاریخ اور ہندوستان میں عربی ادب کے ارتقا کی تاریخ پر زیر عمل پروجیکٹ کا جائزہ لے کر اطمینان کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کی جانب سے اردو کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے جو کوششیں اور اقدامات کیے جارہے ہیں وہ قابل تعریف ہیں اور اس سے اردو طبقے کو نہ صرف عربی زبان وادب سے آگاہی ہورہی ہے بلکہ لوگ اردو کے ساتھ عربی زبان کا بھی علم حاصل کررہے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ پروجیکٹ کا زیادہ تر حصہ مکمل ہوچکا ہے اور جلد ہی کونسل کی جانب سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس میٹنگ میں عربی زبان اور ہندوستان کے حوالے سے دیگر تحقیقی گوشوں اور موضوعات پر بھی غور وخوض کیا گیا۔ اخیر میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک) نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر نعمان خان (ڈی یو)، پروفیسر حسنین اختر (ڈی یو)، پروفیسر مسعود انور علوی (اے ایم یو)، پروفیسر رضوان الرحمٰن (جے این یو)، ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)، ڈاکٹر مشیر حسین صدیقی (لکھنؤ یونیورسٹی)، مولانا علاء الدین ندوی (دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ)، ڈاکٹر حسین پی کے مداور (روضۃ العلوم عربک کالج، کیرالہ) اور کونسل سے ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) اور محترمہ آبگینہ عارف (ٹیکنکل اسسٹنٹ) وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 فروری 2021

قومی اردو کونسل میں استقبالیہ تقریب

نئی دہلی: آج اردو زبان کی مقبولیت ومحبوبیت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہورہا ہے اور روایتی اردو علاقوں کے علاوہ نئی اردو بستیاں بھی آباد ہورہی ہیں، اس میں اردو کی اپنی خوبیوں کے علاوہ اردو کے کاز کے لیے کام کرنے والے ان اداروں اور افراد کا بھی اہم رول ہے جو ہندوستان اور بیرونی ممالک میں فروغ اردو کے لیے مختلف سرگرمیاں انجام دے رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں دوبئی میں مقیم شاعر اور بزم اردو دوبئی کے سرگرم رکن شاداب الفت اور جشن ادب کے سربراہ رنجیت چوہان کے استقبال میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے معزز مہمان شاداب الفت کا

تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ موصوف دوبئی کے شاعر، بزم اردو کے فعال رکن اور مشہور ناظم مشاعرہ ہیں۔ دوسرے مہمان رنجیت چوہان کا تعارف کراتے ہوئے شیخ عقیل نے بتایا کہ موصوف معروف ادبی تنظیم جشن ادب کے سربراہ ہیں جس کے تحت ہر سال دو بار ادبی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے ایسے ہی بے لوث خادموں کی وجہ سے آج اردو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں پھیل رہی ہے اور اردو کے کارواں میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ ہم انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب شاداب الفت نے دوبئی میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان سے باہر جو اردو کی نئی بستیاں آباد ہورہی ہیں ان میں دوبئی کو کئی اعتبار سے انفرادیت حاصل ہے۔ اردو کے نہایت عمدہ عالمی مشاعرے یہاں کی اردو آبادی کی شناخت ہیں، جن میں دنیا بھر کے عظیم شعرا شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ بزم اردو زمینی سطح پر اردو کی تعلیم وتدریس کے لیے بھی کام کررہی ہے اور فی الوقت یوپی کے سات اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا مکمل انتظام بزم اردو کے ذریعے ہی کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر شاداب الفت نے اپنے کلام سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ جشن ادب کے بانی رنجیت چوہان نے جشن ادب کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد اس ملک کی مشترکہ ادبی وثقافتی روایت کا تحفظ اور اسے نئی نسلوں تک پہنچانا ہے اور ہم اسی راہ پر مضبوطی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اس موقعے پر مختصر شعری محفل بھی جمی جس میں دونوں معزز مہمانوں نے اپنے منتخب اشعار سنائے، ان کے علاوہ جناب منیر انجم، ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، ڈاکٹر یوسف رامپوری اور جناب محمد انصر نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔ اس تقریب میں کونسل کا تمام اسٹاف شریک رہا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مارچ 2021

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو شعر و ادب اور صحافت میں سہارنپور کی خدمات

سہارنپور: چلکانہ روڈ پر واقع براؤن ووڈ پبلک اسکول سہارنپور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومتِ ہند نئی دہلی کے تعاون سے جاگروک مہیلا سنستھا ’پرچم‘ کے زیرِ اہتمام ’اردو شعر و ادب اور صحافت میں سہارنپور کی خدمات‘ پر ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے سابق ایڈیٹر اسد رضا نے کی۔ انھوں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ سہارنپور نے ہر دور میں زندگی کے مختلف

شعبوں میں نمایاں ہستیوں نے اپنے علم و ہنر سے اس سرزمین کا نام قومی سطح پر روشن کیا جس سے اردو ادب اور صحافت بھی اچھوتی نہیں ہے۔ گزشتہ ایک صدی سے سہارنپور کے شعرا، ادبا اور صحافی اپنی بے مثال خدمات انجام دیتے آرہے ہیں جن میں ظ انصاری، واصف عابدی، نصرت ظہیر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ وقت میں ڈاکٹر شاہد زبیری اور شبیر شاد قومی سطح کے اخبارات میں اردو صحافت کی بے مثال خدمات انجام دے رہے ہیں نیز یہاں کے شعرا بھی آل انڈیا مشاعروں میں سہارنپور کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ براؤن ووڈ اسکول کی ڈائریکٹر محترمہ سیدہ صفیہ صبوحی نے شمع روشن کرکے سمینار کا آغاز کیا۔ سمینار تین حصوں پر مشتمل رہا، پہلا حصہ شاعری کے لیے مختص تھا جس میں طلعت سروہا نے سہارنپور کے شاعروں کا مشہور کلام پیش کیا۔ ارشد قریشی نے شاعر سردار انور پر اپنا مقالہ ’آزاد ہے اپنے فکر و عمل‘ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ شاعر سردار انور ادیب، ڈراما نگار مترجم اور غزل گو شاعر ہیں۔ پروفیسر مشرف خطیب نے شاعر الیاس نشتر پر اپنا مقالہ ’بجتی نہیں اشکوں کی میری دیدہ تر سے‘ پیش کیا۔ پروفیسر جلال عمر نے سادھو رام آرزو، ڈاکٹر جمیل مانوی نے استاد شاعر شوق مانوی پر اپنے مقالے پیش کیے اور نامور شاعر افضل منگلوری نے سہارنپور کے شاعروں کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے اپنا مقالہ پیش کیا اور پرانے اور نئے دور کے شعرا بدھ پرکاش جوہر، انور تاباں، ظہور احمد ظہور، ارم عمر پوری، ماسٹر زندہ حسن، خواجہ سلطان انجم، ریاض حیدر، امام اکمل، ہارون صابری، بلال، فیاض ندیم، ڈاکٹر جاوید جمیل، آصف شمسی کے چنندہ اشعار سنائے۔

دوسرے دور میں مقالہ نگاروں نے اردو صحافت میں سہارنپور کی خدمات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ اسکالر نصرت پروین نے سہارنپور کے دو نامور صحافیوں ڈاکٹر شاہد زبیری اور شبیر شاد پر مقالہ پیش کیا۔ تیسرے اور آخری دور میں سہارنپور اور اطراف سہارنپور پر مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ شاہد زبیری نے مقالہ ’بے باک اخبار کے بے باک مدیر مولانا زکریا اسعدی‘، سید وجاہت شاہ نے دارالعلوم دیوبند میں دیواری پرچوں کی تاریخ اور محترمہ رخشندہ روحی مہدی نے ’سرزمین دیوبند کی پہلی فکشن خاتون محترمہ حاجرہ نازلی‘ اور ارم عثمانی نے سہارنپور کی مشہور افسانہ نگار صفیہ سلطانہ پر مقالے پیش کیے۔ مہمانِ ذی وقار سیدہ تبسم حیدر ناڈکر نے کہا کہ سہارنپور کی سرزمین اردو ادب کے لیے ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے۔ اس سرزمین نے عالمی سطح پر صحافت، ادب اور شاعری کے میدان میں نامور شخصیات پیدا کیں اور اس سرزمین سے بڑی تعداد میں لوگ فلمی دنیا سے بھی وابستہ ہوئے جہاں انھوں نے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ آخر میں سمینار کے چیف گیسٹ حاجی فضل الرحمن ایم پی نے کہا کہ اردو زبان جنگِ آزادی کی تحریک میں ایک کارگر ہتھیار ثابت ہوئی تھی اور آج بھی یہ زبان سبھی کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے، اسی وجہ سے اس زبان سے بلا تفریق لوگ وابستہ ہوئے۔ نظامت کے فرائض سمینار کی کنوینر ڈاکٹر قدسیہ انجم نے انجام دیے، انھوں نے کہا کہ طویل مدت سے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ قومی سطح پر ایک بار پھر سے سہارنپور کی ادبی تاریخ سے نسلِ نو کو متعارف کرایا جائے۔ اسی بنیاد پر آج کے سمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔ طالب علم شعیب اور آسیہ نے غزل پڑھ کر سنائی۔ سید رونق علی ایڈووکیٹ نے ڈائریکٹر قومی اردو کونسل کا پیغام پڑھ کر سنایا۔

شرکا میں بڑی تعداد میں محبان اردو طالب علم، وکلا، ادیب، ڈاکٹر اور نمایاں شخصیات میں مسز آمنہ قاضی سلطان اختر، مسز فاطمہ، ندیم اختر، بابر وسیم، ڈاکٹر ایوب، انیس ایڈووکیٹ، تنظیم معین، فرزانہ شیخ، عظمیٰ شمسی، تسنیم قریشی، طاہر شمسی، کریم بانو، عبدالسلام، ماسٹر شعیب وغیرہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: قدسیہ انجم، یوپی، 14 فروری 2021

میر سعادت علی: حیات و خدمات

امروہہ: انڈین کلچرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک سمینار بعنوان ’میر سعادت علی حیات و خدمات‘ زہرا چلڈرن ہوم اسکول محلہ چھیوڑہ میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت مولانا سید محمد سیادت نقوی نے کی۔

افتتاح سید حسن ضیا ایڈیٹر ماہنامہ آجکل نئی دہلی کے ذریعے ہوا۔ محفل کا آغاز محمد عباس نے نعت پاک پڑھ کر کیا جس کے بعد مقالہ نگار حضرات نے میر سعادت علی پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ماہنامہ آجکل کے ایڈیٹر حسن ضیا نے کہا کہ ہماری ادبی تاریخ میں سعادت امروہوی کی پہچان میر کے حوالے سے ہی ہے۔ ریحانہ پروین نے کہا کہ

سعادت علی درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھیں دنیا کے ساز و سامان سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ آپ کا مشہور مرثیہ سواری امیر المومنین کی کافی مشہور ہوا۔ ڈاکٹر محمد طارق فراز نے کہا کہ سعادت علی سعادت اپنے وقت کے بہت مقبول اور استاد شاعر تھے۔ افضال احمد نے پروفیسر منظر عباس کا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے میر تقی میر کو میر سعادت کا شاگرد بتایا ہے۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کہا کہ سرزمین امروہہ کے اس نامور سپوت کو اہل دانش و بینش میر سعادت علی سعادت امروہوی کے نام سے جانتے ہیں۔ ڈاکٹر مجاہد فراز نے کہا کہ میر سعادت علی سرزمین امروہہ کے ایک معروف مستند سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ صدارت فرمارہے مولانا سید محمد سیادت نقوی نے بھی میر سعادت کے فن پر تفصیلی گفتگو کی۔ اس موقعے پر میکش امروہوی کی تصنیف 18 نکات والی کا اجرا بھی کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 فروری 2021

امیر خسرو کی اردو خدمات

جھانسی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور کلام ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے اشتراک سے راجکیہ سنگر ہالہ کے مرکزی ہال میں 'اردو کے فروغ میں امیر خسرو کی خدمات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ' پر قومی سمینار کا انعقاد ہوا۔ مہمان خصوصی کے طور پر شری ہر گوبند کشواہا وزیر اتر پردیش اور ڈاکٹر کنچن جیسوال، سی یو نعیم خان منصوری ریلوے پولیس جھانسی، عمران، نندلال ضلع ڈی پی او، جھانسی، چتر گپت سریواستو ٹورزم ادھیکاری شریک ہوئے۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ مہمان خصوصی کے ہاتھوں شمع روشن کی گئی اور منتظمین نے پھولوں کا گلدستہ دے کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس کے بعد رفیع ناز کی نعت کے بعد ڈاکٹر مامون عبدالعزیز، ڈاکٹر زاہد احسن، ڈاکٹر علیم الدین، محمد نعمان خان، وقار صدیقی اور زینب فاروقی نے مقالات پیش کیے۔ اس کے بعد مہمانوں نے امیر خسرو کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں دہلی اقلیتی کمیشن کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر شکیل احمد نے این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ بعد میں ایک مشاعرے کا بھی انعقاد ہوا جس میں ملک کے مشہور و معروف شعرا ماہر نظامی، عمران عثمان اشک، نسیم ظفر، ظفر سرفراز، معصوم عبدالجبار، متین کاندھلوی، جاوید انور، ڈاکٹر زاہد احسن، ارسلان انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں شیخ ارشد نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کی خدمت میں مومنٹو پیش کیے۔ کلمات تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 فروری 2021

اردو میں معلوماتی ادب کا فروغ

تلنگانہ / حیدر آباد: ٹکنالوجی نے ہمیں بااختیار بناتے ہوئے ساری انسانیت کو مساوی کردیا ہے۔ اب ہمارا معاشرہ ایک اطلاعاتی معاشرہ بن چکا ہے اور اطلاعات و معلومات اس کی بنیادی ضرورت ہیں۔ چنانچہ معلوماتی ادب کی تخلیق وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز (ڈی ٹی پی)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے اردو میں معلوماتی ادب پر منعقدہ دو روزہ آن لائن سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کل آن لائن کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر شافع قدوائی، صدر شعبہ ماس کمیونی کیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ معلوماتی ادب دراصل اطلاع رسانی اور ذہن سازی کا ایک ذریعہ ہے۔ اس میں نصابی کتب، وضاحتی کتب اور فرہنگیں شامل ہوتی ہیں۔ اس کا مواد اعداد و شمار اور حوالے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ مبنی بر موضوع ہوتا ہے، اس کا ترجمہ آسان ہوتا ہے لیکن مصنف کے لیے موضوع پر عبور لازمی ہے۔ یہ سمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے کیا گیا۔ سمینار سے بہ حیثیت مہمان خصوصی آن لائن خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شہ میری، وائس چانسلر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول نے تخلیقی ادب اور معلوماتی ادب کا تقابل کیا اور دوران ترجمہ اصطلاح کو جوں کا توں استعمال کرنے کی صلاح دی۔ ساتھ ہی انھوں نے اردو میڈیم طلبہ کو درپیش مسائل کا ذکر کیا اور کہا کہ ذولسانی تدریس یعنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی میں تدریس اس کا ایک حل ہے۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ وائس چانسلر انچارج، مانو نے معلوماتی ادب کو اردو میں لازمی قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کی ترویج اردو طبقہ کے فروغ کے لیے ضروری ہے اور اس سے اردو زبان مزید ثروت مند ہوگی تاہم اس بات کا بھی ذکر کیا کہ اردو میں معلوماتی ادب تخلیق کرنے کے اہل لوگ کم ہیں۔ انھوں نے معلوماتی ادب کی تیاری میں نظامت ترجمہ و اشاعت (ڈی ٹی پی) مانو کی کاوشوں کو سراہا۔ پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈائرکٹر، ڈی ٹی پی نے سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ جب ڈی ٹی پی نے معلوماتی ادب کے ضمن میں نصابی کتابیں اور دیگر علمی کتب شائع کرنے کی کوشش کی تو اسے کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور طے پایا کہ ان مسائل کے حل کی تلاش کے لیے مختلف ماہرین کی آرا حاصل کی جائیں اور اسی مقصد کے تحت یہ سمینار منعقد کیا جارہا ہے۔ اجلاس کا آغاز جناب شیخ دیدار اللہ، کارکن، ڈی ٹی پی کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ کنوینر، ڈاکٹر اسلم پرویز نے سمینار کے موضوع کی اہمیت و افادیت سے واقف کرایا اور افتتاحی اجلاس کی نظامت کی۔ پروفیسر محمد ظفرالدین نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 فروری 2021

جدید سائنسی اور تکنیکی تعلیم بذریعہ اردو: مسائل اور حل

حیدر آباد: اردو زبان شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ سائنس و ٹکنالوجی کی بھی زبان ہے۔ یہ ایک علمی و ثقافتی زبان ہے۔ اردو زبان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوششوں کو جاری رکھنا چاہیے جس سے نئی نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے اس راہ کو آسان بنایا جاسکے۔ ان خیالات کا اظہار آندھرا پردیش کے کرنول میں واقع ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مظفر شہ میری نے اپنے کلیدی خطبے میں کیا۔ آندھرا پردیش کی پہلی اردو یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) حکومت ہند، نئی دہلی کی جانب سے دو روزہ قومی ورکشاپ بعنوان 'جدید سائنسی اور تکنیکی تعلیم بہ ذریعہ اردو مسائل اور حل' کا انعقاد عمل میں آیا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے خصوصی خطاب میں کہا کہ اردو زبان میں مختلف علوم و فنون کے باہمی روابط کو بڑھانا چاہیے جس سے ترجمہ اور اصطلاح سازی میں مدد مل سکے۔ جس طرح مذہب اور سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اسی طرح اردو زبان اور مختلف علوم و فنون میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سائنسی علوم ہمیں تجربہ و تحقیق اور مشاہدہ کے ذریعے حقائق تک براہ راست پہنچاتے ہیں۔ اسی لیے اردو میں سائنسی اور معلوماتی ادب سے متعلق نصابی مواد کو پیش کرنا ضروری ہے۔ موجودہ دور کی اہم ضرورت ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ میں سائنس کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے تاکہ وہ بھی ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھ سکیں۔ معروف ادیب اور کئی سائنسی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر عابد معز نے اس ورکشاپ میں خطاب کرتے ہوئے کہا

کہ مادری زبان عطیہ خداوندی ہے۔جس طرح ہم اپنے والدین کی عزت وتعظیم کرتے ہیں، اسی طرح فخر کے ساتھ ہم اپنی مادری زبان سے تعلق کا اظہار کریں۔ ڈاکٹر شفیع اخلاص نے اس دوروزہ ورکشاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اردو زبان کو جدید سماجی، ثقافتی، سائنسی علوم اور ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں ان علوم میں نصاب کی تیاری اور اس کے مسائل کے حل کو پیش کرنا بھی اس ورکشاپ کا مقصد ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول کے رجسٹرار ڈاکٹر بی سری نواسلو نے اپنی افتتاحی تقریر میں تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کا قیام سنہ 2016 میں ریاستی حکومت کی سرپرستی میں عمل میں آیا جس کا مقصد اردو تہذیب کا تحفظ اور اس کا فروغ ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ غیر اردو طبقہ میں اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے ایک ڈپلومہ کورس کرایا جارہا ہے۔ یہاں فی الوقت 256 سے زائد طلبا وطالبات زیر تعلیم ہیں جنھیں بہترین اساتذہ، معقول انتظامات اور سازگار ماحول میں تعلیم دی جارہی ہے۔دو روزہ ورکشاپ میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شعبہ ترجمہ کے ڈائرکٹر پروفیسر ظفرالدین، ماہر تعلیم فاروق طاہر، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر سید سلطان محی الدین حسینی، خالد قیصری، ڈاکٹر امین اللہ، ڈاکٹر نثار احمد (ایس وی یونیورسٹی، تروپتی)، ڈاکٹر امان اللہ (چینائی)، ڈاکٹر نجی اللہ (مانو) وغیرہ نے شرکت کی اور بیشتر موضوعات پر اپنے علمی وتحقیقی مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 فروری 2021

اخترالایمان: فن اور شخصیت

چاندپور: الیاس انجم چیریٹیبل ٹرسٹ چاندپور و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے 'اخترالایمان فن اور شخصیت' کے عنوان کے تحت ایک سیمینار اسکائی لائن

انسٹی ٹیوٹ چاندپور میں منعقد ہوا۔سیمینار کی صدارت معروف نقاد، افسانہ وناول نگار ایس فضیلت خاں رامپور نے کی، نظامت کے فرائض مسلم کالج مرادآباد کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر رباب انجم نے بحسن وخوبی انجام دیے۔سیمینار کا افتتاح چاندپور نگر پالکا پریشد کے چیرمین محمد الیاس انصاری نے کیا۔مہمان خصوصی مہدی حسن نقوی اور ڈاکٹر زینت انصاری تو یڈار ہے۔سیمینار میں متعدد اسکالرز نے مقالات پیش کیے۔ ندیم راعی مرادآبادی نے اپنے مفصل مقالے میں کہا کہ اخترالایمان نظم کے ایک منفرد ونمائندہ شاعر ہیں۔انھوں نے کبھی بھی غزل کی طرف توجہ نہیں کی۔ان کا ماننا تھا کہ غزل کے پاس اردو شاعری کو دینے کی لیے کچھ نہیں ہے بلکہ اس نے نئی فکر کے دروازے بند کر دیے۔مہمان خصوصی سید مہدی حسن نقوی نے کہا کہ اخترالایمان نے شعری اصناف کے پہلو بہ پہلو نثری صنفوں میں بھی اپنی تخلیقی ذہانت کا اظہار کیا ہے، خاص طور سے افسانے میں وہ اپنے جمالیاتی مزاج کی تنقید وترسیل کرتے رہے ہیں گرچہ بعد میں ان کی پوری توجہ شاعری پر مرکوز ہوکر رہ گئی۔صدر سیمینار ایس فضیلت خاں نے کہا کہ اخترالایمان کا نام بحیثیت نظم گو شاعر کے محتاج تعارف نہیں ہے۔ بحیثیت اسکرپٹ رائٹر مکالمہ نگار ودیگر فلمی مصروفیات کے حوالے سے بھی اردو کے قارئین انھیں بخوبی جانتے پہچانتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحی دربھنگا (بہار) نے کہا کہ اخترالایمان ایک بہترین شاعر اور بہترین افسانہ نگار بھی تھے۔ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کہا کہ اخترالایمان، ضلع بجنور کے متوسط خانوادے کے چشم وچراغ تھے، مدرسے سے تعلیم حاصل کی اور تلاش روزگار میں ممبئی چلے گئے، جہاں پروڈیوسر بی آر چوپڑہ کے یہاں اسٹوری ڈپارٹمنٹ میں نوکری کرلی اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ ڈاکٹر زینت انصاری نے کہا کہ اردو شاعری میں اخترالایمان نے ایک اعلی مقام حاصل کیا آپ کی معروف نظمیں ایک لڑکا، یادیں، دستک، ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر، فکر واسلوب کے اعلی نمونے ہیں۔الیاس انجم نے کہا کہ اخترالایمان نے تقریباً سو فلموں کے ڈائیلاگ لکھے جن میں قانون، وقت، دور کی آواز، داغ، دھرم پتر، میرا سایا قابل ذکر ہیں۔ دھرم پتر اور وقت کے بہترین ڈائیلاگ کے لیے آپ کو فلمی فیئر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ڈاکرزین العابدین نے اپنے مقالے میں اخترالایمان کی معروف نظم: ایک لڑکا: پر مفصل تبصرہ کیا۔ڈاکٹر وسیم اکرم نے کہا کہ اخترالایمان اچھے شاعر اور مکالمہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کے علاوہ روبینہ رحمان راعی، شاہین قمر، اسلم احمد، فیصل شاہ خاں اور تنویر شمسی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تنظیم کی جانب سے فہد انجم اور شاداب انجم نے شکریہ ادا کیا اور مقالہ نگاروں کو نشان یادگار اور مہمانان کو ایم سمیع احمد ایوارڈ سے نوازا۔

رپورٹ: فہد انجم، سکریٹری، الیاس انجم چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، 15 فروری 2021

اردو کے فروغ میں میڈیا کی خدمات

کٹیہار: اردو زبان کے فروغ اور نشو ونما میں میڈیا کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انور ایرج، صدر شعبۂ اردو ڈی ایس کالج کٹیہار نے کہا کہ میڈیا کی اردو خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات انھوں نے مشن آف ہیومن ڈیولپمنٹ اور ڈی ایس کالج کٹیہار کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے 'اردو کے فروغ میں میڈیا کی خدمات' کے موضوع پر قومی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔انھوں نے کہا کہ میڈیا نے صرف سماجی خدمات ہی انجام نہیں دیں ہیں بلکہ زبان کو سینچا اور سنوارا بھی ہے۔مہمان ذی وقار سابق وزیر تعلیم حکومت بہار، ڈاکٹر رام پرکاش مہتو نے کہا کہ اردو اور ہندی کے درمیان لاکھ کوئی خلیج پیدا کرے، تاہم اردو اور ہندی کے درمیان ایک تہذیبی رشتہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔ افتتاحی نشست کے صدر اور ڈی ایس کالج کے پرنسپل سی پی ایل داس نے کہا کہ ہندی میڈیا بھی زبان میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے اردو کا سہارا لے رہا ہے۔مہمان اعزازی ڈاکٹر غازی شارق احمد نے اردو کی تاریخ، میڈیا اور اردو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بنیادی کام اردو رسم الخط کا فروغ ہے۔ پورنیہ یونیورسٹی ٹیچرس یونین کے جنرل سکریٹری پروفیسر پی کے اوجھا نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں کو مضبوط ہونا ضروری ہے، تاکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا سکیں۔سلمان عبدالصمد نے کہا کہ ہندوستان میں میڈیا یعنی ریڈیو اور فلم سے اردو کا ازلی رشتہ ہے۔ تکنیکی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر احمد حسن دانش نے کی اور ڈاکٹر عبداللطیف حیدری، احسان قاسمی، پروفیسر رفیع حیدر انجم، جناب رضی احمد تنہا، ڈاکٹر قسیم اختر، ڈاکٹر تنزیل اطہر، ڈاکٹر مسرور حیدری، ڈاکٹر مجاہد حسین، عزیز الرحمٰن، کلام اجنبی، ثاقب کلیم وغیرہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔اس موقعے پر دو کتابوں دشت

جنوں طلب: احسان قاسمی، تنقیدی زاویے: مرحوم سکندر احمد کی رسم رونمائی کی گئی۔ ساتھ ہی کے بی سی نیوز کے ڈائرکٹر جناب للت اگروال کو مین آف دی میڈیا اور دیپ انگلش اسکول کے ریحان رضا کی خدمت میں ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 2 مارچ 2021

سرسید کے تعلیمی نظریات

اورنگ آباد: شہر اورنگ آباد کے ٹاؤن ہال (نگر بھون) میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی حکومت ہند کے مالی تعاون، کابا ایم ڈی ٹی پی سینٹر، ٹھٹھولی اورنگ آباد کی جانب سے اور اردو زبان سیل اورنگ آباد اور ضلع انتظامیہ اورنگ آباد کے اشتراک سے ایک شاندار فروغ اردو سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کی مشہور شخصیتوں نے حصہ لیا اور سرسید کے حوالے سے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس سمینار کی صدارت سنہا کالج اورنگ آباد کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر سید الحاج پروفیسر محمد قاسم فریدی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ضلع مجسٹریٹ اورنگ آباد سور بھ جوروال موجود تھے۔ اس سمینار کی نظامت معروف ناظم مشاعرہ یوسف جمیل نے کی جبکہ مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر صفدر امام قادری اور ڈاکٹر سید اشہد کریم موجود تھے۔ سمینار کا افتتاح ضلع مجسٹریٹ اورنگ آباد سور بھ جوروال نے کابا ایم ڈی ٹی پی کی جانب سے سید ممتاز احمد جگنو اور جاوید اقبال نے پھولوں کا گلدستہ اور شال اوڑھا کر مہمان خصوصی کا استقبال کیا۔ سمینار میں مقالہ نگاروں نے سرسید کے تعلیمی نظریات اور نظام تعلیم کے حوالے سے اپنے مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر محمد مرغوب ضیا، قدسیہ عظمت علیگ، محمد ندیم، مفتی افسر رضا قادری، سید محمد دائم، یوسف جمیل کے نام شامل تھے مگر وقت کی قلت کو دیکھتے ہوئے سمینار میں انظار حسین، ڈاکٹر سید اشہد کریم، پروفیسر صفدر امام قادری اور ڈاکٹر قاسم فریدی ہی اپنے مقالے پیش کر سکے۔ سید اشہد کریم نے کہا کہ سرسید کی ہمہ جہت شخصیت ایسی تھی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور ہمیں چاہیے کہ سرسید کو غور سے پڑھیں سمجھیں۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنا انتہائی جامع مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید ایسی شخصیت ہیں جن کے حوالے سے ہمیں روز گفتگو کرنی چاہیے۔ آخر میں ڈاکٹر پروفیسر سید قاسم فریدی نے سرسید کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جس زمانے میں بڑے بڑے زمین دار معمولی اسکول اور مدرسے کھولنے کا تصور نہیں کرتے تھے اس دور میں سرسید نے یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر آنے والی نسل جدید تعلیم سے آراستہ نہ ہوئی تو یہ قوم درہم برہم ہو جائے گی۔ سمینار کی صدارت کر رہے ڈاکٹر سید پروفیسر قاسم فریدی نے سید ممتاز احمد جگنو کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا اتنا عظیم الشان سمینار اور مشاعرے کا انعقاد اورنگ آباد میں ہوا اور ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی اس معیار کے سمینار اور مشاعرے یہاں منعقد ہوتے رہیں گے۔ سمینار کے بعد دوسرے سیشن میں مشاعرہ ہوا جس میں شہر کے مشہور شعرا نے اپنا کلام پیش کیا جس میں انجم آرا، آفتاب رانا، نظام قریشی قادری، اقبال اختر دل، گلفام صدیقی، شبیر حسن شبیر، ڈاکٹر اشہد کریم الفت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 مارچ 2021

آزادی کے بعد روہیل کھنڈ میں غیر افسانوی نثر

سنبھل: الحرا اسکول ریلوے اسٹیشن روڈ حاتم سرائے میں کنزئی فروغ اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے قومی سمینار بعنوان 'آزادی کے بعد روہیل کھنڈ میں غیر افسانوی نثر' کا انعقاد ہوا، اس موقعے پر معروف ادیبہ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی صاحبہ کی تصنیف 'افکار جوہر' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ سمینار کے شرکا نے ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ محترمہ ایک عرصہ سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان کی اب تک 10 تصانیف سامنے آچکی ہیں جن میں سنبھل کی علمی و ادبی شخصیات کے سوانحی حالات پر مشتمل 'میری زمین کے چاند ستارے' بھی شامل ہیں، اس کے علاوہ محترمہ سماجی میدان میں بھی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ سامانیہ گیان پرتی یوگیتا اور کنزئی فروغ اردو سوسائٹی کے بینر تلے وہ مسلسل ادبی و سماجی تقاریب کا انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ کتاب کی رسم اجرا انجام دینے والوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ فارسی سے وابستہ پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر محمد حسین جعفری سابق ڈین یونانی میڈیسن راجستھان، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، مشیر خاں ترین، یونیورسٹی آف پٹیالہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر ناشر نقوی، میر شاہ حسین عارف اور بدر جمال ساحل کے علاوہ یوسف نواب و بہت سے اساتذہ و طلبا اس موقعے پر موجود رہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 28 فروری 2021

ہندی-اردو اور ہندوستانی: موجودہ صورت حال کے تناظر میں

نئی دھلی: 'سالویشن' کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت تعلیم حکومت ہند کے مالی تعاون سے اور مولانا آزاد ہیومن ٹیرین فاؤنڈیشن کے اشتراک سے 'ہندی- اردو اور ہندوستانی: موجودہ صورت حال کے تناظر میں' کے موضوع پر پبلک لائبریری جوگا بائی چوپال جامعہ نگر اوکھلا میں یک روزہ قومی سمینار منعقد ہوا۔ سالویشن کے سکریٹری ڈاکٹر محمد انظار عالم نے اپنے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے معاشرہ میں تعلیمی اور تجارتی بیداری پیدا کرنے اور اس سے متعلق حکومت کی طرف سے ملنے والی مراعات سے استفادے اور نئی نسل کو اس طرف آگے آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا کہ ہم نوکری کرنے کے بجائے نوکری دینے والے بنیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فیضیاب ہوں۔ کلیدی خطبہ پروفیسر مولا بخش شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندی پر معروضی گفتگو نہیں ہوئی اور نہ ہی اردو ہندی سے الگ ہے۔ زبان سے محبت تہذیب سے محبت کے مترادف ہے۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر مظہر محمود سابق آئی بی پی ایس آفیسر دور درشن نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ زبان کی اصل حقیقت دو تہذیبوں کے درمیان کمیونی کیشن کی ہے۔ سالویشن کے صدر عبدالباقی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس سمینار میں ڈاکٹر جسیم الدین، ڈاکٹر محمد امجد، ڈاکٹر علاؤ الدین خان، ڈاکٹر آدم، اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر نوشاد منظر اور ڈاکٹر محمد مرتضی نے 'ہندی، اردو اور ہندوستانی: موجودہ صورت حال کے تناظر میں' اپنے مقالات پیش کیے، جب کہ نظامت ڈاکٹر محمد آدم نے بحسن وخوبی انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مارچ 2021

عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ اور روزگار کے مواقع

نئی دھلی: سماجی، تعلیمی اور فلاحی تنظیم فیتھ فاؤنڈیشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، دہلی کے مالی تعاون سے ایک روزہ سمینار بعنوان 'عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ اور روزگار کے مواقع' کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کا آغاز عبدالباری قاسمی کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد مرتضی نے شرکا کا استقبال گلدستے

سے کیا۔ سیمینار کا افتتاح سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر توقیر احمد خاں نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ یہ زمانہ ماس میڈیا کا ہے۔ حکومتیں اس کے ذریعے اپنی کامیابی کے مراحل طے کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے صحافت کی اہمیت وافادیت اور روزگار کے مواقع پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر مولا بخش نے کی۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے نہایت عمدگی سے ادا کیے۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر زبیر شاداب نے کی۔ ذاکر حسین نے اخبار کی تاریخ تحقیقی شواہد کے ساتھ پیش کی، ڈاکٹر علاؤالدین خان نے ترسیل کی تاریخ اور میڈیا میں روزگار کے مواقع کو بہت عمدہ اسلوب میں پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد امجد نے ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور اردو میں روزگار کے مواقع پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔ ریسرچ اسکالر عظمت النسا نے سوشل میڈیا اور روزگار کے مواقع پر تفصیلی اور نہایت وقیع مقالہ پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر محمد مرتضیٰ کی تحقیق پر نایاب کتاب 'اردو ادب تحقیق و تنقید' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس سیمینار میں فیتھ فاؤنڈیشن کی سکریٹری پروین صاحبہ کے علاوہ بڑی تعداد میں اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور اردو کے پرستاروں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 مارچ 2021

اردو میں سکھ نثر نگاروں کی ادبی خدمات

مالیرکوٹلہ: سوکر کوچنگ سینٹر اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، مالیرکوٹلہ (پنجاب) کی جانب سے یک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'اردو میں سکھ نثر نگاروں کی ادبی خدمات' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے بمقام آبان پبلک اسکول، آبان روڈ، بیرون مانا پھاٹک، مالیرکوٹلہ میں منعقد کیا گیا۔ اس یک روزہ قومی سیمینار کی صدارت

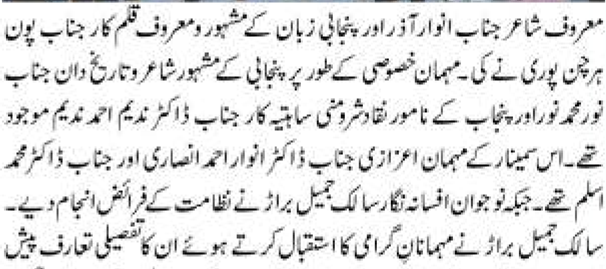

معروف شاعر جناب انوار آذر اور پنجابی زبان کے مشہور ومعروف قلم کار جناب پون ہرچن پوری نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پنجابی کے مشہور شاعر و تاریخ دان جناب نور محمد نور اور پنجاب کے نامور نقاد شرومنی ساہتیہ کار جناب ڈاکٹر ندیم احمد ندیم موجود تھے۔ اس سیمینار کے مہمان اعزازی جناب ڈاکٹر انوار احمد انصاری اور جناب ڈاکٹر محمد اسلم تھے۔ جبکہ نوجوان افسانہ نگار سالک جمیل براڑ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سالک جمیل براڑ نے مہمانانِ گرامی کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ تلاوتِ قرآن پاک کے بعد محمد اقبال، اختر شاد، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر سالک جمیل براڑ اور ڈاکٹر ندیم احمد ندیم نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر جناب نور محمد نور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں پنجابیوں کا گراں قدر حصہ ہے جس کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جناب ڈاکٹر ندیم احمد ندیم نے کہا کہ ضرورت ہے کہ پنجاب کے سکھ قلم کاروں کا ادبی سرمایہ محفوظ کیا جائے۔ استاد شاعر انوار آذر نے کہا کہ نئی نسل کو دیکھ کر مجھے اس بات کی تسلی ہے کہ ابھی پنجاب میں اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ جناب پون ہرچن پوری نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اس سیمینار کا عنوان واقعی قابل تعریف ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اردو کسی ایک دھرم کی زبان نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ اختتام پر ناظم سیمینار نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مالیرکوٹلہ کے عوام نے ہمیشہ کی طرح آج بھی یہاں تشریف لا کر اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیا ہے۔

پریس ریلیز: سالک جمیل براڑ، اسسٹنٹ پروفیسر دیش بھگت یونیورسٹی، پنجاب، 1 مارچ 2021

ویبینار اور ویب کانفرنس کے ذریعے فروغ اردو کے امکانات

نئی دہلی: کورونا اور لاک ڈاؤن نے جہاں مشکلیں پیدا کیں، وہیں اس نے لوگوں کو آن لائن ہونے کی عادت بھی ڈال دی۔ میٹنگیں ہی آن لائن نہیں ہوئیں بلکہ بچوں کی تعلیم بھی آن لائن ہونے لگی۔ خواہ کورونا چلا جائے مگر آن لائن کا سلسلہ آگے بھی چلے گا۔ ایسے میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لیے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ ویبینار اور ویب کانفرنسنگ کے ذریعے 'فروغ اردو کے امکانات' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں بیشتر مقررین اور مقالہ نگاروں نے اس حقیقت کا اظہار کیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ لاک ڈاؤن کے بعد سے اردو زبان کے سیمناروں اور مشاعروں کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ وہ خود بھی ایسے پروگراموں کا حصہ بنے ہیں، جبکہ پروفیسر دانش اقبال نے ٹکنالوجی کے فوائد کو قبول کرتے ہوئے اس کے سائڈ ایفکٹ کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی۔ ہوٹل ریورویو، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی میں منعقدہ پروگرام میں خاص کشش کا مرکز تھا۔ اداکار ابھینو کانت چترویدی نے اردو زبان سے اپنے لگاؤ کا ذکر کرنے کے علاوہ امیر خسرو کی غزلیں بھی پڑھیں۔ دیگر اہم شرکا میں ڈاکٹر ضیاء الدین، پروفیسر وقار احمد صدیقی، ڈاکٹر اسامہ اکرم، ڈاکٹر عاشق الٰہی شامل تھے۔ مقالہ نگاروں میں سینئر صحافی سہیل انجم، میرا وطن ڈیلی کے نیوز ایڈیٹر مظہر حسنین، روزنامہ ہندوستان ایکسپریس کے ظفر انور، ڈاکٹر واثق الخیر اور غوث سیوانی شامل تھے۔ تھیٹر کی معروف شخصیت ڈاکٹر ایم سعید عالم کے اختتامی کلمات کے ساتھ سیمینار اختتام کو پہنچا۔ سیمینار کا انعقاد سوشل پرائڈ ویلفیئر سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے اشتراک سے کیا گیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 فروری 2021

عالمی ادبیات کے اردو تراجم

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون اور آل انڈیا ہیومن فاؤنڈیشن دہلی و تسخیر فاؤنڈیشن کے اشتراک سے جماعت اسلامی کیمپس میں یک روزہ قومی سیمینار 'عالمی ادبیات کے اردو تراجم: مسائل و امکانات' کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر جاوید حسن، مولانا حفظ الرحمٰن قاسمی، شہاب الدین قاسمی، سلمان عبدالصمد، ابوالدردا ندوی، فرقان عالم، وسیم احمد نعیمی، فیصل نذیر اور محمد نجم الدین وغیرہ نے اپنے مقالات پیش کیے اور اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر خان محمد رضوان نے کی۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور ناقد اور کالم نگار ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ دنیا میں تقریباً آٹھ ہزار زبانوں کے وجود کی خبر ملتی ہے۔ کم از کم سو زبانوں کی فہرست بنانی ہی چاہیے جنھیں ہم عالمی ادبیات کی اصطلاح کی تفصیل کے طور پر پہچان سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دیگر عالمی زبانوں سے اردو میں ترجمے کی ایک مستحکم روایت رہی ہے، تاہم موجودہ عہد میں ترجمے کی روایت پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ خود ہندوستان میں تقریباً دو درجن زبانیں ایسی ہیں جن کے ادبی میلانات سے اردو کے طالب علموں کو استفادہ کرنا چاہیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر واحد نظیر نے کہا کہ حقائق کا ترجمہ قدرے آسان ہے، تاہم تہذیبی سروکار اور اندرون کے معاملات کو منتقل کرنا بہت مشکل امر ہے، کامیاب مترجم وہی

ہوسکتا ہے جو کسی نہ کسی سطح پر جذبات کی ترجمانی کرسکے۔ پروگرام کے کنوینر فیض الاسلام فیضی نے کہا کہ گلوبلائزیشن کے عہد میں ترجمے کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ اس سمینار میں دستخیر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری گلاب ربانی، شہور صحافی وسیم احمد، ڈاکٹر ذاکر فیضی، نذر الاسلام، مظہر حسین، محمد طاہر کے علاوہ کثیر تعداد میں علم دوست افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 فروری 2021

اردو زبان کے تہذیبی و ثقافتی ادارے

حیدرآباد: قوالی، مشاعرہ، مرثیہ خوانی، غزل گائیکی، داستان گوئی اور ڈراما و فلمیں ایسے مختلف تہذیبی و ثقافتی ادارے ہیں جنھوں نے اردو کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے، ان میں اہم ترین کردار ہندوستانی فلموں اور مشاعروں نے ادا کیا ہے۔ سنٹر فار اردو کلچر اسٹڈیم (سی یو سی ایس)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے 'اردو زبان کے تہذیبی و ثقافتی ادارے' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ سمینار کے پہلے اجلاس میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر حبیب نثار، شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقدہ دو روزہ آن لائن سمینار کا اختتام عمل میں آیا۔ اجلاس کے شریک صدر پروفیسر فاروق بخشی، شعبہ اردو، مانو نے تمام مقالوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور مقالہ نگاروں کو اپنے زریں مشوروں سے نوازا۔ پروفیسر ابن کنول، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے کہا کہ انسانی زندگی کی طرح ادب بھی طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک وہ جو خاص طبقہ میں پڑھا جاتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو لوگوں کے دلوں میں پروان چڑھتا ہے۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر احمد محفوظ (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر راشد انور راشد (اے ایم یو)، ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر رضوان الحق (این سی ای آر ٹی نئی دہلی)، (ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (ممبئی یونیورسٹی)، ڈاکٹر ثمینہ بیگم (عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ مولانا آزاد یونیورسٹی سے پروفیسر نجسیم الدین فریس، ڈاکٹر شمس الہدیٰ، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون اور ڈاکٹر احمد خان نے مقالے پڑھے۔ سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدر پروفیسر فاطمہ بیگم، سابق صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ اردو غزل کی مقبولیت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آج بھی دنیا بھر میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو اردو نہ جاننے کے باوجود اپنی گاڑیوں میں اردو غزلیں رکھتے ہیں اور انھیں سنتے ہیں اور اس عمل میں ہندوستانی فلموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ فلمیں بہت سارے لوگوں کے اردو سیکھنے کی وجہ بھی بن رہی ہیں۔ پروفیسر انور پاشا (جے این یو)، اس اجلاس کے شریک صدر تھے۔ پروفیسر محمد ظفرالدین نے عمدہ مقالات کی پیش کشی کے لیے مقالہ نگاروں کو مبارکباد دی۔ اجلاس دوم میں پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی (اے ایم یو)، پروفیسر آفتاب احمد (بی ایچ یو)، ڈاکٹر ابوبکر عباد (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر زبیر شاداب خان (اے ایم یو)، ڈاکٹر لئیق رضوی (عالمی سہارا نیوز چینل) ڈاکٹر ایس ایم اظہر عالم (مولانا آزاد کالج ویسٹ بنگال)، ڈاکٹر فرحت شمیم (جموں یونیورسٹی)، ڈاکٹر شاذیہ عمیر (دہلی یونیورسٹی) اور مولانا آزاد یونیورسٹی سے پروفیسر فاروق بخشی، ڈاکٹر سید محمود کاظمی، ڈاکٹر فیروز عالم اور ڈاکٹر ابوشہیم خان نے بھی اپنے مقالے پڑھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 18 فروری 2021

ادب اطفال

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں ادب اطفال کے ایک سمینار میں خواتین کو اختیارات کی تفویض اور بچوں کے حقوق کے تحفظ میں رضا کار تنظیموں کے رول پر بھی سیر حاصل بحث ہوئی۔ الانصار ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ اس سمینار کے صدر مولانا آزاد یونیورسٹی (جودھپور) کے چانسلر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ معاشرے کو خوشحال اور بہتر بنانے کے لیے خواتین کا امپاورمنٹ سب سے اہم کام ہے۔ تقریب کی روح رواں اسما عرشی نے خیر مقدمی کلمات میں ادب اطفال کی آج کے عہد میں افادیت پر گفتگو کی۔ آل محمد اقبال (مقامی کونسل) نے بھی اردو میں ادب اطفال کی اہمیت پر زور دیا اور ہر گھر میں بچوں کی اردو تعلیم پر توجہ کی اپیل کی۔ کلیدی خطبہ بزرگ ادیب محمد سراج عظیم (نجمی) نے دیا جبکہ پرویز شہریار، چشمہ فاروقی نے بھی عصر حاضر میں ادب اطفال کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض شعیب رضا خان نے بخوبی انجام دیے اور شبانہ صدیقی کے شکریہ کے ساتھ تقریب اختتام کو پہنچی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 فروری 2021

علامہ اقبال: فن اور شخصیت

راجستھان: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون اور شعبہ اردو فارسی سیوا سدن کالج، برہانپور و اردو ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام گذشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی ایک توسیعی خطبہ 'ڈاکٹر علامہ اقبال: فن اور شخصیت' کا انعقاد 1 مارچ 2021 کو اردو ریسرچ سینٹر میں کیا گیا جس میں موہن لال سکھاڑیہ یونیورسٹی ادے پور،

راجستھان کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر حدیث انصاری نے ڈاکٹر علامہ اقبال کے فن اور شخصیت پر تفصیلی گفتگو کی۔ اس خطبہ میں سویوا سدن ایجوکیشن سوسائٹی کی صدر محترمہ تاریکا وریندر سنگھ ٹھاکر صاحبہ، سکریٹری ہنس مکھ لال زری والا، پرنسپل انیل کاپڑیا جی، شریک رہے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر محمد الطاف انصاری نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر حدیث انصاری نے اقبال کی شاعری اور شخصیت پر بھرپور تبصرہ کیا۔ موصوف نے کہا کہ اقبال کی شاعری ہمارے لیے مشعل راہ ہے جو ہمیں انسانیت، محبت، اتحاد اور حب الوطنی کا درس دیتی ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں تاریکا سنگھ جی نے کہا کہ اقبال کا ساہتیہ ہمیں صحیح راہ دکھاتا ہے۔ وہ ہندوستانی تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔

رپورٹ: تنویر رضا برکاتی، 2 مارچ 2021

سرسید احمد خان کی تعلیمی خدمات اور عصر حاضر کی ضروریات

نئی دهلی: رائزنگ انی شی ایٹو فار آل (رفا) کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (حکومت ہند) کے اشتراک سے 'سرسید احمد خان کی تعلیمی خدمات اور عصر

حاضر کی ضروریات' عنوان سے شالیمار گارڈن نزد سیما پوری میں قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت رفا کے صدر محمد اختر خان نے کی جبکہ نظامت کے فرائض فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے فاؤنڈر جنرل سکریٹری شکیل احمد صدیقی اور ڈاکٹر مامون عبدالعزیز نے انجام دیے۔ سمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے این آئی او ایس کے جوائنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر ٹی این گری، مہمان کی حیثیت سے امبیڈکر کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ڈاکٹر دھرم ویر سنگھ اور مہمان اعزازی کے طور پر عادل ملک موجود تھے۔ سمینار کا آغاز مولانا مشتاق احمد کی قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا جس کے بعد خطبہ استقبالیہ رفا کے جنرل سکریٹری وقار احمد صدیقی نے پیش کیا۔ سمینار کے عنوان سے ڈاکٹر زاہد حسن علیگ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خان نے مسلم قوم کے تعلیمی فقدان کو دور کرنے اور مسلمانوں کو تعلیمی پستی سے نکالنے کے لیے ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو قائم کیا۔ مقالہ نگار عبدالبصیر نے کہا کہ سرسید اور علی گڑھ تحریک کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی گذشتہ 150 سال کی فکری، علمی، سماجی، مذہبی، سیاسی و ادبی تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر علی گڑھ تحریک نے بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں۔ صدارتی خطبہ محمد اختر خان نے جبکہ رفا کے کنوینر محمد نعمان خان نے سمینار میں شامل تمام مہمانان کے تئیں اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 فروری 2021

اردو میں انشاپردازی: روایت، مسائل اور امکانات

مدراس: شعبۂ عربی، فارسی و اردو مدراس یونی ورسٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کے مالی تعاون سے پلاٹنم جوبلی آڈیٹوریم میں دو روزہ قومی

اردو سمینار مورخہ 1 اور 2 مارچ 2021 کو منعقد ہوا۔ اس سمینار میں ہندوستان بھر سے تقریباً 30 مندوبین شریک رہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ایس گوری، وائس چانسلر مدراس یونی ورسٹی نے کی۔ پروفیسر قاضی حبیب احمد، صدر شعبہ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونی ورسٹی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ جناب پروفیسر مظفر علی شہ میری، وائس چانسلر، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونی ورسٹی، کرنول نے بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کہا کہ اس کی مستحکم روایت تمل ناڈو میں موجود ہے اور اس پر ایک مستقل علاحدہ مذاکرے کی ضرورت ہے۔ جناب پروفیسر نسیم الدین فریس، صدر شعبہ اردو اور ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ ولوجی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد نے اردو میں انشاپردازی کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ اردو میں انشاپردازی کی ابتدا اردو شاعری ہی سے ہوتی ہے۔ جلسہ کا آغاز حافظ محمد ابرار صاحب متعلم شعبہ اردو کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ شعبہ کے ریسرچ اسکالر جناب مولوی امجد نے موثر انداز میں 'ترانہ جامعہ مدراس' سنا کر جلسے میں ایک سماں باندھ دیا۔ جلسے کی نظامت کے فرائض سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امان اللہ نے انجام دیے اور محترمہ عائشہ صدیقہ ریسرچ اسکالر شعبہ اردو نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ایم پی امان اللہ کی کتاب 'گنجینۂ حکمت' کی رسم رونمائی بدست پروفیسر ڈاکٹر گوری، وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی عمل میں آئی۔ اسی اجلاس میں مدراس یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے جناب حسن فیاض، علیم صبا نویدی، شاہد مدراسی، محمد حنیف کاتب، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر پروین فاطمہ، اکبر زاہد، اسانغنی مشتاق رفیقی، عثمان غنی، ڈاکٹر صبا مصطفےٰ، کو ان کی خدمات کے اعتراف میں اعزاز پیش کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات کے پہلے سیشن کا آغاز ہوا۔ پروفیسر پروین فاطمہ نے صدارت کی، ڈاکٹر محمد امین اللہ، ڈاکٹر ایم سعید الدین جناب محمد جعفر، ڈاکٹر نکہت ناز، پروفیسر سید نیاز احمد جمالی اور ڈاکٹر محمد طیب علی نے اپنے مقالے پیش کیے۔

سمینار کے دوسرے دن دوسری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر نسیم الدین فریس نے فرمائی۔ اس نشست میں آن لائن اور آف لائن مقالے پڑھے اور سنے گئے۔ ڈاکٹر شاجہاں بیگم، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر کے ایچ کلیم اللہ، محترمہ تزئین جمال، محترمہ عائشہ صدیقہ، جناب مسرت حمزہ لون، محترمہ نادرہ بیگم، محترمہ انیسہ بیگم نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسری نشست کی صدارت ڈاکٹر حیات افتخار نے کی اور مقالے ڈاکٹر محمد نثار احمد، محمد منیر الدین عمری، جناب نذیر احمد، جناب غیاث احمد، ڈاکٹر مسعودہ تسکین، ڈاکٹر ایس محمد یاسر، محترمہ فوزیہ حبیب اسلامیہ نے پڑھے۔ چوتھی نشست کی صدارت ڈاکٹر کے ایچ کلیم اللہ، نے کی جس میں ڈاکٹر محمد مدثر، جناب ساجد حسین ندوی، نازیہ، ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی، جناب نور اللہ، جناب تمیم احمد شیموگہ کرناٹک نے 'ڈاکٹر بشیر الحق قریشی کی انشاپردازی' کے عنوان پر اپنے گرانقدر مقالے پیش کیے۔

سمینار کے پہلے دن شام کے 4 تا 6 بجے ایک 'شام غزل' کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب علیم صبا نویدی نے کی جبکہ پروفیسر نسیم الدین فریس، صدر شعبہ اردو جناب حسن فیاض اور ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن بطور مہمانان اعزازی شریک رہے۔ اس محفل میں جناب حسن فیاض، شاہد مدراسی، ڈاکٹر امان محمدی، عبدالکریم، ڈاکٹر پروین فاطمہ، اکبر زاہد، اسانغنی مشتاق رفیقی، اسانغنی اشفاق احمد، عائشہ دولت، احمد نذیر، ڈاکٹر سید عبدالمحسن قادری، امتیاز احمد، پروفیسر نسیم الدین فریس نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کا آغاز نعت شریف سے ہوا جب کہ نظامت کے فرائض جناب شاہد مدراسی نے انجام دیے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی حبیب احمد صاحب نے فرمائی اور مقالوں کا محاکمہ کرتے ہوئے کہا کہ نئے اور اہم موضوع پر گفتگو کا آغاز ہوگیا ہے۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس میں جناب پروفیسر نسیم الدین فریس نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور سمینار کے کامیاب انعقاد پر مبارکباد پیش کی اور مقالہ نگاروں کو اسناد بھی تقسیم کیے۔ سمینار ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر امان للہ ایم پی نے مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ان مقالات کو یکجا کرکے اور مزید ماہرین ادب سے مضامین لکھوا کر بہت جلد انھیں کتابی شکل دے دی جائے گی تاکہ آئندہ نسلیں اس سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

پریس ریلیز: ایمان اللہ ایم پی، ڈپارٹمنٹ آف عربک، پرسین اینڈ اردو، مدراس یونیورسٹی، چنئی، 9 مارچ 2021

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

طلبا مادری زبان میں جلدی سیکھتے ہیں: وزیر تعلیم

نئی دهلی: مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' نے کہا کہ مادری زبان ہر طالب علم کے لیے بے حد ضروری ہے اور نفسیات تعلیم میں ہوئی تحقیق سے یہ بات

ثابت ہوتی ہے کہ مادری زبان میں بچے جلد اور زیادہ سیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نشنک نے مرکزی وزارت تعلیم، مرکزی وزارت ثقافت اور اندرا گاندھی نیشنل سنٹر فار آرٹس کے ذریعے یوم مادری زبان کے موقعے پر منعقدہ سیمنار 'تعلیم اور سماج میں شمولیت کے لیے کثیر لسانیات کو فروغ دینا' سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم میں حاصل کرنے سے طالب علم خوشی محسوس کرتے ہیں اور اتنا ہی نہیں ان کی عزت نفس میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

مرکزی وزیر نے مادری زبان کے لیے مرکزی حکومت کی سنجیدگی کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ ''مادری زبان کی اہمیت سے مرکزی حکومت اچھی طرح واقف ہے۔ مادری زبان کو فروغ دینے کے لیے وزیر اعظم مودی کی رہنمائی میں ہماری حکومت کے ذریعے ملک کی تمام زبانوں کے تحفظ اور ترقی کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔'' اس کے علاوہ ڈاکٹر نشنک نے نئی قومی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کی ترقی کے لیے دیے گئے التزامات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جہاں 121 سے زیادہ زبانیں مروج ہیں۔ ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں کئی ایسی اسکیموں کا التزام کیا گیا ہے جن سے ہندوستان میں ایک کثیر زبانی سماج کی تعمیر میں مدد ملے گی۔ انھوں نے مرکزی حکومت کی زبان کی ترقی اور زبان کے فروغ کی مختلف اسکیموں سے سب کو آگاہ کیا۔ اس موقعے پر نائب صدر وینکیا نائیڈو بطور مہمان خصوصی اور مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم سنجے دھوترے، مرکزی وزیر مملکت برائے ثقافت (آزاد چارج) پرہلاد سنگھ پٹیل اور اندرا گاندھی نیشنل فار آرٹس کے سکریٹری ڈاکٹر سچید انند جوشی بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 22 فروری 2021

دهلی

ذاکر حسین لائبریری کی تعمیر نو

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی چانسلر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے جامعہ کے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے تعمیر نو ریڈنگ روم کا افتتاح کیا اور تحفہ کے طور پر قرآن مجید پیش کیا۔ ڈاکٹر ہپت اللہ کو یہ انمول قرآن مجید سعودی عرب کے

بادشاہ عالیجناب مرحوم شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز السعود کے ذریعے پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے یونیورسٹی کو کسوا (ایک بڑا کپڑا جو کعبہ کو ڈھکتا ہے) کا ایک فریم کیا ہوا ٹکڑا بھی پیش کیا۔ اس موقعے پر تقریب میں مہمان خصوصی جسٹس سہیل صدیقی اور سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی و دیگر اساتذہ اور یونیورسٹی کے نان ٹیچنگ اسٹاف نے بھی حصہ لیا۔

تقریب کا انعقاد کووڈ 19 سے متعلق سبھی پروٹوکول پر عمل کرتے ہوئے کیا گیا۔ سبھی کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر ہپت اللہ نے کہا کہ انھوں نے جامعہ کو یہ تحفہ پیش کرنے کے لیے سب سے مناسب جگہ کے طور پر پایا۔ اتنے سارے چیلنجز کے باوجود یونیورسٹی کو اور زیادہ اونچائی تک لے جانے اور جامعہ کو ایک خاص مقام دلانے کے لیے انھوں نے وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر کی کوششوں کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ جامعہ میں میڈیکل کالج اور اسپتال قائم کرنے میں اپنی سطح پر ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 فروری 2021

ذاکر حسین لائبریری ریسورسز اور خدمات

نئی دهلی: شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'ذاکر حسین لائبریری ریسورسز اور خدمات' آن لائن پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مرکزی لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر طارق اشرف نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری میں اردو، فارسی، عربی، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں تقریباً 4 لاکھ کتابیں آن لائن اور آف لائن موجود ہیں۔ 24 گھنٹے میں کسی بھی وقت اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مرکزی لائبریری کے علاوہ 35 لائبریریاں ہیں اور تمام لائبریریوں کی کتابوں کی فہرست آن لائن سسٹم سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح ہر شعبے کا کلیکشن ہے جسے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ ای بکس کے علاوہ جرنلس اور مضامین کا بھی ایک بڑا مجموعہ موجود ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ نیشنل ڈیجیٹل لائبریری کا بھی استعمال کر سکتے ہیں، زبان کا انتخاب کر کے کتابیں تلاش کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جان محمد میر نے کہا کہ اسلامک اسٹڈیز سے متعلق کتابوں کی کوڈنگ 297 ہے، اس کے ذریعے اسلامی تاریخ، تہذیب و ثقافت سے متعلق کتابیں بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ پروگرام کے صدر پروفیسر سید شاہد علی نے کہا کہ لائبریری کے ساتھ مل کر ہمیں کام کرنا چاہیے۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر عمار عبدالحی کی تلاوت کلام اللہ سے ہوا۔ نظامت کے فرائض شعبہ کے استاد ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی نے انجام دیے۔ پروگرام میں پروفیسر اقتدار محمد خان، پروفیسر محمد اسحاق، جنید حارث، ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر محمد خالد خان، ڈاکٹر محمد عمر فاروق، ڈاکٹر خورشید آفاق، ڈاکٹر انیس الرحمٰن، ڈاکٹر جاوید اختر، ڈاکٹر مسیح اللہ، ڈاکٹر ندیم سحر عنبریں اور ریسرچ اسکالر کے علاوہ بڑی تعداد میں بی اے اور ایم کے طلبا و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 فروری 2021

ترقی پسند ادبی صحافت پر مذاکرہ

نئی دھلی: ترقی پسندی نظام فطرت سے ذہنی اور فکری ہم آہنگی کا نام ہے، کوئی بھی بیدار و حساس انسان ترقی پسندی سے انحراف نہیں کرسکتا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر انور پاشا نے معروف صحافی و ادیب لئیق رضوی کی نئی تصنیف 'ترقی پسند ادبی صحافت' کی رونمائی کے موقعے پر منعقد مذاکرہ میں کیا۔ غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین کی جانب سے منعقد مذاکرے میں پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ لئیق رضوی کی یہ کتاب ترقی پسند ادب کو نئے سرے سے سمجھنے کا موقع فراہم کرے گی۔ جلسے کی صدارت غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر جی آر کنول نے کی۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ لئیق رضوی نے اپنی کتاب میں اردو کے مختلف ادبی رسائل کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کی تاریخ پیش کردی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادب اور تحریک کو سمجھنے کے لیے یہ اہم کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف لئیق رضوی نے کہا کہ ترقی پسند ادبی صحافت نے عام صحافت سے کہیں بڑھ کر ملک وقوم کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادبی صحافت ترقی پسند تحریک کا ایسا چوتھا ستون ہے، جو نہ صرف تحریک کی حمایت کررہا تھا بلکہ ان خامیوں وکوتاہیوں کی نشاندہی بھی کررہا تھا جو ملک وقوم اور زبان وادب کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔ صحافی ممتاز عالم رضوی نے کہا کہ ترقی پسند ادبی صحافت ایک تاریخی دستاویز اور ایک بڑا ادبی سرمایہ کہلانے کی حامل ہے۔ مذاکرے کی نظامت کرتے ہوئے صحافی و شاعر معین شاداب نے کہا کہ لئیق رضوی کی یہ کتاب اس معنی میں جداگانہ اہمیت کی حامل ہے کہ یہ ترقی پسند ادبی صحافت کا محض گوشوارہ نہیں بلکہ اس میں تنقیدی و تحقیقی شعور بھی کارفرما ہے۔ اس موقعے پر گوتم بدھ یونیورسٹی اردو شعبہ کی استاد ڈاکٹر ریحانہ زیدی اور دہلی یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر فرحت انوار نے بھی اظہار خیال کیا۔ قبل ازیں جلسے کے آغاز میں غالب کی زمین میں متین امروہوی نے کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 فروری 2021

غالب کے ناقدین و محققین

نئی دھلی: گذشتہ روز غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں غالب کے ناقدین و محققین کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں شاداب تبسم نے یوسف حسین خاں

کی غالب شناسی اور آہنگ غالب کے حوالے سے اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ غالب شناسی کے ضمن میں غالب اور آہنگ غالب ایک اہم اور بنیادی کتاب ہے۔ اس کے پانچ ابواب میں غالب کے زمانے اور ان کے فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالب کے غم عزت، غم روزگار، پنشن کا قضیہ، قید فرنگ، غم عشق، مجازی عشق، غالب کے تغزل، تخیلی فکر، جدت ادا غالب کے شعری محرکات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ یوسف حسین خاں تنقید کے جمالیاتی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوسف حسین خاں نے کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ جمالیاتی اوصاف کی بدولت غالب نے غزل کو ہمارے ادب کی تقدیر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر حنا آفرین نے اپنے مقالے مالک رام کی کتاب فسانہ غالب میں کہا کہ مالک رام کی بنیادی کتاب ذکر غالب ہے۔ فسانۂ غالب اس کی توسیع ہے جو باتیں ذکر غالب میں اختصار سے کی گئیں، ان باتوں کو مختلف مضامین میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے یادگار غالب کے فارسی حصے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غالبیات کے ضمن میں حالی کی یادگار غالب ام الکتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جی آر کنول نے بہت سی انگریزی کتابوں کا ذکر کیا اور کہا کہ غالب پر ہر زبان میں کام ہورہا ہے، پاکستان میں بھی کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ یوسف حسین خاں، مالک رام، جب دلی میں تھے تب دلی ہری بھری لگتی تھی۔ اب دلی اجاڑ لگتی ہے۔ یوسف حسین خاں نے فرانسیسی ادب پر اردو میں لکھا ہے۔ یادگار غالب، شعر العجم، آب حیات جیسی کتابوں کا کوئی جواب نہیں ہے، غالب کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ محققین ناقدین مستقل لکھ رہے ہیں۔ ان کے کلام کی پیچتر سے زیادہ شرحیں لکھی گئی ہیں۔ غالب پر اردو ہندی، انگریزی، بنگالی اور تمام بڑی زبانوں میں کام ہورہا ہے۔ سیمینار میں ظہیر برنی، متین امروہوی، نسیم عباسی، میکش امروہوی، سرفراز فراز اردو فارسی سیکھنے والے طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 فروری 2021

ملک کی آزادی میں اخبار کا کردار

غازی پور: محمد آباد تحصیل کے موضع مرکی کھرد واقع شمس ماڈل اسکول کے صحن میں 'ملک کی آزادی میں اخبار کا کردار' عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اقبال احمد مدیر آج کانپور اور اعزازی مہمان کی حیثیت سے اردو ہفتہ روزہ پیغام عمل کی مدیر رقیہ پروین نے شرکت کی۔ اس سیمینار کی صدارت شمس ماڈل اسکول کی پرنسپل رازداں جاوید نے اور نظامت کے فرائض خان احمد جاوید نے انجام دیے۔ اس سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر اقبال احمد نے کہا کہ ملک کی آزادی کے لیے جنگ تین سطح پر لڑی گئی تھی جس میں سے ایک ستیہ اور اہنسا کے راستے پر لڑی گئی، جس کی قیادت مہاتما گاندھی نے کی، دوسری بغاوت کے راستے لڑی گئی جس کی قیادت سبھاش چندر بوس نے کی اور تیسرا راستہ تحریری طور پر اختیار کیا گیا جس کی وجہ سے بے شمار صحافیوں کو انگریزی حکومت کے جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ جمہوری ملک میں صحافت آزاد ہے لیکن جن ملکوں میں جمہوری نظام قائم نہیں ہے وہاں صحافت کو اپنی مرضی کے مطابق بات کہنے کا اختیار نہیں ہے۔ ہمارا ملک اس معاملہ میں خوش نصیب ہے کہ ہمیں ملک کے عوام کے مفاد میں حکومت وحکمرانوں کے خلاف اپنی رائے رکھنے کی آزادی ہے۔ انھوں نے سینئر صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ نئے آنے والے صحافیوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے رہیں تاکہ صحافت کا وقار بحال رہے۔ ان کے علاوہ رقیہ پروین اور رازداں جاوید نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر محمد آباد تحصیل کے صحافی کثیر تعداد میں موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مارچ 2021

مدارس کے طلبا: ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں

نئی دھلی: مدارس اسلامیہ نے اردو زبان اور اسلامیان ہند کے تشخص کو تحفظ فراہم کرنے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ آج اگر ہندوستان کے طول وعرض میں

اردو زبان کی مٹھاس کانوں میں رس گھولتی نظر آتی ہے تو اس میں بلاشبہ مدارس اسلامیہ کا نمایاں کردار ہے۔ یہ باتیں مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، دہلی یونٹ کے بینر تلے منعقد پروگرام بعنوان 'مدارس کے طلبا: ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں' صدارتی خطبے میں کہیں۔ کورونا کی وبا کے مدنظر یہ پروگرام ایم ایس او دہلی یونٹ کے صدر عبدالباری برکاتی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی قیادت اور ایجوکیشن پوائنٹ کے بانی منظر امن کی نظامت میں آن لائن منعقد کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز محبوب ظفر کے تلاوت قرآن مجید سے ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر طارق ابرار نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ انھوں نے ایم ایس او کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ وقت میں اس نوعیت کے پروگراموں کی اشد ضرورت ہے تاکہ مدارس کے طلبا کو مین اسٹریم سے جوڑا جاسکے۔ بعدازاں پریزیڈنسی کالج کولکاتا کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی نے مدارس اسلامیہ کے روشن ماضی کی تاریخ رکھی اور یہ بتایا کہ لارڈ میکالے کے منٹس کے بعد جدید تعلیم اور مذہبی تعلیم کی اصطلاح شروع ہوئی ورنہ اس سے پہلے جو نظام تعلیم تھا اس میں کہیں اس طرح کی تفریق نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بہار یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ثناء اللہ، ڈاکٹر حسین، گورنمنٹ ڈگری کالج، جموں وکشمیر کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق اور ڈاکٹر نیاز احمد وزارت آیوش ہند نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا'دہلی، 15 فروری 2021

'نقوش معنی' پر مذاکرہ

نئی دهلی: ادبی تنظیم ادارہ ادب اسلامی، حلقہ دہلی اور سماجی تنظیم فورم فار انٹلکچول ڈسکورس کے زیر اہتمام خاکہ نگار پروفیسر خالد محمود کی 27 ویں کتاب 'نقوش معنی' (مجموعۂ مضامین) پر ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف فکشن نگار پروفیسر معین الدین جینابڑے نے صدارتی کلمات میں پروفیسر خالد محمود کے اسلوب کے حوالے سے کہا کہ اب ایسی پرلطف نثر خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ صاحب کتاب پروفیسر خالد محمود نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ کتاب پر مذاکرے کا یہ طریقہ بے حد بامعنی اور نتیجہ خیز رہا۔ میں نے بہتر سال کی عمر میں ادبی مذاکرے کا ایسا البیلا اور نرالا انداز کبھی نہیں دیکھا۔ تمام شرکا نے میرے دس مقالات کا لگ الگ اور بھرپور تجزیہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر وقار انور نے کہا کہ خالد محمود کے مضامین کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے معلمانہ مقام و مرتبے اور اس کی ذمے داریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ مذاکرے میں ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر معید الرحمٰن، منظر امام سفیر صدیقی نے تجزیاتی مطالعات پیش کیے۔ اس مذاکرے میں ایک اور امر کا اہتمام کیا گیا کہ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایم اے اور بی اے کے ہونہار طلبا ابوالاشبال، جمیل سرور، دانش خورشید اور افسار بھٹ نے کتاب کے مختلف حصوں کی متن خوانی کی۔ عرفان وحید نے مہمان کا استقبال کیا او رپروگرام کی نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا'دہلی، 16 فروری 2021

اتر پردیش

تعلیم نسواں

امروهه: ہاشمی گرلس پی جی کالج امروہہ شعبہ اردو کے زیر اہتمام سمینار بعنوان تعلیم نسواں منعقد ہوا۔ سمینار میں ماہرین تعلیم نے اپنے خطاب کے دوران تعلیم نسواں کے فروغ کے فوائد اور فروغ کی ضرورت پر زور دیا۔ اس دوران متعلقہ شعبہ کی متعدد طالبات نے حسب موضوع اپنا خیال پیش کرتے ہوئے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے کارآمد مشورے بھی پیش کیے۔ چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ اور نائب صدر انجمن ترقی اردو اترپردیش ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے خطاب کے دوران کہا کہ بیٹیوں کو تعلیم یافتہ کرنا موجودہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ موجودہ وقت میں خواتین کے لیے ہر شعبے میں بہت مواقع موجود ہیں۔ صلاحیت کے بل بوتے آج ہر میدان میں خواتین مردوں کے ساتھ مل کر ملک وسماج کی ترقی میں اہم کردار ادا کررہی ہیں اور یہ سب تعلیمی بیداری سے ہی ممکن ہوسکا ہے۔ کالج پرنسپل ڈاکٹر رضوانہ کلثوم نے بھی تعلیم نسواں کے فوائد سے روشناس کرایا، وائس پرنسل ڈاکٹر حسن بانو نے بھی حسب موضوع طالبات سے خطاب کیا۔ اس موقعے پر کالج کا جملہ اسٹاف موجود رہا۔ نظامت راشدہ ابراہیم نے کی۔

روزنامہ'سچ کی آواز'دہلی، 25 فروری 2021

غالب اور اکبرآباد

آگرہ: فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام سینٹ جانس کالج آگرہ میں 'غالب اور اکبرآباد' کے عنوان سے دو روزہ قومی سمینار، کل ہند مشاعرہ اور تہذیبی وثقافتی پروگرام شام غزل کا انعقاد ہوا۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر ایس پی سنگھ نے دیپ جلا کر پروگرام کا افتتاح کیا۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر ایس پی سنگھ پرنسپل سینٹ جانس پی جی کالج آگرہ نے کہا کہ ہمارا شہر اور ہمارا کالج اردو زبان وادب کے فروغ میں پیش پیش رہا ہے۔ اردو کو خدائے سخن میر تقی میر اور پیغمبر سخن اسداللہ خاں غالب اسی شہر نے دیے۔ ہمارے کالج نے سیماب اکبرآبادی، حامد حسین قادری، آل احمد سرور، ثاقب لکھنوی، معین احسن جذبی، مجاز لکھنوی جیسے کوہ نور ہیرے تراش کر اردو ادب کو دیے ہیں۔ سینٹ کالج کے اساتذہ بھی نامی گرامی ادبی شخصیتیں رہی ہیں۔ سینٹ جانس کالج کی ادبی خدمات کو تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے۔ اگر کوئی یونیورسٹی ہمارے کالج پر پی ایچ ڈی کراتی ہے تو ہم اور ہمارا ادارہ اس کی پوری معاونت کریں گے۔ پروفیسر سنگھ نے کہا کہ غالب کے دانشوروں نے ان کے کلام کو وید مقدس کا مقام دیا ہے۔ اس کا سبب اس کی وہ تازگی ہے جو ہر زمانہ کو اپنے اندر سمونے کی طاقت رکھتی ہے۔ غالب کو پردہ کیے ایک سو پچاس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں لیکن ان کا کلام پچاس دن بھی پرانا نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے آج بڑی خوشی ہورہی ہے اور یہ ایک تاریخی لمحہ ہے کہ غالب اور اکبرآبادی کے رشتوں کی تلاش کا مرکز ہمارا کالج بن رہا ہے۔ کنوینر پروفیسر اشرفی نے پرنسپل ایس پی سنگھ کی کشادہ دلی، ادب پرستی اور خصوصی طور پر اردو سے دلی اور جذباتی لگاؤ کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے بھی اسی کالج میں 23 سال تدریسی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ'میرا وطن'دہلی، 14 فروری 2021

صادقین امروہوی: فن اور شخصیت

امروهه: مشہور مصور صادقین امروہوی کے فن اور شخصیت پر ایک سمینار امروہہ کے شہر آئی ایم انٹر کالج میں منعقد ہوا جس کی صدارت ولی حیدر ولی امروہوی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر لاڈلے رہبر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر مقررین نے صادقین نقوی کی زندگی کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے، اسی طرح شعرا نے اسی عنوان کے تحت اپنی تخلیقات پیش کیں۔ پروفیسر ناشر نقوی نے کہا کہ سید صادقین نقوی 1930 میں اترپردیش کے امروہہ ضلع میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مصوری کے اسی سلسلے کو اپنایا جسے ربیندر ناتھ ٹھاکر امرتا شیرگل نے اپنی پینٹنگز میں جنم دیا تھا۔ صادقین کا بچپن امروہہ کے سادہ اور پرامن ماحول میں گزرا تھا اور یہاں اس نے گھر کی دیواروں پر کوئلے کی سیاہ لکیروں سے

پینٹنگ کا فن سیکھا تھا۔ ایک باصلاحیت مصور ہونے کے علاوہ وہ انتہائی حساس تھے جو تمام معاشرے کے لیے تعلیم اور رواداری کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر جمشید کمال نے کہا کہ انھوں نے نہ صرف اپنی پینٹنگز کی بہت سی نمائشیں کیں، بلکہ بنارس ہندو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نیشنل جیوفزیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (حیدرآباد) کے احاطے میں بہت بڑی فریسکوز بھی بنائیں۔ وسیم امروہوی نے کہا کہ صادقین امروہوی نے مختلف لوگوں کو اپنی پینٹنگ کا مرکز بنایا۔ پاکستان میں منگلا ڈیم کے احاطے میں 200 x 30 فٹ سائز کی پینٹنگ بنائی۔ صدارت فرمارہے ولی حیدر نقوی نے بتایا کہ بھائی صادقین کو اپنے شہر سے بے حد محبت تھی۔ آخری بار جب وہ امروہہ آئے تھے تو حکومت نے انھیں بہت عزت دی تھی۔ پروگرام کے دوران شاعری کے شعبے میں شمیم نقوی، ناشر نقوی، جمشید کمال، مصوری میں نوجوان مصور صادقین نقوی، ماسٹر افضال، شارق ریاض نقوی، وسیم نقوی کو فوٹوگرافی کے شعبہ میں اعزاز سے نوازا گیا۔ آخر میں کنوینر رامش ولی نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 فروری 2021

بہار

تعلیمی بیداری وتحفظ اردو مہم

سیتامڑھی: ہم اپنی جان و مال کی قربانی دیتے ہوئے آئندہ نسلوں کے تحفظ کو یقینی بنائیں تاکہ آنے والے مقابلاتی دور میں ہمارے بچے پیچھے نہ رہ جائیں۔ ان خیالات کا اظہار امارت شرعیہ کی طرف سے جاری تعلیمی بیداری مہم اور تحفظ اردو کے سلسلے میں منعقد نشست کے دوران اشرف العلوم کنہواں کے ناظم اور امارت شرعیہ پر بہار کے صدر مولانا اظہار الحق مظاہری نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہر میدان میں بازی مارنے کے لیے ہمیں اخلاص اور اعلیٰ اقدار کا پیکر بنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں ہماری نمائندگی صرف تعلیم کے سبب پیچھے ہے، اگر قوم کے بچے اس میدان میں اپنا لوہا منوا لیتے ہیں تو کوئی ہمیں مات نہیں دے سکتا، اس کے ساتھ ہمیں اردو کی بقا پر بھی زور دینا چاہیے۔ اردو مدارس کے لیے روح اور جسم کی طرح ہے۔ مدارس کے بچوں کی تعلیم میں اردو سے تسہیل پیدا ہوتی ہے۔ ہماری بڑی ذمے داری ہے اور یہ ہمیں ہی نبھانی ہوگی۔ نشست کی نظامت کر رہے انچارج مرکز المعارف ممبئی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن مکی قاسمی نے دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم اور عصری اداروں میں دینی تعلیم کا باضابطہ انتظام ضروری ہے، ساتھ ہی اردو کی بقا اور عام لوگوں کے استعمال کی زبان بنانے کے لیے ایک مضبوط لائحہ طے کیا جانا چاہیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2021

تحفظ اردو کے لیے مشاورتی اجلاس

پھلواری شریف: اردو کی بقا، تحفظ اور ترویج واشاعت کے موضوع پر المعہد العالی امارت شرعیہ کے کانفرنس ہال میں امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانی کی صدارت میں اردو تحریک سے وابستہ اہم افراد، سماجی و سیاسی کارکنان، اردو کے اساتذہ، دانشوران اور نمائندہ شخصیات کا ایک اہم مشاورتی اجلاس منعقد ہوا۔ صدارتی خطاب میں امیر شریعت مولانا ولی رحمانی نے اردو کو درپیش مسائل اور اس کے حل پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے شرکا سے کہا کہ آپ کمان سنبھالیں جو تنظیمیں، انجمنیں ادارے ہیں وہ احساس شکر کے ساتھ ادائے فرض کی نیت سے اپنی ذمے داری نبھائیں اور مشترکہ کوششوں کی راہ اپنائیں۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ اردو تحریک کے اندر زندگی پیدا کرنے کے لیے ایک طویل مدتی منصوبہ بنانے اور صبر وضبط کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کام کے لیے ہمیں ترجیحات متعین کرنی ہوں گی، اپنی عددی قوت کا ثبوت دینا ہوگا اور دیوانگی کے ساتھ کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ اردو کمیشن کا شعبہ قائم کیا جائے اور اعداد و شمار جمع کیے جائیں۔ انھوں نے آن لائن منعقد کی نزاکتوں کو سمجھنے اور ان کا حل سوچنے کی بھی تجویز رکھی۔ سابق وزیر عبدالباری صدیقی نے کہا کہ اردو کو روزگار کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت ہے۔ ریاض عظیم آبادی نے کہا کہ آج اسکولوں میں اردو پڑھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے اس کو روکنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر احمد اشفاق کریم نے اردو کو روزگار اور معیشت سے جوڑنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر قائم مقام ناظم مولانا شبلی القاسمی، مشتاق احمد نوری، مولانا تقی الدین احمد ندوی فردوسی، اسلم جاوداں، انوارالہدیٰ، سید دائم، انوارالحسن وسطوی، مولانا شکیل احمد قاسمی، پروفیسر توقیر عالم، مولانا اعجاز احمد، حسن رضا امجدی، مولانا صدر عالم ندوی، حبیب مرشد خان اور شہواز خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مفید مشورے دیے۔ تمام شرکا کی اتفاق رائے سے اردو کارواں اور اردو دستہ کے نام سے دو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ اردو کارواں کے صدر اعجاز علی ارشد، نائب صدر پروفیسر صفدر امام قادری، جنرل سکریٹری ڈاکٹر ریحان غنی اور سکریٹری انوارالہدیٰ کو بنایا گیا اور انھیں مجاز کیا گیا کہ وہ ضلعی سطح پر کمیٹیاں بنائیں اور اس کمیٹی میں مزید ممبران کا اضافہ کرلیں، ساتھ ہی اردو دستہ کے لیے بھی ذمے داروں اور ممبران کا انتخاب کرلیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 فروری 2021

اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام فروغ اردو سمینار و مشاعرے کا انعقاد

دربھنگہ: شہر کے ڈی ایم سی ایچ آڈی ٹوریم میں محکمہ اقلیت فلاح کے اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار (ضلع اردو زبان سیل دربھنگہ) کے زیر اہتمام ضلع سطحی ورکشاپ و فروغ اردو سمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب کا افتتاح شمع روشن کرکے انچارج ڈی ایم کم ڈی ڈی سی تنے سلطانیہ نے کیا۔ اس موقعے پر ضلع اقلیتی فلاح افسر رضوان احمد نے مہمانان کا استقبال کیا اور خطبہ استقبالیہ بھی پیش کیا۔ اس موقعے پر انچارج ڈی ایم تنے سلطانیہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ کسی زبان کو مقبول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس زبان کا استعمال لوگ زیادہ سے زیادہ کریں۔ اس طرح کے پروگرام کے انعقاد سے لوگوں کو زبان کی اہمیت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ اردو زبان ایک دوسرے کو جوڑنے والی زبان ہے۔ صدر مجلس صدر جمہوریہ ایوارڈ یافتہ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ہمیشہ مشترکہ تہذیب کی زبان رہی ہے اور اس کو ہمیشہ ہندو مسلمان و دیگر اقوام کے لوگوں نے فروغ دیا ہے اور اس کی پرورش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں سب سے پہلا منظوم اخبار ایک کائستھ خاندان نے نکالا تھا۔ وہیں سینئر صحافی اور روزنامہ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ اپنے قیام سے ہی بڑا اچھا کام کر رہا ہے اور اردو ملازمین کے ساتھ عوام میں بھی بیداری لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر قیام نیر اور پروفیسر احتشام الدین نے بھی بنیادی تعلیم میں اردو کو مضبوط کرنے کی وکالت کی۔ ایڈیشنل کلکٹر عوامی شکایت راجیو رنجن پربھاکر نے کہا کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اردو سب کی زبان ہے لیکن اس میں غلط فہمی ہوجاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے پروگراموں کو سب ڈویژن اور بلاک سطح پر لے جانے کی ضرورت ہے۔ ڈی سی ایل آر صدر سعدالحسن خاں نے کہا کہ سائنس میرا تعلیمی بیک گراؤنڈ رہا لیکن میں نے اردو زبان کے ذریعے ہی بی پی ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مارچ 2021

اردو صحافت کا عصری منظر نامہ

دربھنگہ: للت نرائن متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے جبلی ہال میں 'اردو صحافت کا عصری منظر نامہ' کے عنوان پر یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر رئیس انور نے کی جب کہ وائس چانسلر پروفیسر سریندر پرتاپ سنگھ بطور مہمان خصوصی اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز پرتی جھا اور ڈاکٹر مشتاق احمد بطور مہمان اعزازی شامل ہوئے۔ کلیدی خطبہ روزنامہ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید نے پیش کیا۔ اس موقعے پرووی پروفیسر ایس پی سنگھ نے کہا کہ اردو صحافت کا جنگ آزادی میں اہم کردار رہا ہے۔ بطور مہمان اعزازی رجسٹرار ایل این ایم یو ڈاکٹر مشتاق احمد نے کہا کہ شعبہ اردو کے ذریعے اس عنوان پر سمینار کے انعقاد سے طلبہ کو صحافت کے بارے میں جاننے کا موقع ملے گا۔ پرتی جھا نے شعبہ کی سرگرمیوں کو سراہا اور کہا کہ اردو بڑی پیاری زبان ہے۔ احمد جاوید نے کلیدی خطبہ میں کہا کہ دیگر اخبارات کی طرح اردو صحافت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ پروفیسر رئیس انور نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے لیکن موجودہ وقت میں یہ ستون متزلزل ہو چکا ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر آفتاب اشرف نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے دربھنگہ کے ادبی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عبدالحی نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کا یہ بڑا روشن پہلو ہے کہ جنگ آزادی میں انگریزوں نے جس صحافی کو توپ سے اڑا دیا اس کا تعلق اردو صحافت سے تھا۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کے کلمات تشکر پر افتتاحی اجلاس کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر اکزام کنٹرولر اے کے رائے، شعبہ انگریزی سے صدر بچن، میتھ کے صدر اگروال، جیوانند جھا، ڈی ایس ڈبلو، اشکوک جھا، رمیش جھا، اے کے سنہا، سحر افروز، ڈاکٹر ظفر سعید، ڈاکٹر خالد سجاد، ڈاکٹر شمشاد اختر، طارق اقبال اور ڈاکٹر نسیم کے علاوہ دانشوران، اساتذہ اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر سید احمد قادری اور پروفیسر ایس ایم رضوان اللہ نے کی۔ نظامت ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے کی۔ حقانی القاسمی، خاور حسن، ادریس احمد خان، ڈاکٹر فصیح الزماں، لئیق رضوی، امتیاز احمد، افتخار الزماں، ڈاکٹر امام اعظم، صائمہ خان، جاوید اختر، ڈاکٹر منصور خوشتر نے اپنے مقالات پیش کیے اور اردو صحافت کے عصری منظرنامے پر روشنی ڈالی جب کہ دوسرے اور تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر احتشام الدین، ڈاکٹر شمشاد اختر اور ڈاکٹر افتخار احمد نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالرافع اور ڈاکٹر وصی احمد شمشاد نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 فروری 2021

تلنگانہ

تحریک آزادی میں خواتین کا حصہ

تاریخ شاہد ہے کہ آج تک بے شمار عورتوں نے اپنی جدوجہد اور کوششوں سے بہترین سماج کو وجود بخشا۔ محترمہ عتیقہ قاضی صدر سدرہ ویمنس ویلفیئر سوسائٹی نے اپنی صدارتی تقریر میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ سدرہ ویمنس ویلفیئر سوسائٹی، عثمان باغ، بہادر پورہ، حیدرآباد کے زیر اہتمام 'تحریک آزادی میں خواتین کا حصہ' عنوان پر اردو گھر مغل پور میں منعقد اس سمینار سے ڈاکٹر حبیب امام قادری سب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن نے اپنے کلیدی خطبے میں تحریک آزادی میں حصہ لینے والی خواتین پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کارناموں کو پیش کیا۔ مہمان خصوصی محترمہ مہیشور پانڈے، سینئر ایڈوکیٹ تلنگانہ ہائی کورٹ نے خواتین کو ہر میدان میں آگے بڑھنے کا مشورہ دیتے ہوئے ان سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کی جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں ہر طرح سے حصہ لیا۔ مہمان اعزازی محترمہ ڈاکٹر غوثیہ بانو، کونسلر امبیڈکر یونیورسٹی، محترمہ ڈاکٹر ممتاز صنم، سینئر جرنلسٹ و لکچرار، محترمہ یمین فاطمہ فائنانس سکریٹری، ڈینٹ ایجوکیشنل سوسائٹی نے اس سمینار کو خواتین و طالبات کے لیے ادبی، تاریخی، اور ثقافتی اعتبار سے مفید قرار دیا۔ مختلف خواتین ریسرچ اسکالرز و لکچرار نے سمینار کی پہلی نشست میں مقالے پیش کیے جن میں سمیع النسا پرنسپل، سمیہ خاتون، سدرہ صدیقہ، سیدہ زرین، عائشہ تزئین، آمنہ النسا، اسما النسا، اور ناظمہ سلطانہ ہیں۔ جویریہ صدیقہ پرنسپل براعم ہائی اسکول و جونیئر کالج نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ عشرت النسا قادری جنرل سکریٹری سدرہ سوسائٹی نے شکریہ ادا کیا۔ سمینار کی دوسری نشست جناب واحد علی خاں پینل ایڈوکیٹ ہائی کورٹ تلنگانہ و مینیجنگ ٹرسٹی اربن جنتا سیوا چیریٹیبل ٹرسٹ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی ڈائرکٹر سدرہ سوسائٹی نے استقبال کیا۔ جناب محمد عبدالکریم سینئر لکچرار صمدانی واقرا کالج نے تحریک آزادی میں حصہ لینے والی 79 خواتین اور ان کے کارہائے نمایاں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ دیگر مقالے پیش کرنے والے اسکالرز میں مولانا محمد شاہد محمد جہانگیر پاشاہ قادری، انجینئر محمود اقبال وغیرہ ہیں۔ محمد اسمٰعیل علی خاں نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ منصف روزہ گواہ 12 تا 18 فروری 2021

راجستھان

گھر آنگن کا شاعر جاں نثار اختر

جے پور: راجستھان اردو اکادمی کی جانب سے 'گھر آنگن کا شاعر جاں نثار اختر' کے عنوان سے ایک دو روزہ کل ہند سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مقررین نے زبانوں کے سیکھنے کے حوالے سے کہا کہ اسے سیکھنے کے لیے مذہب کی قید نہیں ہونی چاہیے۔ پروگرام کا افتتاح مشہور شاعر شین کاف نظام نے کیا۔ اس موقعے پر ہردیو جوشی جرنلزم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اوم تھانوی، الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی، دینی مدرسہ بورڈ کے وائس پریزیڈنٹ حسن محمد قاسمی بھی موجود تھے۔ شین کاف نظام نے کہا کہ اس طرح کے سمینار اردو کے لیے خاص تو ہیں ہی، اس سے مشہور و معروف ہستیوں کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے۔ جرنلزم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اوم تھانوی نے کہا کہ ہندی سنیما میں نغمہ اور موسیقی نے اردو زبان کو عوام تک پہنچانے میں کافی مدد کی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 5 مارچ 2021

مہاراشٹر

اردو ذریعہ تعلیم اور ٹکنالوجی

مالیگاؤں: اردو کے اساتذہ، طلبہ، محققین، ناقدین، ادبا و شعرا کو جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرانے کے مقصد سے اردو ذریعہ تعلیم اور ٹیکنالوجی کے عنوان سے ایک بامقصد اور پروقار وبینار کا انعقاد مہاتما گاندھی ودیا مندر کے زیر انصرام آرٹس کامرس اینڈ سائنس کالج مالیگاؤں سٹی میں مورخہ 18 فروری 2021 بروز جمعرات کو کیا گیا جس کی صدارت کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر عارف انجم نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر وی ایس مورے اور مقرر خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین شریک ہوئے۔ خواجہ صاحب نے اردو ذریعہ تعلیم اور اردو زبان کو جدید ٹیکنالوجی سے لیس کرنے کی ابتدائی کوششوں سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور بتدریج مختلف ویب سائٹس، سوفٹ ویئر اور ایپلیکیشن کی معلومات فراہم کی، جسے حاضرین نے پوری دلچسپی کے ساتھ سنا۔ خواجہ صاحب نے اردو کی ترویج و اشاعت اور اسے جدید خطوط پر استوار

کرنے کے لیے حکومتی اداروں پر انحصار نہ کرتے ہوئے انفرادی کوششوں سے شروعات کرنے کی ترغیب دی۔ اردو کے کاز کے لیے کام کرنے والے مختلف اداروں کی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جدید ٹیکنالوجی اور اردو کے عنوان پر کافی کام ہوا ہے لیکن ابھی کام باقی ہے۔ اس سمت میں اردو زبان کی پیش رفت پر ہمیں خوش تو ہونا ہے لیکن مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں جانا ہے۔ بلکہ آگے بڑھتے جانا ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر وی ایس مورے نے بھی اردو زبان کی مٹھاس، اس کی چاشنی اور عالمگیریت پر گفتگو کی۔ اس ویبنار میں ملک کے طول وعرض سے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، طلبہ اور ادب نواز افراد نے شرکت کی۔ پروگرام کے اختتام پر حاضرین کے تاثرات بھی لیے گئے۔

پریس ریلیز: مبین نذیر، گذلک اکادمی، مہاراشٹر، 23 فروری 2021

مغربی بنگال

اکیسویں صدی اور اردو ادب

کولکاتا: شعبہ اردو عالیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز ویبنار کا کامیاب انعقاد ہوا جس کا موضوع اکیسویں صدی اور اردو ادب تھا جس میں مختلف جامعات کے 22 اسکالرز نے مقالات پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈنمارک میں مقیم نامور اردو صحافی، شاعر، مترجم اور لغت نویس جناب نصر ملک نے کی۔ اجلاس کا آغاز محمد شاداب انصاری کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر درخشاں زریں نے ویبنار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس ویبنار کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ان کی تنقید اور تحقیق کی سمت و رفتار کا اندازہ لگایا جا سکے تاکہ اردو قلم کاروں کی یہ نسل تازہ کاری کے ساتھ زبان و ادب کے فروغ میں حصہ لے سکے۔ پروفیسر سید نورالسلام (رجسٹرار، عالیہ یونیورسٹی)، پروفیسر میر رضاء الکریم (ڈین برائے انسانیات ولسانیات)، ڈاکٹر اشفاق علی (ڈپٹی رجسٹرار)، پروفیسر امجد حسین (ڈین برائے امور طلبہ) نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور شعبہ اردو کے اس مستحسن قدم پر انھیں مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پچھلی دو دہائیوں میں لکھی جا رہی اہم ادبی نگارشات پر بلیغ اور معلومات افزا گفتگو کی۔ ڈنمارک میں مقیم نصر ملک نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے اندر مطالعہ کا جو ذوق ہے وہ بدقسمتی سے کم ہو رہا ہے۔ افتتاحی جلسے کی نظامت شعبہ اردو کی ریسرچ اسکالر طلعت فاطمہ نے انجام دی اور اظہار تشکر کے کلمات ریسرچ اسکالر محمد آثار عالم انصاری نے پیش کیے۔ ویبنار کے پہلے اجلاس میں محمد منظر حسین، سعدیہ صدف، آصف پرویز، فرحت نازیہ، عطاء اللہ فیاض، افسری بیگم، صوفیہ محمود، ارشاد احمد، رخسار پروین، انعام الرحمٰن اور توصیف الرحمٰن نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرا اجلاس پروفیسر صغیر افراہیم کی زیر صدارت شروع ہوا جس میں شاہد اقبال، طلعت فاطمہ، آثار عالم انصاری، محمد عطاء اللہ، ارشد حسین، نیلوفر پروین، شگفتہ جہاں، تجمل حسین، افسانہ خاتون، تمنا پروین، مفتی ثاقب رضا نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ پہلے اور دوسرے اجلاس کی نظامت کا فریضہ شاہد اقبال اور محمد منظر حسین نے انجام دیا۔ شعبہ اردو عالیہ یونیورسٹی کی اساتذہ ڈاکٹر اقلیمہ خاتون اور ڈاکٹر سیدہ مہریہ مرشد القادری (ویبنار کنوینر) نے تمام مہمانان اور اساتذہ وشرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس ویبنار میں شعبہ کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر نیلوفر فردوس، تمام ریسرچ اسکالرز اور طلبا وطالبات کے علاوہ کثیر تعداد میں دیگر ریاستوں اور اسکول، کالجوں سے سامعین شامل تھے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 2 مارچ 2021

اعزاز واکرام

ساہتیہ اکادمی ایوارڈز 2020

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی ایگزیکیٹو بورڈ کے اجلاس میں ساہتیہ اکادمی کے تین اہم ایوارڈز کا اعلان کیا گیا۔ اردو میں سال 2020 کے لیے ساہتیہ اکادمی کا پُر وقار ادبی ایوارڈ 'اماوس میں خواب' کے لیے حسین الحق کو دینے کا اعلان کیا گیا جبکہ بال ساہتیہ پُرسکار 'فخر وطن' کے لیے حافظ کرناٹکی کو اور یووا پُرسکار' میں 'اپنی بات کا مفہوم دوسرا چاہوں: بانی کی شاعری کا مطالعہ' کے لیے ثاقب فریدی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں رویندر بھون میں اکادمی کی ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ میں مختلف ہندستانی زبانوں کے لیے ایوارڈز کو منظوری دی گئی۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے اس بار یکم جنوری 2014 سے 31 دسمبر 2018 کے دوران پہلی بار شائع ہونے والی نمائندہ کتابیں زیر غور آئیں۔ یہ ایوارڈ امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2020 پانے والے دیگر زبانوں کے چند ادیبوں کے نام ہیں: اناميکا (ہندی)، ارندھتی سبرنیم (انگریزی)، ایم ویرپا موئلی (کنڑ)، ہردے کول بھارتی (کشمیری)، کمل کانت جھا (میتھلی)، گرد یو سنگھ رُوپانا (پنجابی)، مہیش چندر شرما گوتم (سنسکرت) نِکھیلیشور (تیلگو) وغیرہ۔

بال ساہتیہ پُرسکار پانے والوں میں حافظ کرناٹکی (اردو) کے علاوہ بال سوروپ راہی (ہندی)، ونیتا کولہو (انگریزی)، سید اختر حسین منصور (کشمیری)، رام چندر نایک (اڑیہ)، کرنیل سنگھ سول (پنجابی)، صاحب بیجانی (سندھی)، پرچیتا گپتا (بنگالی)، نٹور پٹیل (گجراتی)، آبا گووند مہاجن (مراٹھی) شامل ہیں۔

'یووا پُرسکار' میں ثاقب فریدی (اردو) کے علاوہ دیوجیین داس (آسامی)، نیوٹن کے بسوماتری (بوڈو)، گنگا شرما (ڈوگری)، یشیکا دت (انگریزی)، مسرور مظفر (کشمیری)، سونو کمار جھا (میتھلی)، انجنا باس کوٹا (نیپالی)، چندر شیکھر ہوتا (اڑیہ)، دیپک دھالیوان (پنجابی)، انجلی کسکو (سنتھالی)، شکتی (تمل) وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 13 مارچ 2021

ارشد فریدی

نئی دھلی: ایرانی کلچر ہاؤس، نئی دہلی میں اسلامی انقلاب کی 42 ویں سالگرہ کے موقعے پر سعدی ادبی و ثقافتی فیسٹول کا انعقاد کیا گیا جس میں شعر خوانی، قوالی وتقسیم انعامات مسابقہ بوستان وگلستان خوانی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ شیخ سعدی کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ایرانی سفیر برائے ہند ڈاکٹر علی چگینی نے کہا کہ شیخ سعدی کی شاعری عشق، محبت، اخوت اور انسانیت کا مظہر ہے۔ اس موقعے پر ایران حکومت نے روزنامہ میراوطن کے ایڈیٹر ارشد فریدی کو فارسی کے فروغ کے لیے پہلے 'سعدی خوانی ایوارڈ' سے نوازا۔ پروگرام میں دہلی کی کئی معروف شخصیات سمیت بڑی تعداد میں مدارس کے طلبا و اساتذہ بھی موجود رہے۔ تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد معروف قوال سلطان نیازی وہمنوا نے شیخ سعدی کا کلام پیش کیا۔ اس کے بعد مولانا سلیمان قاسمی صاحب نے فارسی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فاروقی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شاعر برقی اعظمی نے امام خمینی کی فارسی غزل پیش کی۔ میوات سے تعلق رکھنے والے ندیم الواجدی نے سعدی خوانی کی۔ پروگرام کا اختتام حضرت امیر خسرو کے کلام پر ہوا جس کو مشہور قوال سلطان نیازی وہمنوا نے پیش کیا۔ پروگرام میں المصطفیٰ یونیورسٹی کے سربراہ آیت اللہ شاکری، ایرانی کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی، مولانا غلامی حسین ہلوری اور مولانا افروز مجتبیٰ سمیت اہم شخصیات موجود تھیں۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر مہدی باقر معراج نے انجام دیے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 12 فروری 2021

منور تابش

سنبھل: عباسی ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ قومی ایکتا پروگرام میں شہر کی سماجی، سیاسی اور صحافتی شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا، صدر عظیم عباسی نے بتایا کہ شہر کی ایسی شخصیات جو سماجی خدمات کے لیے پیش پیش رہتی ہیں اور وہ کسی بھی میدان میں کام کرتی رہی ہیں۔ سماجی کارکنوں کے علاوہ صحافیوں کو بھی اعزاز سے نوازا گیا، اس موقعے پر سنبھل کے معروف ادیب وصحافی و شاعر ڈاکٹر منور تابش مجموعی خدمات کے لیے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ سوسائٹی کے ذمے داران نے بتایا کہ منور تابش مسلسل اپنی صحافتی خدمات سے سماج میں قومی ایکتا اور بھائی چارے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شعر و ادب میں بھی ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر منور تابش اس سے قبل بھی دیگر سوسائٹیوں، انجمنوں اور سیاسی و سماجی تنظیموں کی جانب سے ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ایوارڈ انھیں سنبھل ایس ڈی ایم کی موجودگی میں دیا گیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 9 فروری 2021

منتہی مہوین

بیدر: ڈائرکٹر کرناٹکا اردو اکادمی بنگلور اور محکمہ تعلیمات عامہ کے باہمی تعاون سے سرکاری، امدادی، غیر امدادی اسکول کے طلبہ وطالبات کے لیے ضلعی سطح پر اردو ادبی و ثقافتی مقابلہ جات وزڈم ہائی اسکول، بیدر میں منعقد ہوئے جس میں وزڈم ہائی اسکول بیدر کی طالبہ منتہی مہوین بنت محمد اعظم پاشا جماعت نہم نے مقابلۂ فی البدیہہ تقریر میں اول انعام حاصل کیا۔ کرناٹکا اردو اکادمی نے منتہی مہوین کو سرٹیفکٹ اور نقدی رقم سے نوازا۔ جناب محمد آصف الدین صاحب سکریٹری وزڈم ادارہ جات نے طالبہ اور اولیاء طالبہ کو مبارکباد دی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 فروری 2021

رسم اجرا

ٹوٹتی سرحدیں

بلگام: شہر بلگام سے میرا گہرا جذباتی تعلق رہا ہے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس سرزمین میں میری کتاب 'ٹوٹتی سرحدیں' کا اجرا عمل میں لایا جا رہا ہے۔ میں نے ان افسانوں کے ذریعہ زندگی کی تلخ، شیریں اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات دھارواڑ کی معروف ادیبہ، شاعرہ، مصنفہ اور مدیرہ، نیز سماجی خدمت گار مہر افروز کاٹھیواری نے اپنے افسانوی مجموعے کی رسم اجرا کے موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہی۔ محترمہ نے بلگام کے ادب نواز حضرات بالخصوص مشتاق حسین فاروقی، ع۔ صمد خانہ پوری، اور م۔ فاروق حنان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی کتاب کی رسم اجراء بلگام میں منعقد کی جا رہی ہے۔

اس موقعے پر سابق چیئرمین کرناٹک اردو اکیڈمی پروفیسر قدیر ناظم نے کہا کہ دراصل وہی افسانہ نگار کامیاب کہلاتا ہے جو روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور حقائق کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے افسانے کا عنوان بناتا ہے۔ اس ضمن میں مہر افروز کے مختصر افسانے 'کٹی پتنگ' کو ایک موثر اور کامیاب افسانہ قرار دیتے ہوئے دیگر چند مختصر افسانوں کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مہر افروز نے علامتی انداز میں زندگی کی تلخیوں کو اپنے افسانوں میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اجلاس کی کمپیئرنگ معروف اینکر، صحافی، شاعر اور ایس انڈیا کے خالق شریف احمد شریف نے کی۔ بلگام کے ہوٹل نیاز کے بنکیٹ ہال میں رسم اجرا کا یہ پروگرام علامہ اقبال شاہین کلب آف انڈیا کے بانی صدر حکیم مشتاق حسین فاروقی کی طرف سے رکھا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ادب زندگی کا ایک جز ہے جو اردو ادب سے دور رہتا ہے وہ اچھی اور شائستہ تہذیب سے محروم رہتا ہے۔ شہر کے سینئر صحافی م۔ فاروق حنان نے مہر افروز کو ایک حساس عورت، قابل استانی قرار دیتے ہوئے کہا کہ موصوفہ اردو کے علاوہ انگریزی پر بھی دسترس رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے صحافتی دور میں محترمہ کی طرف سے اخبارات کی ترقی اور استحکام کے لیے دی گئی امداد کا شکریہ ادا کیا۔

اجلاس کا صدارتی خطبہ دیتے ہوئے بزرگ صحافی مصنف اور محقق ع۔ صمد خانہ پوری نے کہا کہ مہر افروز نے اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بیک وقت ایک اچھی افسانہ نویس، مدیرہ، شاعرہ اور مبصر ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ ایک نیک دل خاتون ہیں، جنھیں اپنی صنف کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعدد افسانوں میں ''عورت' چلتی پھرتی اور اپنے وجود کا احساس دلاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناظم اجلاس شریف احمد شریف کے اظہار تشکر پر اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: عبدالصمد خانپوری، کشمیر، 26 فروری 2021

حیات نو

علی گڑھ: علی گڑھ کے کانفرنس ہال میں 'مجلّہ حیات نو' دہلی کے خصوصی شمارہ بعنوان 'ڈاکٹر منور حسین فلاحی حیات وخدمات' کا اجرا ہوا اور اس خصوصی اشاعت پر ایک قومی مذاکرہ منعقد ہوا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مدیر مجلّہ ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی نے کہا کہ اس شمارے کا مقصد مرحوم کی زندگی کے ان گوشوں کو سامنے لاتا ہے جن کا تعلق علم وادب، اسلامیات و دینیات، افکار ونظریات اور مرحوم کی متانت وسنجیدگی سے ہے۔ مجلّہ کا اجرا کر کے انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح نے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے مدیر ڈاکٹر ضیاء الدین ملک قابل مبارکباد ہیں۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈائرکٹر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن نے مرحوم سے اپنے گہرے ربط کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ ان سے میرا تعلق بیک وقت استاد اور شاگرد دونوں کا رہا۔ میں ان کو بہ حیثیت استاد انگلش پڑھاتا تھا اور پھر بہ حیثیت شاگرد ان سے قرآنی عربی پڑھتا تھا۔ اس موقعے پر پروفیسر سمیع اختر، مولانا طاہر مدنی، پروفیسر ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر عبیداللہ فلاحی اور پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 مارچ 2021

ادب سلسلہ

وارانسی: اردو زبان وادب کے معتبر رسالہ 'ادب سلسلہ' کا تازہ خصوصی شمارہ 'افسانہ نمبر' کا اجرا شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے سربراہ پروفیسر آفتاب آفاقی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر آفاقی نے رسائل کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادبی رسائل کے مطالعے سے ہم معاصر ادبی رجحانات اور رویوں سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ پختہ اور نئے اذہان کے علمی وادبی شغف اور معیار سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادب سلسلہ نے بہت کم وقت میں سنجیدہ ادبی حلقے میں اعتبار قائم کرلیا ہے۔ یہ رسالہ جہاں

شعبۂ اردو کے ترجمان مجلہ 'ارمغان' کا اجرا

اساتذہ کے مقالات ومضامین شائع کر رہا ہے، وہیں نئے قلم کاروں کی نگارشات کو شامل کرکے ان کی ذہنی وفکری تربیت میں حصہ لے رہا ہے۔ اس رسالے نے کئی اہم خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جن کی حیثیت حوالہ جاتی ہے اور ریسرچ اسکالرز کے لیے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ مدیر رسالہ سلیم علیگ نے شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے ساتھ طلبا کے اندر ادبی ذوق پیدا کرنا ہے۔ ڈاکٹر افضل مصباحی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو رسائل کی اہمیت مسلم ہے۔ ادب سلسلہ کے اس خصوصی شمارے میں اردو فکشن کے حوالے سے ممتاز ادیبوں اور ناقدین کے مضامین شائع کیے گئے جو بے حد اہم ہیں اور اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ رسم اجرا کے اس موقعے پر شعبہ کے اساتذہ ڈاکٹر مشرف علی، ڈاکٹر احسان حسن، ڈاکٹر قاسم انصاری، ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر عبدالسمیع، رقیہ بانو کے علاوہ ریسرچ اسکالرز وطلبا میں شمشیر علی، محمد سفیان، عبدالقادر، محمد اسلم، عاکف، عامر، آفتاب شاہ اور بلوندر سنگھ بلوریہ وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 فروری 2021

مجلہ 'ارمغان'

نئی دہلی: اردو اور جامعہ لازم وملزوم ہیں، دونوں کی تاریخ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔ آج جب کہ جامعہ نے ایک صدی کا سفر مکمل کرلیا ہے، شعبۂ اردو کے ترجمان مجلہ 'ارمغان' کا تازہ شمارہ جامعہ کے صد سالہ تخلیقی سفر کی نہایت معتبر ومستند دستاویز ہے۔ یہ نہایت خوشگوار لمحہ ہے کہ شعبۂ اردو نے ارمغان کا نواں شمارہ بھی نہایت مستعدی اور پوری آب وتاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام جامعہ کے صد سالہ تخلیقی ادب پر مشتمل سالنامہ 'ارمغان' کی تقریب اجرا میں صدر ٹیچرز ایسوسی ایشن جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر ماجد جمیل نے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ شعبہ اردو نے جامعہ صدی کو بامعنی اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے شعبہ کے زیر اہتمام جامعہ کی علمی وادبی خدمات کے حوالے سے اردو اکادمی دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے دو علیحدہ علیحدہ قومی سمیناروں کا انعقاد کیا نیز ارمغان کے دو نہایت اہم خصوصی شمارے شائع کیے۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ اردو جامعہ کا شناخت نامہ ہے اور مجلہ 'ارمغان' شعبۂ اردو کا ایک چہرہ، ارمغان کا یہ شمارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تخلیقی ادب پر مشتمل ہے جس میں مولانا محمد علی جوہر تا حال سو سے زائد مشہور و گمنام جامعہ سے وابستہ ادیب وشعرا کا تعارف وتذکرہ کیا ہے۔ رسالے کے مدیر پروفیسر کوثر مظہری کے ساتھ شعبہ کے تمام اساتذہ کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔ تقریب میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبا نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2021

اخلاق کیا ہیں

جلال آباد: باغپت ضلع کے قصبہ بڑوت کے معروف و مشہور قدیم دینی ادارہ مدرسہ عربیہ نوریہ پھونس والی مسجد کے صحن میں آج ائمہ شہر بڑوت کے ہاتھوں 'اخلاق کیا ہیں' نامی کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اجرا کرتے ہوئے مذکورہ کتاب میں اضافہ کرنے والے شہر امام مولانا عارف الحق نے مرتب کتاب کی سوانح پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مفتی مہربان علی بڑوتی کا تعلق بڑوت قصبہ سے تھا۔ انھوں نے جہاں مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی ضلع مظفر نگر کا تعلیمی معیار اور تربیتی انداز بالکل نرالا اور نمایاں بنایا اور علاقہ کے اہل علم طبقہ کی پذیرائی حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مفتاح العلوم جلال آباد و دیگر مقامات کے علما واکابرین کی توجہات حاصل کیں وہیں آپ نے دعوت کے میدان میں دعوۃ الصدق، دعوۃ الفکر، دعوۃ النجات، دعوۃ القرآن، دعوۃ الغایات، دعوۃ السالکین، وغیرہ تحریکات کا آغاز کرکے ان میں کامیابی حاصل کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ تنظیم دعوۃ الصدق اور مکتبہ دعوۃ الصدق کے بانی کا شرف بھی آپ کو حاصل رہا۔ انھوں نے بتایا کہ مفتی صاحب موصوف نے اپنی چوالیس سالہ زندگی میں کم وبیش چھوٹی بڑی چھپن کتابیں تصنیف وتالیف فرمائیں جن میں جامع الفتاوی، امداد السالک اور احکام تصوف، سچائی، امداد النحو، امداد الاوزان وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 فروری 2021

جاگتے لمحے

دیوبند: دیوبند جہاں دنیا بھر میں علوم اسلامی اور فنون کی ترویج واشاعت کے حوالے سے معروف ہے، وہیں اس کی خدمات ادب وثقافت، فکشن وشاعری اور دیگر اصناف وعصری علوم کے فروغ میں بھی کم نہیں ہیں۔ شہر دیوبند نے وقتاً فوقتاً ایسے قلم کار اور فنکار پیدا کیے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو اپنی تخلیقات اور نگارشات سے مالامال کیا ہے۔ افسانوی مجموعہ 'جاگتے لمحے' دیوبند سے وابستہ ایک ایسی ہی خاتون کے افسانوں کا دل کش انتخاب ہے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے رسم اجرا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دیوبند نے اب تک تین افسانہ نگار پیدا کیے ہیں، پہلا نام انجم عثمانی اور دوسرا رخشندہ روحی مہدی اور تیسرا نام بشریٰ نگہت کا ہے۔ مجموعے میں شامل افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے مزید نے کہا کہ ان افسانوں کی زبان نہایت آسان، عنوانات، زندہ اور تازہ الفاظ کا چناؤ لاجواب اور ترسیل نہایت شاندار ہے۔ ان تمام عناصر نے مل کر ان افسانوں کی قدر وقیمت بڑھا دی ہے۔ نیز ہمارے سامنے یہ مثال بھی قائم کی ہے کہ ایک عورت مختلف الجہات سوچ رکھتی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 فروری 2021

مفردات کے فوائد وخصائص، مرکبات اور مجربات

دربھنگہ: کسی بھی علم وفن کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تحقیق وتصنیف اور تالیف کا عمل مسلسل جاری رہے۔ یونانی طریقہ علاج جو ایک دیسی طریقہ علاج بھی ہے، اس فن میں کتابوں کی اشاعت کی رفتار مایوس کن ہے۔ ایسے میں حکیم زاہد حسین شمسی کی تصنیف 'مفردات کے فوائد وخصائص، مرکبات اور مجربات' طب یونانی کے طلبہ کے لیے بڑی حد تک رہنما ثابت ہوگی۔ یہ باتیں پروفیسر شاکر خلیق نے شہر کے سلفیہ یونانی میڈیکل کالج

کی سینٹرل لائبریری میں منعقد رسم اجرا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شاکر خلیق، ایس ایم جاوید اقبال، وصی احمد شمسی، ڈاکٹر سلیمان احمد، حکیم آل نبی، حکیم شارق حسین، حکیم ارشاد عالم، حکیم سیف اللہ، الطاف الحق وغیرہ کے ہاتھوں حکیم زاہد حسین شمسی کی کتاب مفردات کے فوائد وخصائص، مرکبات اور مجربات کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر حکیم زاہد حسین شمسی نے بھی اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے کس طرح سے جانفشانی کے ساتھ خود کو اس سے وابستہ رکھا اور پھر اس کا فائدہ بھی حاصل ہوا۔ رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ایس ایم جاوید اقبال نے کہا کہ حکیم زاہد شمسی نے یہ کتاب شائع کرکے بڑی خدمت کی ہے۔ یہ علم طب کے طلبہ کے لیے بڑی مفید ہوگی۔ وصی احمد شمسی نے کہا کہ حکیم زاہد حسین کو اپنے فن پہ عبور حاصل ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ انھوں نے اس پیشے کو اختیار کیا اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ حکیم شارق حسین نے کہا کہ طب یونانی کے طلبہ میں ایک طرح کا احساس کمتری رہتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ایلوپیتھی میں علاج کریں۔ جن لوگوں نے لگن کے ساتھ یونانی طریقہ علاج کو اختیار کیا ہے وہ کبھی ناکام نہیں رہے ہیں۔ حکیم ارشاد عالم نے بھی کہا کہ حکیم زاہد حسین شمسی کو اللہ تعالی نے دست شفا عنایت کیا ہے۔ احتشام الحق نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ حکیم زاہد حسین شمسی نے جو علم حاصل کیا ہے اور عملی زندگی میں انھیں جو تجربات ہوئے، اس کتاب میں شامل کرکے آنے والی نسلوں کے لیے انھیں محفوظ کردیا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان احمد کے کلمات تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 فروری 2021

'حفیظ نعمانی ایک عہد ایک تاریخ' اور 'آشنا چہرے'

لکھنؤ: حفیظ نعمانی انسان دوستی، خوش اخلاقی، جرأت، ہمدردی، محبت اور وضع داری کی ایک روشن مثال تھے۔ ان

کی تحریروں کے شیدائی وہ لوگ بھی تھے جو انھیں جانتے بھی نہیں تھے۔ انھیں زبان و بیان اور اظہار پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ ان کے یہاں دورنگی نہیں تھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شارب ردولوی نے حفیظ نعمانی پر دو کتابوں کے اجرا کے موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔

مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی نے کہا کہ انھوں نے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا، بلکہ گھر والوں اور دوسروں کے لیے ایک مثال بن گئے۔ ان کی صحافت اور کالم نگاری ملی دردمندی کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے کبھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ پروگرام کا آغاز ریسرچ اسکالر محمد سعید اختر کی قرات سے ہوا۔ نظامت کے فرائض مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عمیر منظر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ مولانا عبدالعلی فاروقی نے کہا کہ آج کا یہ مجمع اس بات کا گواہ ہے کہ حفیظ صاحب کی شخصیت انتہائی پرکشش ہے۔ حفیظ نعمانی تعلقات کو نبھانا جانتے تھے۔ ڈاکٹر روپ ریکھا ورما نے کہا کہ وہ بہت ہمت والے انسان تھے۔ ڈاکٹر رمیش دیکشت نے حفیظ نعمانی کی تصنیف روداد قفس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ 'روداد قفس' میں آج کے ماحول کی آہٹ ہے۔ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے کہا کہ حفیظ بھائی سے گزشتہ پچاس برسوں کا میرا ساتھ رہا ہے۔ ان کی محبتوں کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی صحافت کا روشن زمانہ 'ندائے ملت' ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ملک وقوم کی کس قدر فکر تھی۔ موضوعات کے وہ محتاج نہیں تھے۔ ان کے کالم ان کے گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے شگفتہ اور جانے پہچانے انداز میں کہا کہ ''اویس سنبھلی کی معرکۃ الآرا تالیف 'حفیظ نعمانی: ایک عہد ایک تاریخ' اتنی بھرپور، اتنی مکمل اور اتنی وقیع ہے کہ اسے تالیف نہیں تصنیف کہنا چاہیے۔ کتاب کا 'پیش نامہ' اوپر سے نیچے تک اور پھر نیچے سے اوپر تک پڑھ ڈالیے، آپ محسوس کریں گے کہ اویس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کردی ہیں، یعنی کہ دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اویس نے اپنے موضوع سے جس طرح انصاف کیا ہے، وہ بہت کم قلم کار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے کہا کہ حفیظ نعمانی کی شخصیت اور ان کی تصانیف کے حوالے سے دو اہم کتب ہمارے سامنے آئی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ ایک زندگی تھی جس کی مختلف جہتیں تھیں، ایک منبع علم ونور تھا جس کی ضیاؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اترپردیش اردو اکادمی کے سکریٹری ایس رضوان نے حفیظ نعمانی نے اپنے دیرینہ تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے والد اور حفیظ نعمانی بہت قریبی دوست تھے، اسی نسبت سے میں انھیں حفیظ چچا کہا کرتا تھا۔ آج اویس سنبھلی اور خانوادہ حفیظ نے ان کی یاد میں یہ پروگرام کرکے ساری پرانی یادیں تازہ کردیں۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے کہا کہ 'حفیظ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کی تخلیقی کاوشوں پر ترتیب دی گئی۔ ان دونوں ہی کتابوں کے مرتبین نے نہایت محنت لگن اور جانفشانی سے ان مجموعوں کو ترتیب دیا ہے۔ عبیدالرحمن سنبھلی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: اویس سنبھلی، سنبھل یوپی، 23 فروری 2021

یوسف بہزاد کی کتابوں کا اجرا

نگینہ: اردو کے مشہور استاذ شاعر یوسف بہزاد کی شعری کاوش شعور غم شعور بندگی، خودنوشت بکھرے پل اور 'نور قرآن' کی تقریب اجرا مدرسہ اسلامیہ دھام پور کے وسیع مدنی ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ماہر تعلیم و بزرگ شاعر ڈاکٹر محمد داؤد نے فرمائی اور نظامت کے فرائض قاری ارشد حمیدی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اردو کے مشہور شاعر معین شاداب اور مولانا محمد یاسین ذکی اور محب اردو ڈاکٹر کمال احمد تشریف لائے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معین شاداب نے کہا کہ یوسف بہزاد نہ تو کسی خاص نظریہ کے اسیر ہیں اور نہ کسی مخصوص فکر کے تابعدار بلکہ ان کا جذبہ اور احساس ہی ان کی شعری اساس ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کا ضمیر بولتا ہے۔ سادگی سے پر ان کی شخصیت کی طرح ان کی فکر بھی سادہ ہے۔ مولانا محمد یاسین ذکی نے کہا کہ یوسف بہزاد کی شاعری میں تصنع اور عشق کی مصنوعی دیوانگی کے بجائے انسانیت کا غم اور اس کی کسک نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں قال سے زیادہ حال اور حقیقت بیانی پر مشتمل دل کا سوز وگداز ہے۔ ڈاکٹر کمال نے کہا یوسف بہزاد ایک فنکار اور کہنہ مشق شاعر اور رجال ساز شخصیت ہیں۔ اس موقعے پر ادبی خدمات انجام دینے والی سرکردہ شخصیات کو بزم قمر دھامپور کی جانب سے توصیفی اسناد سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 فروری 2021

کوئی بات اٹھا نہ رکھنا

حیدرآباد: معاشی ترقی کے بغیر عورت کی آزادی کا ہر خواب ادھورا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر فاروق

بخشی نے حیدرآباد کی معروف ادیبہ و شاعرہ اور سماجی کارکن رفیعہ نوشین کے رپورتاژ کے مجموعے 'کوئی بات اٹھا نہ رکھنا' کی رسم اجرا کے موقع پر کیا۔ پروفیسر موصوف نے انجمن ترقی پسند مصنفین تلنگانہ اسٹیٹ کے زیر اہتمام اس تقریب میں رفیعہ نوشین کو ان کی بہترین تصنیف پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس سے قبل ان کے مضامین اور افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، وہ ایک معروف شاعرہ بھی ہیں جو تمام سماجی مسائل پر حساس نقطۂ نظر رکھتی ہیں۔ وہ حیدرآباد کے سماجی حلقوں میں ایک جہد کار کی حیثیت سے بھی شناخت رکھتی ہیں۔ ان کے رپورتاژ کے مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ زبان وادب کی کسوٹی پر یہ رپورتاژ کھرے اترتے ہیں۔ سینئر ادیبہ پروفیسر فاطمہ پروین نے خواتین کی آزادی کے تصور کو اسلام سے جوڑا اور رفیعہ نوشین کو اس کی ایک روشن مثال بتایا۔ سابق ڈائرکٹر تلنگانہ اردو کادمی پروفیسر ایس اے شکور نے کہا کہ رفیعہ نوشین کا تمام خانوادہ اردو زبان و ادب کے خدمت گاروں سے بھرا پڑا ہے۔ معروف افسانہ نگار قمر جمالی نے رفیعہ نوشین کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب اردو رپورتاژ نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کرے گی۔ رفیعہ نوشین کے تحقیقی مقالے کی نگراں ڈاکٹر آمنہ تحسین نے ان کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے خواتین کے مسائل اٹھاتی ہیں۔ اس موقع پر بزم سخن شکاگو کے صدر ڈاکٹر منیر الزماں منیر نے بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر تاریخی قطعہ نگار استاد سمیع اللہ سمیع نے تاریخی قطعات اور استاد یوسف روش نے اپنا تہنیتی کلام سنا کر محفل کی رونق کو دوبالا کردیا۔

معروف ادیبہ ڈاکٹر اودھیش رانی نے محترمہ رفیعہ نوشین کی شال پوشی کرتے ہوئے کہا کہ رفیعہ نوشین انجمن ترقی پسند مصنفین کی فعال رکن ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین تلنگانہ حیدرآباد نے اس تقریب کا اہتمام کر کے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ صاحب کتاب محترمہ رفیعہ نوشین نے انجمن ترقی پسند مصنفین تلنگانہ اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی محبت ہی میرے قلم کی طاقت ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں شرکت کر کے آپ نے جو میری حوصلہ افزائی کی ہے وہ میرے قلم کی دھار کو تیز تر کردے گی۔ اس تقریب میں حیدرآباد کی تین بڑی دانش گاہوں کے طلبا، اساتذہ اور شہر کے ادیبوں، شاعروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

رپورٹ محمد امان اے کے، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مانو، حیدرآباد 1 مارچ 2021

ڈاکٹر حسان نگرامی کی 3 کتابوں کا اجرا

لکھنؤ: مولانا عبدالغفار ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں یش بھارتی اعزاز یافتہ معروف مصنف و معالج ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی کی 3 کتابوں تذکرہ خاندان مولانا عبدالغفار، کینسر کا علاج اور انور جلالپوری: شخصیت اور فن کا اجرا عمل میں آیا۔ پریس کلب میں مولانا ڈاکٹر سعید الرحمان اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما) کی صدارت اور ڈاکٹر معید احمد کی نظامت میں منعقد اس جلسے میں سابق ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ صدارتی خطبے میں مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے سوسائٹی کے منتظمین کو مبارکباد پیش کی اور قوم کو صحت و تعلیم کی جانب سنجیدگی سے توجہ دینے، آگے بڑھنے اور اس کے عملی اقدامات پر زور دیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ حیات میں نمایاں خدمات انجام دینے والی کچھ اہم شخصیات کی عزت افزائی بھی کی گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2021

اجالا کہاں گیا

گورکھپور: معروف شاعر ثروت جمال کے مجموعہ 'اجالا کہاں گیا' کا اجرا کرتے ہوئے معروف نقاد اور گورکھپور یونیورسٹی میں شعبہ ہندی کے صدر پروفیسر چترنجن مشرا نے کہا کہ ثروت جمال کی شاعری ہندی اور اردو کے مابین پل کا کام کرتی ہے ان کی غزلوں سے میٹر کو ہٹا دیا جائے تو وہ آزاد چھند کی کویتا کہی جا سکتی ہے۔ چھند ہندی کی ایک صنف سخن ہے، مسٹر امشرا نے کہا کہ ثروت جمال کی شاعری کھیت، کھلیان، کسان سے تعلق رکھتی ہے اور اس اجالے کا خواب دیکھتی ہے جو ہم سب کے خوابوں کا حصہ ہے جسے کچھ لوگوں نے ہم سے چھین لیا ہے۔ اس موقعے پر مسٹر دھرمشرا نے کہا کہ ثروت جمال کا نام ادبی حلقے میں معروف نام ہے اور ان کی شاعری کا لہجہ بات چیت کا ہے جو ہر شخص کی بھلائی چاہتا ہے جب کہ ادیب وید پرکاش پانڈے نے ثروت جمال کو ایک ذہین شاعر بتایا۔ کلیم الحق نے کہا کہ بڑی بے باکی سے ثروت جمال اپنی شاعری کرتے ہیں۔ اس موقعے پر ادبی حلقوں کے علاوہ ہندی ادیبوں کی اچھی خاصی موجودگی تھی اور سبھی نے ثروت جمال کو ان کے شعری مجموعہ پر مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2021

کورونا کے رنگ

ممبئی: گل بوٹے کے مدیر فاروق سید نے گل بوٹے کی 26 ویں سالگرہ 'جشن بچپن' کے نام سے دھوم دھام سے منائی جس میں مہاراشٹر سرکار کے وزیروں، ملک بھر سے اردو اکادمیوں کے صدور، سکریٹری، ادبا، شعرا اور

اخبار و رسائل کے مدیران نے شرکت کی۔ اس کے ایک سیشن میں ملک کے ادبا کی کتب کا اجرا بھی کیا گیا۔ رونق جمال کی لاک ڈاؤن کے دوران لکھی گئی کہانیوں، افسانوں، افسانچوں، طنز و مزاح اور انشائیوں پر مشتمل کتاب 'کورونا کے رنگ' کا اجرا بھی کیا گیا۔ اجرا کی رسم روزنامہ 'انقلاب' کے مدیر شاہد لطیف خیر اندیش کے مدیر خیال انصاری ماہنامہ شاعر کے مدیر ناظر نعمان صدیقی،

اورتریاق کے مدیر میر صاحب حسن نے انجام دی۔ رونق جمال کا تعارف فاروق سید نے پیش کیا اور 'کورونا کے رنگ' کتاب پر مصنف رونق جمال نے روشنی ڈالی۔

پریس ریلیز: رونق جمال، اردو فکشن رائٹر، 11 فروری 2011

ڈاکٹر قطب سرشار بہ حیثیت شاعر، نقاد اور مترجم

حیدرآباد: اردو کے نامور شاعر، نقاد و محقق اور ترجمہ نگار

کی حیات اور ادبی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر محمد عبدالنعیم کی تحقیقی تصنیف 'ڈاکٹر قطب سرشار بہ حیثیت شاعر، نقاد اور مترجم' کی رسم اجرا اور ڈاکٹر قطب سرشار کے چوتھے شعری مجموعے کی رسم اجرا 21 جنوری 2021 کو میڈیا پلس آڈیٹوریم عابڈ پر انجام پائی۔ پروفیسر فضل اللہ مکرم صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے ادبی اجلاس کی صدارت اور ڈاکٹر محمد عبدالنعیم کی کتاب 'ڈاکٹر قطب سرشار بہ حیثیت شاعر، نقاد اور مترجم' کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد کتاب کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ڈاکٹر قطب سرشار ایک ہمہ جہت صلاحیتوں کے حامل قلمکار ہیں، لہٰذا جب کوئی ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کے لیے قطب سرشار پر تحقیقی کام کرنے لگتا ہے تو اس کی تحقیق کچھ عرصے بعد پوری ہوجاتی ہے لیکن ڈاکٹر سرشار کا تخلیقی وتنقیدی سفر پورا نہیں ہو پاتا۔ اس لیے کہ ڈاکٹر قطب سرشار ہمہ جہت قلمکار کا تخلیقی وتنقیدی سفر جاری ہے، اس لیے کہ قطب سرشار کے اندر کا تخلیق کار زندہ ہے۔

پروفیسر فاطمہ پروین نے ڈاکٹر قطب سرشار کی پہلو دار شخصیت کی ترجمانی تخلیقی زبان میں کرتے ہوئے فرمایا کہ تخلیق، تنقید، تحقیق اور ترجمہ نگاری کے عناصر جب یکجا ہوجاتے ہیں تو ڈاکٹر قطب سرشار کی شبیہ ابھرتی ہے۔ ڈاکٹر محمد غوث ڈائریکٹر سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی نے ڈاکٹر قطب سرشار کے شعری مجموعے 'اجالوں کی طرف' کی رسم اجرا انجام دی اور اپنی تقریر میں یہ اعتراف کیا کہ سوشل سائنس کا طالب علم ہوں، قطب سرشار کی شاعری کے حوالے سے بات نہیں کرسکتا، البتہ اردو اکیڈمی کے ناظم ومعتمد کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے مشاورت کے بعد تلگو اردو لغت کی تدوین واشاعت کے کام کا احیاء کیا جائے گا۔ ڈاکٹر صابر سیوانی نے بہ حیثیت مہمان اپنی تقریر میں ڈاکٹر قطب سرشار کی شعری تصنیف 'اجالوں کی طرف' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سرشار کی شاعری کے معنوی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

پریس ریلیز: محبوب خان اصغر، معتمد عمومی مرزا غالب اکاڈمی، حیدرآباد، 21 فروری 2021

وفیات

عبدالقادر جعفری

پریاگ راج: الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ عربی وفارسی کے سابق صدر پروفیسر عبدالقادر جعفری کا 26 فروری کو آنند

ہاسپٹل، الہ آباد میں انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی ماہ سے علیل تھے۔ بعد نماز مغرب ان کی نماز جنازہ وسیع آباد مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین کیڈگنج قبرستان میں ہوئی۔ پروفیسر جعفری کے انتقال پر شہر کی مختلف علمی وادبی شخصیتوں نے اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیب وناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے پروفیسر جعفری کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ وہ طبیعت کے بہت ہی نیک اور سادہ انسان تھے۔ شعبۂ عربی وفارسی کے صدر کی حیثیت سے ان کی گراں قدر خدمات رہی ہیں۔ یونیورسٹی میں بھی لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ دائرہ ملا شاہ محمدی کے نائب سجادہ نشین اور استاد شاعر شاہ محمود احمد رمز نے کہا کہ پروفیسر جعفری کی فارسی ادب پر بھرپور دسترس تھی۔ وہ مزاجاً کم سخن انسان تھے لیکن ان کی تحریر عمدہ تھی۔ دنیائے فانی سے ان کا رخصت ہونا فارسی ادب کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ شیروانی انٹر کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر فخر الکریم نے کہا کہ پروفیسر عبدالقادر جعفری ایک اعلیٰ پائے کے استاد تھے۔ فارسی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ فارسی زبان وادب کی خدمت کے سلسلے میں ان کو 'راشٹرپتی' اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ ان کے جانے سے علمی وادبی حلقہ میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا ہے۔ مشہور انگریزی داں اقبال امیر نے کہا کہ پروفیسر جعفری جیسے فارسی ادب پر گہری نظر رکھنے والے انسان کم ہی دیکھے گئے ہیں۔ ان کی سادگی اور شرافت لوگوں کو متاثر کرتی تھی۔ حافظ، سعدی اور مولانا روم پر ان کی گہری نظر تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2021

انیس مرزا

نئی دھلی: اردو کے معروف صحافی، ناول نگار اور مترجم انیس مرزا کا طویل علالت کے بعد 84 سال کی عمر میں

انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں دو بیٹے ہیں۔ ان کی اہلیہ کا دو سال قبل انتقال ہوگیا تھا اور تین برس قبل ان کے ایک جواں سال بیٹے کی موت ہوئی تھی۔ انیس مرزا کا تعلق اترپردیش کے فرخ آباد شہر سے تھا۔ وہ گذشتہ ساٹھ برس سے دہلی میں مقیم تھے اور مختلف اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے طویل ادبی سفر کے دوران درجنوں ناول، فلمی اور جاسوسی کہانیوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں اور کئی اہم کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کی اہم تصنیفات میں ٹوٹی لکیر (1963)، آندھیاں (1969)، آس کا جگنو (1985) کے علاوہ ایک سمندر، گھروندہ، سنگدل، تیری یاد آئی، گونگی چاہت، قصہ چہار خرگوش شامل ہیں۔ انیس مرزا نے مختلف ناشروں کے یہاں تصنیفی خدمات انجام دیں اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ دہلی اردو اکادمی نے انھیں ایوارڈ برائے صحافت سے نوازا تھا۔ انھیں دہلی گیٹ قبرستان میں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کردیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2021

احمد مشکور

نئی دهلی: معروف ادیب احمد مشکور کا مختصر علالت کے بعد لکھنؤ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 83 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔ تین ماہ قبل ان کے اکلوتے فرزند جمشید صدیقی کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا تھا، جس سے وہ شدید صدمے میں تھے۔ احمد مشکور کا اصل نام مشکور احمد صدیقی تھا۔ وہ 25 دسمبر 1937 کو بہار کے سیوان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انڈین ریلوے میں خدمات انجام دیں اور سیکشن انجینئر کے طور پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا غالب رجحان علمی اور ادبی سرگرمیوں کی طرف تھا اور وہ اردو زبان کے بڑے شیدائی تھے۔ احمد مشکور نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور لکھنؤ سے بچوں کا معروف ماہنامہ 'ثاقی' شائع کیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ لکھنؤ سے دہلی منتقل ہوگئے تھے۔ ملک کے مختلف ادبی رسائل وجرائد میں ان کے لاتعداد افسانے شائع ہوئے۔ وہ انجمن ادب اطفال اور انجمن شمع ادب (گورکھپور) کے سیکریٹری بھی رہے۔ آکاشوانی سے ان کے 24 ریڈیائی ڈرامے بھی نشر ہوئے۔ ان کا پہلا ناول 1960 میں شائع ہوا تھا۔ 1968 میں انھوں نے بچوں کے لیے بھی ناول لکھا۔ 2009 میں ان کا سفرنامہ حج 'سوئے حرم' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ان کی آخری کتاب 'آئینہ حیات' گزشتہ دنوں منظر عام پر آئی تھی۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر فاطمی مسجد، خرم نگر، لکھنؤ میں ادا کی گئی اور سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں انھیں خرم نگر قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، دہلی، 14 فروری 2021

خورشید عالم قریشی

گورکھپور: دبستان گورکھپور کے معروف شاعر اور عمر قریشی اکیڈمی کے جنرل سکریٹری خورشید عالم قریشی کا 14 فروری کو انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ دو مینار مسجد، جعفر آباد بازار میں ادا کی گئی اور طرفین کی آخری رسومات گورکھناتھ قبرستان میں ہوئی۔ خورشید عالم قریشی گورکھپور کی ادبی محفلوں کے سرگرم رکن اور معروف ناظم مشاعرہ عمر قریشی کے داماد تھے۔ اردو ادب سے خورشید عالم قریشی کو خاص لگاؤ تھا۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں سامعین ان کے کلام کو بڑے ذوق وشوق سے سنتے تھے۔ ان کے کلام میں قدیم روایت کی پاسداری کے ساتھ جدیدیت کا رنگ نمایاں تھا۔ خورشید عالم قریشی کی وفات کی خبر سے ادبی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے بیٹے شاداب قریشی نے بتایا کہ جمعہ کی شب انھوں نے مسجد میں نماز عشا ادا کی، گھر آکر کھانا کھایا اور بیٹوں سے کافی دیر تک باتیں کیں۔ وہ بالکل ٹھیک تھے۔ اچانک رات کے 2 بجے ان کو الجھن محسوس ہوئی۔ نبض گرنے لگی، پاس کے ایک اسپتال میں ان کو لے جایا گیا لیکن تب تک ساری کوششیں ناکام ہوچکی تھیں۔ وہ ہم سب کو چھوڑ کر مالک حقیقی سے جاملے۔ مرحوم کی نماز جنازہ اور تدفین میں شہر کے شعرا، ادبا اور بڑی تعداد میں عزیز واقربا موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 فروری 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............ بتاریخ.................................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

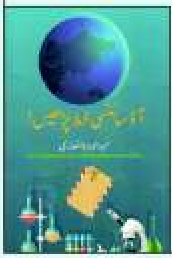

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

رودر پریاگ کا آدم خور تیندروا

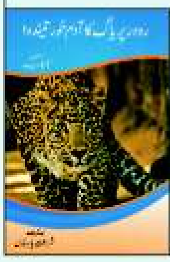

مصنف: جم کاربیٹ

مترجم: شرافت یار خاں

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے عام قانونی معلومات

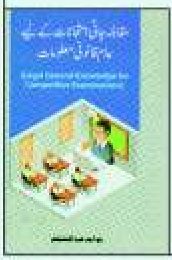

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 375

قیمت: 180 روپے

تاریخ وتہذیب وثقافت

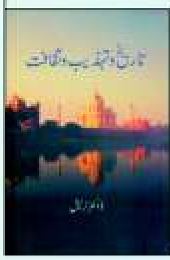

مصنف: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 210

قیمت: 120 روپے

اردو صحافت (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

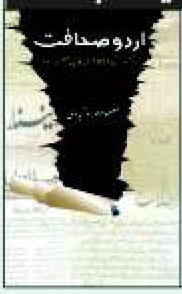

مصنف: معصوم مرادآبادی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190

قیمت 110 روپے

اردو صحافت (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: اسد رضا

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 95 روپے

اردو صحافت (1948 تا 2000 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: سہیل انجم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 80 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अप्रैल-२०२१,वर्ष:२३, अंक:०४
URDU DUNIYA Monthly, April-2021, Vol.23, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/03/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025